

پاک فوج سے فرار ہونے والے
اولین بنگالی افسر
میجر شریف الحق دالمی کے
چونکا دینے والے انکشافات

عبدالملک مجاہد
دارالسلام پبلشرز کے بانی
ایک کینیڈا فرکی حیرت افزا داستان

Rs:90

اردو ڈائجسٹ

f /urdu Digest.pk

PDFBOOKSFREE.PK

19 ارب ڈالر کا مالک اور
amazon کا چیف ایگزیکٹو
JEFF BEZOS
نمبر 1 کیسے بنا؟



اللہ کا قرآن

نیک لوگوں کی موت

اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نہیں مر سکتا۔ وقت مقرر رکھا ہوا ہے۔ جو شخص دنیا میں بدلہ چاہے گا اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے اور جو آخرت میں ثواب کا طالب ہو اس کو وہاں عطا کریں گے اور ہم شکر گزاروں کو صلہ دیں گے۔ O
(آل عمران: ۳: ۱۴۵)

بد اعمال لوگوں کی موت

پھر کیسا حال ہوگا جب فرشتے ان کی جان نکالیں گے اور ان کے منہ اور پیٹھ پر مارتے جاتے ہوں گے O یہ اس لیے کہ وہ اس راہ چلے جس سے اللہ ناخوش ہے اور اس کی رضا کو ناپسند کیا تو اس نے ان کے عملوں کو برباد کر دیا O
(محمد: ۲۷-۲۸-۲۹)

رسول کا فرمان

جنت میں بغیر حساب کتاب داخل ہونے والے

رسول کریم ﷺ نے فرمایا ”میرے سامنے امتیں پیش کی گئیں۔ مجھے بتایا گیا آپ کی امت میں ۷۰ ہزار ایسے ہیں جو بلا حساب کتاب جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔“
(صحیح بخاری کتاب ۷۶- باب ۴۲: مسلم کتاب الایمان- باب ۹۲)

بیعت میں اقرار۔ اطاعت الہی۔ دوسروں کی بھلائی چاہنا

حضرت جریر بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی ”احکام الہی کو سنوں گا اور اطاعت کروں گا اور ہر مسلمان کی بھلائی چاہوں گا۔“ تو آپ ﷺ نے مجھے تلقین فرمائی تھی کہ ”جو جس قدر میری بساط میں ہوگا۔“
(صحیح بخاری کتاب ۹۳- باب ۴۳: مسلم کتاب الایمان- باب ۲۱)



پاک فوج سے فرار ہونے والے اولین بنگالی افسر اور بنگلہ دیش میں بہادری اور شجاعت کا سب سے اعلیٰ اعزاز ”بیراٹم“ پانے والے

میر شریف الحق دالیم

کاکسی پاکستانی ایڈیٹر کوڈیا گیا پہلا چشم کشا نٹروپو

49

مشرقی پاکستان سے بلوچستان تک

248

(سید عامر محمود)

شکست آرزو (پروفیسر ڈاکٹر سید جہان سید)

26

چنانچہ لوگوں کو تازہ اور صحیح معلومات دکر رہتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہر برے واقعہ کے دوران اور بعد وہ اپنے لیڈرز اپنے ساتھ کھڑا دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیڈر مستقبل کے لیڈرز بھی تیار کرنے ہوتے ہیں تاکہ آنے والے دنوں میں وہ نئی ٹیکنالوجی کے استعمال، بہتر انداز اور ٹیم ورک کے ذریعے ملک کو ترقی دلا سکیں۔ نوجوانوں کو مستقبل کے لیے تیار کرنا بہت اہم ہے۔ ہم لیڈرشپ کو ایک ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ایک اچھا لیڈر ایک اچھا سامع ہونے کے ساتھ ساتھ کامیابی کی لکھن اور اپنے لوگوں کا خیال رکھنے کے ہنر میں طاق ہوتا ہے۔ ایک لیڈر میں تبدیلی لانے کی جرات اور تبدیلی کا استعارہ ہونا چاہیے۔ کسی بھی صحیح جگہ پر بروقت پہنچ جانا قطعاً کامیابی کی گارنٹی نہیں ہوتا۔ مشاہدہ کرنا، سننا، لائحہ عمل بدلنا، بہتر وسائل اکٹھے کرنا، اپنے آپ کو اور لوگوں کو تیار کرنا تاکہ شکست یا نقصان کا رسک کم ہو سکے آپ کی ذمہ داریوں میں شامل ہوتا ہے۔ رہبری یا رہنمائی ایک کل وقتی ذمہ داری ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اچھے وقتوں میں ”لیڈری“ کریں لیکن پھر آسانی سے غائب ہو جائیں۔ رہنمائی حاصل کرنا بہت اہم ہے جس طرح ہر کامیاب کھلاڑی کو ایک کوچ کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح لیڈر بننے کے لیے بھی ایک رہنما اور گائیڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کو ہر چیز کا اچھی طرح علم نہیں ہوتا لہذا علم اور آگاہی حاصل کرتے رہنا ہوتا ہے۔

آخری بات..... لیڈرشپ کسی ایک فرد کی بس کی بات نہیں رہی۔ گروپ لیڈرشپ یا ٹیم لیڈرشپ ہی ٹیم جیتنے میں کر سامنے آتی ہے۔ مختلف صلاحیتوں، چھپر اور عمر کے لوگوں پر مشتمل گروپ آج کے پیچیدہ مسائل کے حل پیش کر کے ملک کی راہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہم صرف سیاسی محاذ پر ہی لیڈر کے متلاشی



طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اٹھائیے
tayyab.ajaz@urdu-digest.com

مینجنگ ایڈیٹر نوٹ

لیڈر کی تلاش

پوری قوم خصوصاً نوجوان نسل آج کل ایک لیڈر کی تلاش میں ہے۔ کوئی نواز شریف کو نجات دہندہ سمجھتا ہے تو کسی کو عمران خان کی شکل میں سچا نظر آتا ہے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد ابھی تک گوگو کی کیفیت میں ہے۔ یہ وقت ”جھوسوں“ کے لیے نہیں ہے بلکہ آج پوری دنیا میں لیڈر کی صلاحیتوں کو جانچا جا رہا ہے اور آنے والے دنوں میں مزید سختی سے ٹیسٹ کیا جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ آج Stakes چاہے وہ فاضل ہوں یا معاشرتی کبھی بھی اتنے بلند نہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ لیڈر کیسا ہونا چاہیے اور اس میں کون کون سی خوبیاں ہونی چاہئیں؟

دنیا بھر کے کامیاب لیڈرز ایک موثر لیڈر کی شخصیت کا خاکہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

کرینڈیلٹی لیڈرشپ کے لیے لگاتر یہ ہے اور یہ حاصل ہوتی ہے لیڈر کی اپنی مثال سے اور جس میں لیڈر اپنے رول کے بارے میں عاجزی کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی اختیار کرتا ہے۔ ایک لیڈر کے ارد گرد کے لوگ بھی اچھے لیڈر ہونے چاہئیں۔ لیڈر کا ایک اچھا مقرر ہونا بہت ضروری ہے۔ اس میں لوگوں کو اپنی بات پر قائل کرنے کا ملکہ ہونا چاہیے۔ لیڈر کو نا صرف اپنے لوگوں سے ابلاغ کا ہنر آنا چاہیے بلکہ بیرونی دنیا کے سامنے اپنے ایجنڈے اور ویژن کو ان کے مسائل میں غیر مبہم انداز میں پیش کرنا بھی آنا چاہیے۔ لیڈر کا چلک دار ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ آج کل حالات تیزی سے بدل رہے ہوتے ہیں لہذا آپ کو تیار رہنا ہوتا ہے نئے صورت حال کا سامنا کرنے، نئے مواقع اور بدلتی ہوئی ترجیحات کا۔ تاہم نئے فیصلے کرتے ہوئے تبدیلیاں لانا اور وہ بھی مختصر وقت میں ایک مشکل چیلنج ہوتا ہے۔ اسی لیے تبدیلی کو پہلے سے جاننا اور تیزی سے اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا، کامیابی کا اہم جزو ہے۔ اگر آپ کے ارد گرد ایک خوف زدہ لیکن باشعور ورک فورس اکٹھی ہو چکی ہے تو جان لیجیے آپ کے لیے ایک بڑا چیلنج تیار ہے۔ اس طرح کی پوزیشن میں تبدیلی بہت دشوار ہوتی ہے۔ کراسری صورت حال میں عام طور پر ہر طرح کی افواہیں اور اندازے تیزی سے گردش کرتے ہیں

اردو ڈائجسٹ
www.urdu-digest.pk
دسمبر ۲۰۱۲ء محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
جلد نمبر ۵۲ شمارہ ۱۲

صدر مجلس
مدیر اعلیٰ
مینجنگ ایڈیٹر
ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر
مجلس تحریر
نویس اسلام آباد
مہتمم طبابت
ڈیزائنر
سب ایڈیٹر ویب
اختر عباس
حافظ افروز حسن، سید عامر محمود، صغیرہ بانو شیریں
نویس اسلام آباد، سلسلی اعوان، الطیر بن مظہر
فاروق اعجاز قریشی، انوار کبیر، انوار کامران قریشی
پروفیشنل
عاطف مرزا

مارکیٹنگ / اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ
مینجنگ ایڈیٹر وٹاڈن منٹ
لاہور
گجرات / گوجرانوالہ
ذکی اعجاز قریشی
احمد فیاض
ندیم حامد
احسان اللہ بٹ

سالانہ خریداری
subscription@urdu-digest.com
فون: 92-42-37589957

اردو ڈائجسٹ کھریشے حاصل کیجیے
پاکستان 1080 کے بجائے 750 روپے میں
بیرین ملک 50 امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک کے خریداری پر رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں
URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: 92-42-35290738 +92-42-35290731 فیکس
editor@urdu-digest.com

قیمت 90 روپے
طابع و نشر الطاف حسن قریشی نے جسارت بہار 24۔ مئی 2012ء سے شائع کیا
سے چھپا کر 21-19 ایکڑ ٹیکسٹ میں آباد لاہور سے شائع کیا

فہرست

سِرورق پر



ہمارے ہاں انرجی ڈرائنگ
کی خرید و فروخت میں
سات سو نوا اضافی کیا رنگ لائے گا؟

65



145

19 ارب ڈالر کا مالک اور
amazon کے چیف ایگزیکٹو
JEFF BEZOS
سے ملیے



225

دارالسلام
پبلشرز کے بانی

عبدالملک مجاہد
ایک کیلی گرافر کی حیرت افزا داستان

اسلامی گوشہ

33 قربانی حسین کی

38 سانحہ کربلا دل پر چھائی اُداسی کی وجہ

42 خلی حضرت عباس کا قصہ بدل پذیر

الطاف حسن قریشی

الطاف حسن قریشی

ماہ نور فیصل

بمیل یوسف

حسین احمد شیرازی

عالم محمود

رفیہ کلیم فاروقی

تحریم حنا صدیقی

جاوید چوہدری

قیصر جاوید

انعام الحق مرزا

ارشاد لاشاری

خدیجہ عین تارا

ڈاکٹر منصور احمد باوجودہ

رخسانہ بشیر

ڈاکٹر اصغر علی

عاطف مرزا

سلیم کوثر

غلام سیاد

صفیرہ بانو شیریں

محمد ظہیر چوہدری

نویہ اسلام صدیقی

وسمی شاہ

نوشین ناز

آپکے مشورے شکایات

ادارہ

اختر عباس

کچھ اپنی زبان میں

ہم کہاں ٹھہرے ہیں

یاران وطن دیار غیر میں

پاؤں حقیقت چاندھری کی

پاکستانی کا دیو باری بابو (مطرحہ)

۲۰۱۲ء کی طبیعتی ایجادات

باتیں دانش کی

ہم کسی سے کم نہیں

کتنے کے منہ میں باقی کے دانت

کیا صرف پیسا کماتا کامیابی ہے

ریشم ثانی کی کہانی

نئے نئے امریکی چاقوس

پریشانی کیسے ختم ہوتی ہے

عمیرہ میمن کی مگر (مطرحہ)

شکر گزار بنیے

کمر درد سے کیسے نہیں

۲۰۵۰ء کیسیا ہوگا

حوالہ میری پسند کا (پند یہ شاعر اور نگار)

۱۰۰ مروجہ دلی کی دوران ایسا دموت

مشورہ حاضر ہے

ماہ رواں کی شخصیات

کتابوں کی کہکشاں

موضوع سخن (اس لیے کہ نہیں کہہ رہی ہیں)

وزن کم کریں صحت نہیں (مقبل کالم)

جتن خیال

قصہ گوشت

دروں پد سنگ (مستقل کالم)

14

17

81

85

91

113

121

123

135

139

150

153

157

210

214

220

235

241

245

257

260

265

271

273

277

282

284

قائد اعظم کی خوبیاں

ایڈیٹر نکی زبانی

97

جناح کل بھی راہبر

جناح آج بھی راہنما

105

فہرست

سانحہ شرقی پاکستان کی تحقیقات کے لیے قائم

حمود
الرحمن
کمیشن



253

رپورٹ 29 سال تک کیوں منظرِ عا پر نہ آسکی؟

کہانیاں

دام دام (امریکی کہانی)	171
نظامو (سندھی کہانی)	179
اللہ کے بھید وہی جانے	183
پہلا گواہ	187
روز	193
کبرے کی ران	201
شناخت	207
ازائیل آئیندے	
علی بابا	
نوبید اسلام صدیقی	
توقیر عاتشہ	
حسن رزاقی	
انجم فاروق ساحلی	
غلام سکینہ شیخ	

217

ایئریس
A-380

جو ایک ٹرین کے برابر مسافر لے کر آسکتا ہے

پیرکشش
ملازمت
کا دھوکا

129

Fake

161

تنہا
تنہا

عوام پر حرف زنی

ہمیں

آئے دن اس ایک جملے سے واسطہ پڑتا ہے کہ ہمارے عوام ہی بہت ساری خرابیوں کے ذمے دار ہیں۔ وہ کام چور، خائن اور گھٹیا کردار کے حامل ہیں۔ دودھ پیچنے والا پانی ملاتا اور عام دکاندار پھلوں اور سبزیوں کی دگنی اور تین گنی قیمت وصول کرتا ہے۔ عام شہری قطار بنانے اور قطار میں کھڑا رہنے کا عادی نہیں۔ جھوٹ بولنا اور دوسروں کو دھوکا دینا اس کی سرشت کا حصہ بن چکے۔ ٹریفک کے قوانین توڑنے میں اسے خاص لذت محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے زیادہ تر ووٹر دیانت دار اور قانون کے پابند امیدواروں کے مقابلے میں بدکرداروں، بد معاشوں، ملکی وسائل لوٹنے والوں کو ترجیح دیتے اور اس گروہ کو اپنے اوپر مسلط کر دینے کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔ بے ایمانی اور قانون شکنی عام آدمی کی گھٹی میں پڑی ہے۔ وہ برائیوں کی طرف مائل اور نیکیوں سے بہت دور دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اندر ڈپلن اور وقت کی پابندی ناپید ہوتی جا رہی ہے اور اسے معاشرتی ذمے داریوں کا ذرا پاس نہیں۔ عوام کی بہت بڑی اکثریت اسلام کی حقیقی روح سے نابلد اور اپنے شہری فرائض سے بالعموم بے بہرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرہ بڑی تیزی سے رو بہ زوال ہے اور قومی شیرازہ بکھرتا جا رہا ہے۔

بادی النظر میں یہ تمام باتیں درست معلوم ہوتی ہیں لیکن گہرائی کے ساتھ اُن کا تجزیہ کرنے سے اصل حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ عوام کی کردار سازی اُن کی قیادت اور قومی ادارے کرتے اور اس کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ نے دیانت، امانت اور صداقت کا بہترین نمونہ پیش کیا تھا۔ وہ اپنی سیرت و کردار میں قرآن حکیم کی زندہ وجا وید تعبیر تھے۔ آج کے ترقی یافتہ جمہوری معاشروں میں حکمران اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کرتے اور خود قطار میں کھڑے ہو کر مساوات کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ وہاں ارباب اقتدار اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون ہے اور احتساب کا نظام سب کے لیے یکساں ہے۔ وہاں ریاست کی پوری مشینری دیانت داری، صاف گوئی اور فرض شناسی کو فروغ دیتی اور ہر قسم کی ملاوٹ کے تصور کی جڑ کاٹی رہتی ہے۔ وہاں اخلاقی تربیت کا یہ ثمرہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا بچہ جھوٹ بولنے کا خیال اپنے ذہن میں نہیں لاسکتا جبکہ ہمارے ہاں جھوٹ، فریب، دغا بازی اور ہر نوع کی خرابی کے منبع ہیں۔

عوام کو تربیت کا سچا شعور دینے کے لیے فکری، عملی، سیاسی اور تہذیبی قیادت کی صحت مندانہ خطوط پر نشوونما حد درجہ ضروری ہے۔

الطاف حسن قسہ بی

ہم کہاں کھڑے ہیں



الطاف حسن قریشی کے متلم سے

قومی شیرازہ بندی کے طاقتور عناصر

ایک تاریخی تجزیہ۔ الطاف حسن قریشی کے متلم سے

تاریخ

کے مختلف ادوار میں انسانی معاشروں کی ایک جہتی میں مختلف عوامل کارفرما رہے۔
عمرانیات کے جدید مفکر علامہ ابن خلدون کے مطابق ”عصبیت“ قوموں اور
تہذیبوں کے عروج و زوال میں بنیادی کردار ادا کرتی آئی ہے۔ اٹھارویں اور
انیسویں صدی میں تصورات کی بنیاد پر عظیم انقلابات بھی آئے اور قومی ریاست
(Nation State) کے نظریے کو بہت فروغ حاصل ہوا اور قومی ریاستیں قائم ہوتی گئیں جن میں کلچر،
عقیدہ اور جغرافیائی وحدت بنیادی حیثیت کے حامل تھے۔ بیسویں صدی میں پاکستان مسلم قومیت کی بنیاد پر

وجود میں آیا۔ برصغیر ہند جس پر مسلمانوں نے ۸۰۰ سال سے زائد عرصہ حکومت کی تھی، وہ برطانوی استعمار کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ۹۰ برس تک غلامی کا طوق پہنے رکھا۔ برہمن قیادت نے انہیں سیاسی، معاشی اور تہذیبی حقوق سے محروم کرنے اور ان سے ۸۰۰ سالہ غلامی کا بدلہ چکانے کے لیے انگریزوں سے ساز باز کر لی تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے اس دور ابتلا میں جلیل القدر مصلح، علماء، محقق اور علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ جیسے نابغہ روزگار مفکر اور مدبر پیدا ہوئے جنہوں نے مسلم سوسائٹی میں عظمت رفتہ کی بازیابی کی جوت جگائی اور آئینی جدوجہد کے ذریعے مسلمانوں کو علیحدہ وطن کی منزل سے ہمکنار کیا۔

برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی میں علمائے حق، مجاہدین، سیاسی زعماء اور بے باک صحافی پیش پیش رہے جنہوں نے برطانوی استعمار کی ہیبت اور ہندوؤں کی عیاری کے بت پاش پاش کر دیے تھے۔ ریشمی رومال، ہجرت اور خلافت کی تحریکوں، احرار اور خاکسار کی تنظیموں اور جماعت اسلامی کی فکری کاوشوں نے مسلمانوں کا دینی اور سیاسی شعور بلند کرنے میں زبردست حصہ لیا۔ اسی ابھرتے شعور کو آل انڈیا مسلم لیگ نے آگے چل کر تحریک پاکستان کے قالب میں ڈھال دیا۔ حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں برصغیر کے مسلمان ایک ناقابل تسخیر سیاسی قوت بن گئے تھے اور انگریزوں اور ہندوؤں کو ان کے علیحدہ وطن کا قومی مطالبہ تسلیم کرنا پڑا تھا۔ آئینی جدوجہد کے ذریعے پاکستان کا حصول اس عظیم سیاسی جماعت کا ایک درخشندہ اور لافانی کارنامہ تھا، لیکن تحریک سے ایک مستحکم سیاسی جماعت کی طرف سفر کے دوران کچھ ایسے مشکل مقام آئے جن سے پاکستان کا سیاسی وجود خطرات سے دوچار ہوتا گیا اور مشرقی پاکستان دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہم سے جدا ہو گیا۔ یہ بیسویں صدی کا بدترین سیاسی سانحہ اور ہماری قیادتوں کی غفلت، خود غرضی اور کوتاہ بینی کے لیے شدید ترین تازیانہ تھا۔

☆☆☆

اس بدترین تاریخی حادثے کے اسباب میں جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور تہذیبی عوامل کے علاوہ سیاسی جماعتوں کا کردار سب سے اہم رہا جو پاکستان کے دونوں بازوؤں کو ایک ساتھ رکھنے میں ناکام رہی تھیں۔ وہ مسلم لیگ جس نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو منظم کرنے کا عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا تھا، وہ حصول آزادی کے چند ہی سال بعد دھڑوں میں بٹ گئی۔ ری پبلکن پارٹی نے راتوں رات اسی کے کٹن سے جنم لیا تھا۔ مشرقی بنگال میں ۱۹۵۴ء کے انتخابات مسلم لیگ کی عبرت ناک شکست پر منبج ہوئے۔ اس شکست سے ہمارے قومی وجود کو اس اعتبار سے بڑا دھچکا لگا کہ وہ مسلم لیگ جس کی بنیاد ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ ہی میں رکھی گئی تھی اور سب سے بڑے مسلم اکثریتی صوبے کے وزیر اعظم فضل الحق نے منٹو پارک لاہور میں ۱۹۴۰ء کے تاریخ ساز اجلاس میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی قرارداد پیش کی تھی، اسی صوبے میں مسلم لیگ آزادی کے ابتدائی ۷ برسوں ہی میں عوام کی حمایت اور اقتدار سے محروم ہو گئی تھی۔ اس کا بڑا

سبب اس کے حکمرانوں کا غیر جمہوری طرز حکمرانی تھا۔ وزیر اعلیٰ نور الامین ایک طالب علم کے ہاتھوں اس لیے شکست کھا گئے کہ وہ عوام کا سامنا کرنے سے گھبراتے اور عوام کے بنیادی مسائل سے آنکھیں چراتے تھے۔ وہ ۱۰ نشستوں پر ضمنی انتخابات حیلے بہانوں سے ٹالتے اور مخالفین کو طاقت سے دبانے کی پالیسی پر گامزن رہے۔ اس روش کے خلاف ۱۹۵۴ء میں سیاسی بغاوت ہوئی جس نے ملکی شیرازہ بکھیرنے کا آغاز کر دیا تھا۔

۱۹۵۴ء کے کٹن سے جنم لینے والے واقعات نے سیاسی جماعتوں کی قوت اور ان کے باہمی رشتوں پر کاری ضرب لگائی اور خوفناک فتنوں کو ہوا دی۔ یہی وہ سال تھا جب محلاتی سازشوں کے ذریعے چشم زدن میں ری پبلکن پارٹی وجود میں آئی اور اقتدار کا ایک ڈراؤنا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ وہ عناصر حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہو گئے جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر کے اس امر کی سر توڑ کوشش کی تھی کہ صوبہ سرحد پاکستان میں شامل نہ ہونے پائے۔ اسی سال اسٹیمبلشمنٹ کو پہلی دستور ساز اسمبلی کو توڑ دینے، ایمر جنسی نافذ کرنے اور ٹیلنٹڈ (Talented) کابینہ بنانے کا موقع ملا جس میں کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خاں، وزیر دفاع، سیکرٹری داخلہ اسکندر مرزا، وزیر داخلہ اور پاکستان کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی وزیر خزانہ کے طور پر شامل کیے گئے۔ یوں بیوروکریٹس کو سیاستدانوں پر حاوی ہونے کا راستہ مل گیا۔ دستور ساز اسمبلی توڑ دینے کے بعد گورنر جنرل ملک غلام محمد نے فیصلہ کر چکے تھے کہ چند من پسند افراد کا کنونشن بلا کر اپنی مرضی کا دستور منظور کرا لیا جائے اور وہ اقتدار پر قابض رہیں۔ فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس جناب محمد منیر نے دستور ساز اسمبلی کی تحلیل کو جائز قرار دے دیا جس نے مارشل لاء کا راستہ ہموار کیا، تاہم دستور کی تدوین کے لیے نئی دستور ساز اسمبلی کے باقاعدہ انتخاب کا حکم صادر کیا۔ اسی سال مغربی پاکستان کو ون یونٹ میں تبدیل کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوا جس کے نتیجے میں قربتوں کے بجائے نفرتیں پروان چڑھیں، عوام کے مسائل میں بے پناہ اضافہ ہوا اور چھوٹے صوبوں میں علیحدگی کی تحریکیں زور پکڑنے لگیں۔

☆☆☆

آمرانہ مزاج رکھنے والے منصوبہ سازوں کی اولین خواہش یہ تھی کہ سیاسی لیڈروں کی زیادہ سے زیادہ جگہ ہنسائی کر کے انھیں بے وقار اور ناتواں بنا دیا جائے، مگر وہ اس بنیادی حقیقت سے آنکھیں بند رکھے ہوئے تھے کہ ملک گیر اور منظم سیاسی جماعتیں ہی معاشرے کو متحد، ریاست کو مستحکم اور عوام کو اعلیٰ مقاصد کی نگہبانی کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اقتدار کے پجاری سیاسی جماعتوں کے اندر شکاف ڈالتے اور انھیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ اس طرح ایک مختصر سا ٹولہ سیاہ و سپید کا مالک بن بیٹھا جس نے قوم کے اتحاد پر منفی اثرات مرتب کیے۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد فیلڈ مارشل ایوب خاں سیاست میں

اُنہیں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھنے والی سیاسی قیادت اور سیاسی جماعت معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ اس مرحلے میں یہ احساس بھی آ جا کر ہونے لگا تھا کہ تنہا فوج پاکستان کو متحد نہ رکھ سکے گی۔

☆☆☆

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ حقیقت آخر کار کھل کر سامنے آ گئی جو دو عشروں سے پرورش پا رہی تھی۔ انتخابی نتائج سے معلوم ہوا کہ پاکستان کے دونوں بازو سیاسی طور پر ایک دوسرے سے بہت دور جا چکے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ نے چھ نکات کی بنیاد پر مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی دو کے سوا تمام نشستیں جیت لی تھیں اور جنرل یحییٰ خاں کے ایل ایف او کی رو سے مشرقی پاکستان کو قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو چکی تھی اور شیخ مجیب الرحمن اکثریتی جماعت کے پارلیمانی لیڈر بن گئے تھے۔ المیہ یہ تھا کہ اُس کی جماعت نے مغربی پاکستان سے ایک بھی نشست حاصل نہیں کی تھی اور یوں مکمل طور پر سیاسی تقسیم عمل میں آ چکی تھی۔ اس واضح تقسیم سے وفاق پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ چکا تھا، کیونکہ دستور کی تدوین کا نہایت کٹھن مرحلہ ابھی باقی تھا۔ مستقبل پر نگاہ رکھنے والی بعض سیاسی شخصیتیں کنفیڈریشن کے فارمولے پر کام کر رہی تھیں، لیکن کوتاہ نظر عسکری اور سیاسی قیادت نے مذاکرات کا عمل ٹینکوں تلے روند ڈالا اور مشرقی پاکستان میں بڑی خونریزی ہوئی۔ بھارت کو ملتی باہنی کی شکل میں فوجی مداخلت کا موقع مل گیا تاہم سخت مزاحمت کے بعد لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خاں نے بغاوت پر قابو پا لیا اور ایک حد تک امن و امان قائم ہو گیا۔ متحدہ پاکستان سے محبت کرنے والی چند با اثر سیاسی شخصیتیں در پردہ اس منصوبے پر کام کر رہی تھیں کہ بھارت میں قیام پذیر عوامی لیگ کی قیادت اور پاکستان کے حکمرانوں کے مابین مذاکرات کے ذریعے مستقبل کا نقشہ طے ہو جائے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا ایک علامتی فریم ورک تیار کر لیا جائے۔ ان دنوں شیخ مجیب الرحمن میانوالی جیل میں تھے اور عالمی شہرت کے قانون دان جناب اے کے بروہی اُن کا دفاع کر رہے تھے۔ اُنھوں نے راقم الحروف پر یہ راز افشا کیا کہ نائمہ و پیام جاری ہے اور اچھی پیش رفت کی امید پیدا ہو رہی ہے، مگر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خاں کی جولائی ۱۹۷۱ء کی تقریر خرمین امید پر برق بن کے گری۔ فوجی قیادت نے مغربی پاکستان میں طویل جنگ بجا دیا تھا، کیونکہ بھارت نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر گولہ باری شروع کر دی تھی اور مشرقی پاکستان میں پاکستان کی بقا کا آخری معرکہ برپا تھا۔

یہ خانہ جنگی بنیادی طور پر اس تنازع پر شروع ہوئی تھی کہ عوامی لیگ نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لی ہے، اس لیے قومی اسمبلی کا اجلاس بلا کر شیخ مجیب الرحمن کو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ پہلے جنرل یحییٰ خاں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلا نے میں لیت و لعل سے کام لیتے رہے اور جب مشرقی پاکستان میں بے چینی بڑھنے لگی، تو اجلاس کی تاریخ دینے کے بعد وہ منسوخ کر دی گئی۔ اس پر مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں عوام کر فیو توڑ کر سڑکوں پر نکل آئے اور سول نافرمانی نے پورے صوبے کو اپنی پلیٹ میں

کرپشن پھیلانے اور قد آور سیاسی رہنماؤں کو بدنام کرنے میں بہت سرگرم رہے۔ اُنھوں نے لیڈروں کے ذریعے تمام قومی قائدین کو سیاست سے بے دخل کر دیا اور اُن کی جگہ بے اصول اور جاہ پرست لیڈر گملوں میں تیار کیے۔ حسین شہید سہروردی ایک ایسے بلند قامت لیڈر تھے جو مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے ساتھ مضبوط سیاسی رشتوں میں استوار رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، مگر صدر ایوب خاں اُنھیں اپنا سیاسی حریف سمجھ بیٹھے۔ پہلے اُن پر ایڈووکیٹ اور کیا اور بعد میں بعض مستند شواہد کے مطابق اُنھیں زہر دے کر اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ وہ تو اس دنیا سے رخصت ہو گئے، مگر جو پاکستان وہ چھوڑ کر گئے، اس میں سیاسی رشتے بہت کمزور ہوتے گئے۔ وہ عوامی لیگ کے صدر اور شیخ مجیب الرحمن سیکرٹری جنرل تھے، جبکہ مغربی پاکستان سے نوابزادہ نصر اللہ خاں اور اُن کے ساتھی اُس سے وابستہ تھے۔ شیخ مجیب الرحمن جب عظیم قومی لیڈر سہروردی کے بعد اس جماعت کے صدر بنے تو اُن کے رویوں اور فیصلوں سے بدل ہو کر نوابزادہ نصر اللہ خاں عوامی لیگ سے علیحدہ ہو گئے اور یوں اُس کا اثر و رسوخ مغربی پاکستان میں حد درجہ محدود ہو گیا۔ دوسری جماعت جس میں دونوں بازوؤں کے معروف لیڈر شامل تھے، اُس کا نام نیشنل عوامی پارٹی تھا جس کے سربراہ مولانا عبدالحمید بھاشانی تھے۔ آگے چل کر اس میں بھی شکاف پڑا اور جناب عبدالولی خاں نے اپنا گروپ علیحدہ بنا لیا۔ اس طرح مشرقی اور مغربی پاکستان میں کوئی ایسی ملک گیر جماعت موجود نہ رہی جو دونوں طرف کے عوام میں گہری جڑیں رکھتی ہو۔

دونوں بازوؤں کے مابین سیاسی رشتے جوں جوں کمزور پڑتے گئے، توں توں اُن کے درمیان فاصلے بڑھتے اور علیحدگی پسندی کے رجحانات پرورش پاتے رہے۔ عوام آمرانہ صدر راتی نظام سے تنگ آئے ہوئے تھے، چنانچہ جب ایوب خانی حکومت نے ”عشرہ ترقی“ منایا تو عوام نے بغاوت کر دی اور مطلق العنان حکمران کو معاملات طے کرنے کے لیے فروری ۱۹۶۹ء میں گول میز کانفرنس بلانا پڑی۔ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو نے کانفرنس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا تھا۔ مغربی پاکستان سے زیادہ تر سیاسی زعماء شریک ہوئے، مگر کونسل مسلم لیگ کے صدر جناب میاں ممتاز دولتانہ کی طرف سے یہ مطالبہ سامنے آیا کہ شیخ مجیب الرحمن کو رہا کر کے اُسے گول میز کانفرنس میں شمولیت پر آمادہ کیا جائے۔ اُن کے اس مطالبے پر بعض سیاسی اور صحافتی حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی، مگر امر واقعہ یہ تھا کہ مغربی پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں مل کر بھی مشرقی پاکستان کی نمائندگی کا حق ادا نہیں کر سکتی تھیں، کیونکہ شیخ مجیب الرحمن عوامی مقبولیت کے ایک ایسے مقام پر فائز ہو چکے تھے کہ اُن کے بغیر کوئی سیاسی سمجھوتا قابل قبول تھا اور نہ اس پر عمل ممکن تھا۔ شیخ صاحب فاتحانہ انداز میں راولپنڈی آئے اور صدر ایوب خاں نے گول میز کانفرنس کے جو مطالبات منظور کیے تھے انہیں ناکافی قرار دیتے ہوئے پارلیمانی جمہوریت کے حق میں اور حکومت کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان کر دیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ پاکستان کے دونوں بازو سیاسی طور پر ایک دوسرے سے کٹتے جا رہے ہیں اور

لیے دن رات کاوش کر رہے ہیں اور اُن کے سیاسی پیروکار بلا مبالغہ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ جناب الطاف حسین بھی سندھ کے شہروں میں ایک قائد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جناب عمران خاں نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور مل کلاس کی امیدوں کا مرکز بننے جا رہے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن کی شخصیت کا سحر بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے اور اُن کے دم قدم سے پاکستان کا بول بالا ہے۔ عوامی نیشنل پارٹی کی قیادت بھی لوگوں کو متحد اور منظم رکھنے میں ایک تاریخی کردار رکھتی ہے۔ جماعت اسلامی کی فکری، علمی اور سیاسی خدمات کا گلزار کہکشاں پورے ملک میں آباد ہے۔ ہمیں اُن قائدین کا بہت احترام کرنا چاہیے جو بلوچستان جیسے انتہائی سنگناخ علاقے میں سیاسی فصل کی کاشت اور حفاظت بڑی مردانگی، جان فشانی اور بردباری سے کر رہے ہیں۔

قومی شیرازہ بندی میں سیاسی جماعتوں کی ناگزیر ضرورت کا صحیح تعین کر لینے کے بعد ہمیں اُن بنیادی نکات پر نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کرنا ہوگا جو سیاسی فضا میں ایک عظیم تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اُن پر بہت بڑا اعتراض خاندانی موروثیت کے حوالے سے ہو رہا ہے جس میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، لیکن برصغیر کی سیاست میں یہ چلن مدت سے چلا آرہا ہے۔ بھارت جو اپنے آپ کو سب سے بڑی جمہوریت قرار دیتا ہے، وہاں ابھی تک بھی شہر و خاندان کی موروثیت سیاست کا ایک اہم عنصر بنی ہوئی ہے اور یہی ڈرلے کر کانگریس کو اپنی سیاسی حیثیت قائم رکھنے کے لیے سونیا گاندھی کو اپنا سربراہ بنانا پڑا کہ وہ اندرا گاندھی کی بہو ہے، حالانکہ وہ خود اطالوی نژاد ہے۔ بنگلہ دیش میں بھی شیخ مجیب الرحمن اور جنرل ضیا الرحمن کی خاندانی وراثت کا سکہ چل رہا ہے۔ سری لنکا میں بھی ایک ہی خاندان طویل عرصے سے اقتدار کا وارث چلا آرہا ہے۔ پاکستان کی پیپلز پارٹی کے لیے بھٹو خاندان سے وابستگی سب سے ضروری ہے اور اسی لیے بلاول زرداری کے ساتھ بھٹو کا لاحقہ لگانا پڑا ہے۔ عوامی نیشنل پارٹی میں بھی خاندانی وراثت قائم ہے۔ اسی طرح مسلم لیگ قاف بھی ایک ہی خاندان کے گرد گھوم رہی ہے، جبکہ مسلم لیگ نون میں خاندان کو فوقیت دی جاتی رہی ہے، تاہم اس رجحان میں بتدریج کمی آرہی ہے۔ جماعت اسلامی ایک دینی اور سیاسی جماعت ہے جو خاندانی موروثیت سے بالکل ماورا ہے۔ اس امر کا بھی قوی امکان ہے کہ متحدہ میں بھی موروثیت کا سلسلہ قائم ہی نہ ہونے پائے۔ بلوچستان میں سیاسی جماعتیں اب جمہوری بنیادوں پر آگے بڑھ رہی ہیں۔ تحریک انصاف میں داخلی انتخابات کے کامیاب تجربے سے سیاست میں جمود ٹوٹ رہا ہے اور عوام کے ساتھ براہ راست رشتے مضبوط کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔

☆☆☆

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی حکومتوں اور سیاسی جماعتوں میں کرپشن کی وبا بہت پھیلی ہوئی ہے جس کی شروعات فیلڈ مارشل ایوب خاں کے آمرانہ دور میں ہوئی تھی۔ ۱۹۵۸ء سے پہلے کسی وزیر یا اعلیٰ عہدے پر فائز

لے لیا جس پر قابو پانے کے لیے فوجی آپریشن کا تباہ کن راستہ اختیار کیا گیا۔ بھارت نے عالمی برادری میں اس کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کیا اور پاکستان کو پوری دنیا میں تنہا کر ڈالا۔ اس کے علاوہ کئی باہنی جسے بھارت میں فوجی تربیت دی گئی تھی، اُس نے پاک فوج پر حملے شروع کر دیے اور ستر پیچک مقامات قبضے میں لے لیے اور بھارتی فوج نے بھی ہر طرف سے ینلغار کر دی تھی۔ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں فائر بندی کے فارمولے پر ابھی بحث جاری تھی کہ یکا یک سرنڈر کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا آج تک ایک معرہ بنا ہوا ہے جس کی عقدہ کشائی سے بہت سارے راز بے نقاب ہوں گے۔ سانحہ مشرقی پاکستان سے ہمیں چند اہم سبق ملتے ہیں جو آج کے تناظر میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا یہ کہ وطن میں استحکام کو فروغ دینے کے لیے سیاسی جماعتوں کا ایک مضبوط نظام اور استحکام ازس ضروری ہے۔ دوسرا یہ کہ انتخابات کے نتائج خوش دلی سے تسلیم کرنے اور اُن کے مطابق انتقال اقتدار کا ایک قابل اعتنا دستم بے حد ناگزیر ہے۔ تیسرا یہ کہ مسائل مذاکرات کے ذریعے طے کرتے رہنے سے معاشرے میں ہم آہنگی اور خود اعتمادی پروان چڑھتی ہے۔ چوتھا یہ کہ فوج اپنے عوام کے خلاف جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ پانچواں یہ کہ معاشی اور معاشرتی استحکام کے لیے قانون کی حکمرانی، انصاف کی فراہمی اور انسانوں کی تہذیبی اقدار کا احترام اور اُن کی بنیادی ضرورتوں کی نگہبانی بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

☆☆☆

آج ہم جن گھمبیر خطرات سے دوچار ہیں، وہ سیاسی اور جمہوری عمل کے تسلسل اور صحت مند ارتقا کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ عظیم کام تمام جمہوری معاشروں کی طرح سیاسی جماعتیں ہی بہتر طور پر سرانجام دے سکتی ہیں، لیکن ہمارے ہاں سیاست دانوں پر پھبتیاں کسنا، انہیں ذلیل ترین مخلوق سمجھنا، اُن میں کیڑے نکالتے رہنا، ہمارے صحافیوں، ادیبوں، دانش وروں اور فوجی دماغوں کا ایک محبوب مشغلہ چلا آرہا ہے۔ اُن کے بارے میں عمومی تاثر یہ ابھار دیا گیا ہے کہ وہ حد درجہ نااہل، کوتاہ نظر، عیاش اور بدعنوان واقع ہوئے ہیں۔ سیاسی جماعتوں پر یہ الزام ہے کہ وہ عوام کے بجائے چند خاندانوں اور اونچے گھرانوں کی لونڈیاں ہیں اور انہی کے مفادات کی آبیاری کرتی رہتی ہیں۔ بلاشبہ سیاسی جماعتوں اور قیادتوں کا محاسبہ ایک صحت مند جمہوری معاشرے کی بقا اور نشوونما کے لیے کسی قدر ناگزیر ہے، مگر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان کے بغیر یا اُن پر سے اعتماد اٹھ جانے کے بعد معاشرے کا شیرازہ کبھر جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا اور ذات برادریوں پر مبنی سلطنتیں قائم ہو جائیں گی جو قومی وحدت کی جڑیں کاٹ ڈالیں گی۔ ہم جناب آصف علی زرداری کو ہدف تنقید بناتے رہتے ہیں، مگر سامنے کی حقیقت یہ ہے کہ اُن کی پارٹی تمام صوبوں میں اثر و رسوخ رکھتی اور اتحاد کی زنجیر بنی ہوئی ہے۔ تاہم اس کا غیر مہذب کلچر تبدیل کرنے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اسی طرح جناب محمد نواز شریف قومیت پرست جماعتوں کو قومی دھارے میں لانے کے

بیوروکریٹ کے بارے میں رشوت لے کر کام کرنے کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں تھا، مگر اب کوئی بھی کام بھاری رشوت کے بغیر نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جگہ جگہ منصب داروں کی دکانیں کھلی ہیں اور سر عام بڑے بڑے سودے کیے جا رہے ہیں اور قومی وسائل لوٹے جا رہے ہیں تو ادارے کیا ترقی کریں۔ اس کچھر کے خلاف رائے عامہ بیدار اور منظم ہونے لگی ہے اور فعال میڈیا نے بدعنوانیوں کا سراغ لگانے میں کمال سراغ رسانی کے جوہر دکھائے جبکہ آزاد اور سرگرم عدالت عظمیٰ نے قوم کے اربوں روپے ہڑپ ہونے سے بچا لیے ہیں۔ پارلیمانی کمیٹیاں بھی احتساب کا حق ادا کر رہی ہیں اور جرنیلوں کا بھی احتساب کر رہی ہیں۔ ان اقدامات سے کرپشن کے خلاف شدید نفرت دیکھنے میں آ رہی ہے اور اس امر کا قومی امکان پایا جاتا ہے کہ آنے والے انتخابات میں وہ سیاسی جماعتیں بڑے گھائٹے میں رہیں گی جن کے امیدواروں سے بدعنوانیوں کی بو آ رہی ہوگی کیونکہ عوام انھیں مسترد کر دیں گے اور اچھی اخلاقی اور سیاسی شہرت رکھنے والوں کو ووٹ دیں گے۔ اب حسن ظن یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں امیدواروں کے انتخاب میں ذاتی کردار کو بنیادی اہمیت دیں گی اور مالی وسائل کی ریل پیل پر کم انحصار کریں گی۔ لوگوں میں یہ چرچے بھی ہو رہے ہیں کہ سول سوسائٹی بدعنوان اور بدکردار امیدواروں کا نامہ اعمال میڈیا کے ذریعے مستہتر کرنے کے علاوہ ان کا گھیراؤ بھی کر لے گی، کیونکہ ان انتخابات میں ان کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ اس مرتبہ ریٹرننگ آفیسر آئین کی ۶۲ اور ۶۳ دفعات پر نامزدگی کے کاغذات پرکھیں گے اور انھیں تفصیلی سکروٹی کے لیے مناسب وقت دیا جائے گا۔ کرپشن ایک عالمگیر مرض کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑے ملک چین اور بھارت میں بھی بڑے پیمانے پر کرپشن موجود ہے، مگر ترقیاتی کام ہو رہے ہیں، جبکہ پاکستان میں ترقیاتی اور فلاحی منصوبے کرپشن کی بھیئت چڑھ رہے ہیں۔ اس تباہ کن عمل کی روک تھام نہایت ضروری ہو گئی ہے کیونکہ عوام بیروزگاری، مہنگائی اور مفلسی کے ہاتھوں بغاوت پر تلے ہوئے ہیں۔

سیاسی جماعتوں کو بھی اس حقیقت کا بھرپور ادراک ہونا چاہیے کہ جب وہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی اور اپنے حریفوں کو چوروں، لٹیروں اور علی بابا چالیس چور کے القاب سے پکاری ہیں، تو وہ مجموعی طور پر ملکی سیاست کی حیثیت اور طاقت پر کاری ضرب لگاتی ہیں۔ دنیا میں ہماری جوا کھڑی جا رہی ہے اور بیرونی سرمایہ کار خاندانوں کی سرزمین میں آنے سے خوف زدہ ہیں۔ وہ قد آور سیاسی شخصیتیں اور جواں ہمت سیاسی جماعتیں جنھوں نے آمریت کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور جمہوریت کی بحالی میں ناقابل فراموش قربانیاں دی ہیں۔ انھیں بدست لوگ اپنے پاؤں تلے روندنے پر تلے ہوئے ہیں۔ شرق وسط میں ڈکٹیٹریس چالیس برسوں سے پہلے اقتدار سے ہٹائے نہیں جاسکے اور انھیں ہٹانے کے لیے عرب عوام کو خون کے دریاعہ عبور کرنا پڑے ہیں، جبکہ پاکستان میں آمریت سے جمہوریت کا سفر بالعموم پُر امن اور عظیم جدوجہد کا مظہر ٹھہرا ہے۔ ہمیں اس عظیم الشان ورثے کو تضحیک کا نشانہ بنانے کے بجائے اس کا احترام کرنا چاہیے۔ سیاسی جماعتیں

اور سیاسی قیادتیں اگر بالغ نظری کا ثبوت دیں گی، تو کوئی ادارہ اور کوئی طاقت ان کے مد مقابل نہیں ٹھہر سکیں گے کہ وہ عوام کی قوت کی پاسدار ہیں۔ آج ہمیں خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ عام انتخابات شاید وقت پر نہ ہو سکیں، کیونکہ نت نئے فتنے سر اٹھا رہے ہیں اور قومی سلامتی کے مسائل پیدا کیے جا رہے ہیں۔ اس خطرے کے سد باب کا ایک ہی فطری اور سیدھا راستہ ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں دسمبر کے آخر تک گمران حکومتوں کے قیام پر متفق ہو جائیں اور انتخابات کو شفاف بنانے پر بھرپور توجہ دیں۔ انتخابات کے لیے مارچ کا مہینا بہت سازگار ہوگا کہ ان دنوں بہت گرمی ہوگی نہ لوڈ شیڈنگ کا عذاب لوگوں پر مسلط ہوگا۔ وہ کسی قدر سکون اور یک سوئی کے ساتھ اپنے نمائندوں کا انتخاب کر لیں گے اور ان سیاسی قوتوں کو آگے لائیں گے جو مضبوط بنیادوں پر قوم کی شیرازہ بندی کر سکیں گی۔

سیاسی جماعتوں کا بہت بڑا مسئلہ حقیقی معنوں میں اجتماعی مشاورت کا فقدان ہے۔ یوں تو ہر جماعت میں جنرل کونسل بھی ہے اور ورکنگ گروپس بھی اور نام کے تھنک ٹینک اور تہہ نہ کم میٹیاں بھی، مگر فیصلے کچن کیبٹ ہی کرتی ہے جس میں لیڈر کے گئے چنے افراد ہوتے ہیں۔ اسی روش نے سیاسی جماعتوں کے اندر فطانت کی آبیاری کی اور سیاسی جماعتوں کی افادیت کو بہت نقصان پہنچایا۔ بسا اوقات پارٹی کے اہم لوگ بھی اپنے آپ کو غیر متعلق سمجھنے لگتے اور معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں اور کارکن اور قائد کے درمیان کوئی رشتہ قائم نہیں رہتا۔ تب خوشامدیوں اور موقع پرستوں کی اجارہ داری مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں صحت مند سیاسی مسابقت سے سیاسی جماعتیں نئے سرے سے اپنی شیرازہ بندی کرنے اور ایٹوز کو اہمیت دینے پر مجبور ہو جائیں گی۔

کراچی، بلوچستان اور فاٹا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس نے ہماری قومی زندگی میں سخت اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایگزیکٹو عدلیہ کو آنکھیں دکھا رہی ہے اور عدلیہ اپنی طاقت سے بڑھ کر حالات میں بہتری لانے کے لیے فیصلے صادر کر رہی ہے۔ اٹارنی جنرل عدلیہ کی اعانت کرنے کے بجائے اسے دھمکیاں دے رہے ہیں اور فاضل چیف جسٹس کے گرد گھیرا ڈالنے کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ دوسری طرف ایئر مارشل اصغر خاں کے مقدمے کا جو فیصلہ سامنے آیا ہے اس میں کھلا تضاد پایا جاتا ہے اور مختلف اداروں میں ایک ہیجان کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ فاضل چیف جسٹس اپنے بیٹے اور آرمی چیف اپنے بھائی کے ہاتھوں سخت آزمائش سے گزر رہے ہیں اور حاسدین آئے دن شوشے چھوڑ رہے ہیں۔ ان پیچیدہ حالات میں سیاسی قیادتوں کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انھیں پیش قدمی کرنا اور سلطنتی ہوئی صورت حال کا ایک سیاسی حل تلاش کرنا ہوگا۔ اسلام آباد میں ڈی ایٹ کی سربراہ کانفرنس نے امیدوں کے قمقمے روشن کر دیے ہیں اور ایک دنیا کو یہ پیغام دیا ہے کہ پاکستان دہشت گردی کا ہدف بن جانے کے باوجود جلد دست قوت ارادی اور سیاسی بصیرت کا حامل ہے۔

شکستِ آرزو

جب پاکستان دولخت ہوا

پاکستان سے عہد وفا نبھانے والوں کو ہم نے تنہا کیوں کر دیا؟

سید شاہد ہاشمی

دیکھ ہمارے مشرقی بازو کے ٹوٹے اور الگ ہونے کے درد سے بھرا مہینا ہے اور شکستِ آرزو ایک محب وطن بنگالی کی آرزوؤں اور خوابوں کے ٹوٹنے کا ماجرا جو دہرے کے ان دنوں کو عمر بھر نہ بھول سکے۔ مشرقی پاکستان پر بھارتی قبضے کی مزاحمت کرنے والوں کا ذکر بھی اب ہمارے ہاں جرم ٹھہرا ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر ملک بچانے والے اب اجنبی ہیں اور ان کی باتیں کسی اور جہاں کی لگتی ہیں۔

سابق

مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کی تاریخ بھی اس طرح نہیں لکھی جاسکے گی کہ تمام متعلق فریقوں کو اُس سے

اتفاق ہو۔ یوں تو اجتماعی زندگی کے ہر اہم اور حساس معاملہ میں ایسا ہی ہوتا ہے، مگر مشرقی پاکستان کو پاکستان سے کاٹ ڈالنے کے عمل جیسا خونیں باب، اس طرح بیان کرنا کہ پاکستان سے وفاداری نبھانے والوں اور اس سے بے وفائی کرنے والوں کا موقف یکساں طور پر سمجھا لیا جائے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مشرقی پاکستان پر بھارتی حملہ و قبضہ کی مزاحمت کرنے والوں کی تاریخ کا آج کوئی والی و وارث اور کوئی وکیل و مدعی موجود نہیں۔ لہذا پاکستان سے عہد وفا نبھانے والے، ایک طرف بنگلہ دیش میں ”غدار و باغی“ تخریب کار و قاتل اور جنگی مجرم“ وغیرہ قرار دیے جا رہے ہیں تو دوسری طرف موجودہ پاکستان (پاکستان

پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی اصطلاح میں ”نئے پاکستان“) میں غیر وابستہ اور ٹکڑے بن کر رہ گئے ہیں۔ خود پاکستانی اخباری کالموں اور نصابی کتابوں میں وہ ”فوجی گٹھ جوڑ میں شامل، مشرقی بازو کی رائے عامہ کا احترام نہ کرنے والے اور بنگالیوں کے قاتل“ جیسی گالیاں کھا رہے ہیں۔ ادھر بنگلہ دیش کا تعلیمی نصاب، پاکستان سے نفرت انگیزی اور قیام بنگلہ دیش کے سانحات کی مبالغہ آمیز تصویر کشی کا مرکب ہے۔ تو ادھر بھٹو کے ”نئے پاکستان“ میں ساری ملتی تاریخ اور تعلیمی نصاب کو (مغربی استعمار کی فراہم کردہ مالی اور دانشورانہ امداد کے زور پر) ”نفرت انگیز“ مواد سے ”پاک“ کیا جا چکا ہے۔ بنگلہ دیش میں عوامی لیگ اور بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ (RAW) کی سرپرستی میں قائم این جی اوز، باہم مل کر برادر بنگلہ دیشی عوام اور خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کا ذہن پاکستان کے حوالے سے زہر آلود کر چکے ہیں۔

مشرقی پاکستان ایک خود مختار ملک، پاکستان کا عالمی طور پر تسلیم شدہ حصہ تھا۔ پاکستان کے تحفظ و بقا کی اُس باری ہوئی جنگ میں اپنی اور خاندان کی زندگی اور مستقبل سے بے پروا ہو کر کود پڑنے والے لوگ بلاشبہ لائقِ داد تھے، لائقِ داد ہیں۔ ایسا کرنے والے کئی ملین بنگلہ بولنے والے مہاجن ملک و ملت بھی اُن میں شامل تھے۔ انہوں نے ابتدا ہی میں، بھارت کی ہتھی امداد و سازش اور رھنما مداخلت و جارحیت کے نتیجے میں بننے والے ”محصور“ ملک کا مستقبل، غیر محفوظ اور برزمن سامراج کے ہاتھوں ریغمال ہوتا ہوا دیکھ لیا تھا اور اس برے دن سے بچنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

بھارت کے محاصرے میں جکڑے بنگلہ دیش کی مثال تبتی میں گھری زبان کی طرح ہے۔ وہ تین اطراف سے خشکی کے ذریعہ اور ایک طرف سے خلیج بنگال کے راستے بھارت کے محاصرے میں ہے۔ نتیجتاً بنگلہ دیش پاکستان سمیت تمام ہمسایہ ممالک میں بھارتی لابی (Lobbies) اور اثرات میں تیز رفتار اضافہ ہوا ہے۔ بنگلہ دیش اس بھارتی ”سرماہیہ کاری“ اور ”سرماہیہ باری“ کے نتیجے میں کم از کم فی الحال پوری طرح بھارتی اثر و رسوخ اور ترجیحات کے تابع ہو چکا ہے۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کے مقام تک پہنچانے میں مددگار، مغربی پاکستان کے بعض وہ عناصر بھی تھے جنہیں ”اسلامی پاکستان“ سے کل بھی بغض تھا، آج بھی ہیرے اور جو اس خیال ہی سے چوتے اور منہ اور قلم سے جھاگ نکھیرنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ شکستِ آرزو کی یہ داستان اُسی زبان و انداز، نقطہ نظر اور رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، جو بھارتی سامراجی موقف رہا ہے

پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین (۱۹۲۰-۱۹۹۵ء)، اس کتاب (The Wastes of Time) کے مصنف، اعلیٰ پائے کے دانشور، انگریزی ادب کے استاد اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے آخری پاکستانی وائس چانسلر خود جلدی پشتی ”بنگالی“ تھے۔ اپنی نوجوانی کے زمانے میں، پاکستان کی محبت میں گرفتار ہوئے۔ عمر بھر حبِ پاکستان کی پیش میں جلتے اور پکتے رہے۔ شکستِ پاکستان و راسل اُن کی آرزوؤں اور خوابوں کی شکست و ریخت اور اُن کے شعور تاریخ اور نظریات کی تکذیب تھی، جسے وہ زندگی بھر قبول نہ کر سکے اور یہ صدمہ سینے سے لگائے اپنے رب کے ہاں چلے گئے۔

پاکستان کے پہلے عام انتخابات (۱۹۷۰ء) میں شیخ مجیب الرحمن کی اکثریت تسلیم نہ کر کے ”ایک ہی ملک میں دو وزراء نے عظم“ تجویز کرنے اور ”ادھر تم ادھر ہم“ کا نعرہ ”فرزاند“ لگانے والا یہ ملک فکر اپنی کم ظرفی، بد باطنی اور ملک دشمنی کا داغ اپنے تئیں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن اصل المیہ یہ ہے کہ کچھ باختیار ”مہاجن پاکستان“ نے مشرقی پاکستان کی سرزمین پر وفائے عہد کی راہ میں بننے والے لہو کو فراموش کر دیا اور جو لوگ زندہ بچے، ان سے قطع تعلق کر لیا۔ ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات و خیالات پر مبنی

شکستِ آرزو کی یہ داستان آپ کے دل کو لگے تو کتاب ضرور پڑھے۔ یہ سابق مشرقی پاکستان کو بھی اور پاکستان کے تاحیات عاشق زار ڈاکٹر سید سجاد حسین مرحوم کو سچی ہمارا حقیر سا نذرانہ تحسین ہوگا۔ شاید ہماری، آپ کی ایسی چھوٹی چھوٹی کاوشوں ہی کے نتیجے میں پاکستان سے عہد وفا نبھانے اور اس کے صلے میں شہادت و بے وطنی کے عذاب جھیلنے والوں کا مقدمہ، ضمیر و تاریخ کی عدالت میں تازہ رہے، لاوارث لہو کا حساب کسی کتاب جہاں میں بھی درج ہو جائے۔

”بنگلہ دیش“ اب ایک حقیقت ہے۔ ہم اس کو ملتِ اسلامیہ کا ایک بازو، عالمگیر اسلامی برادری کا ایک بادقار حصہ اور پاکستان کا بھائی اور دوست سمجھتے ہیں اور بنگلہ دیش کی آزادی و خود مختاری، تعمیر و ترقی اور عزت و سرفرازی کے لیے دعا گو ہیں۔

(ستوپ ڈھاکہ کے ماہ کی مناسبت سے ”شکستِ آرزو“ کے ایک بہت ہی اہم باب اس شمارے کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔)

سازش کا بیج - پروفیسر سید سجاد حسین (سابق وائس چانسلر ڈھاکا یونیورسٹی)

”پاکستان کے خلاف تحریک جوں جوں زور پکڑتی گئی سونار بنگلہ کا راگ اس قدر الاپا گیا کہ معمر افراد کے حافظے کو بھی پروپیگنڈے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ کچھ سوچنے بجھنے کے قابل نہ رہے۔

۱۹۷۰ء کے آتے آتے حالات یہ ہو چکی تھی کہ اگر کوئی شخص مشرقی پاکستان کے استحصال سے متعلق عوامی لیگ کے پروپیگنڈے میں کسی غامی کی نشاندہی کرتا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ عوامی لیگ کا فلسفہ قومی مفادات کے یکسر منافی ہے تو لوگ اسے غدار قرار دینے پر تکل جاتے تھے۔ تمام سیاسی جماعتیں شیخ مجیب الرحمن کی جانب سے خود مختاری کے مطالبے کی حمایت کے لیے میدان میں آگئی تھیں۔ بیشتر سیاسی جماعتوں نے شیخ مجیب الرحمن کے ۶ نکات کی بھرپور حمایت کا اعلان کر دیا جبکہ حقیقت میں یہ نکات ملک سے علیحدگی کے پروگرام کے سوا کچھ نہیں تھے۔ مگر کسی میں زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ اب عوامی لیگ کے منشور کے خلاف بولنا بنگالیوں کے مفاد کے خلاف بولنا تصور کیا جانے لگا تھا۔ مشرقی پاکستان میں آئینڈیل ازم نے ہر سچائی کو گھننا دیا تھا۔ سازش، جہالت، خیالی باتیں، غیر ملکیتوں کا خوف۔ ان تمام تصورات نے مل کر بوزھوں اور جوانوں کو یکساں طور پر ایک ایسی فضا کے حوالے کر دیا تھا جس میں صرف یہ بات یاد رکھنے کے قابل سمجھی جا رہی تھی کہ کسی زمانے میں بنگال کی سر زمین سونار بنگلہ تھی، اس علاقے میں دودھ کی ندیاں بہا کرتی تھیں۔ اب دنیا بھر سے لوگ اس خطے میں وارد ہو کر اس کی خوشحالی کو ٹوٹ کر لے جانے لگے تھے۔

☆☆☆

ملک توڑنے کی سازش کا بیج ڈالنے سے ۱۹۷۱ء میں اس فصل کے ”بار آور“ ہونے تک یکے بعد دیگر

الہ آباد اور آگرہ کے ارد گرد پورے خطے میں مختلف نسل لوگ ملیں گے۔ آریاؤں کی اولاد دین ترک، مغل، ایرانی اور پٹھان نسلوں میں گھل مل گئی ہیں۔

روٹا ہونے والے تمام واقعات کی بنیاد بنگالی قوم پرستی تھی۔ دانشوروں اور طلباء نے اس پرفریب ”نظریے“ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا عزم ظاہر کر کے اس کے ساتھ مکمل وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اس ضمن میں منطقی خطے کی نمایاں زبانیں بھی دراوڑ ہیں۔ ان تمام حقائق کے تجزیے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی اور نہ ہی موجود برصغیر کی تاریخ نسلی ہے نہ لسانی۔ شمال اور جنوب جذبات کی سطح سے بلند ہو کر معاملات کا جائزہ لینے کے بارے میں سوچا گیا۔ قوم پرستی پروان چڑھتی گئی اور اس پر فدا ہونے والوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں بنگالی قوم پرستی کے سراسر خلاف تھا لیکن نو جوانوں میں اس نظریے کی مقبولیت کا میں بھی اندازہ نہیں لگا سکا اور جب یہ ہم پٹھا توپتا چلا کہ مجھ سمیت کسی نے بھی بیچنے کی تیاری نہیں کی تھی۔

پاکستان کے خلاف عوامی لیگ نے جس بنگالی قوم پرستی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اسے ایک فریب اور سراب کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ مگر کیا بنگالی قوم پرستی کو معروف معنوں میں قوم پرستی قرار دیا جاسکتا ہے؟

سلطنت بنگال کو یہ نام زبان اور جغرافیہ دونوں کی بنیاد پر ملا۔ اس کی حدود میں بہار کے ہندی/اردو بولنے والے اور شمال مشرقی بھارت میں اڑیسہ کے علاقے بھی شامل تھے۔ مشرق میں بنگال کی سلطنت آسام کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی۔ نام کے سوا بنگال کی سلطنت میں مغلوں سے قبل کے زمانے کی ریاستوں کے مقابلے میں کوئی فرق نہ تھا۔

ہندوستان کے ہر دور میں زبانوں اور نسلوں کا تنوع رہا ہے۔ بہار کی مغربی سرحدوں سے پنجاب کی مشرقی سرحدوں تک پھیلے ہوئے زرخیز علاقے میں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ ملتے آتے ہیں۔ راجپوتوں کی رگوں میں خالص آریہ نسل کے لوگوں کا خون دوڑتا ہے۔ دارالحکومت دہلی، لکھنؤ،

والے مسلمان بڑی تعداد میں آباد تھے اور یہ لوگ اردو بولا کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ شمال کی طرف اسی طرح شک بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔

کھلا تضاد

ہندوستان نے باضابطہ پروپیگنڈا کیا کہ اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیے جانے سے مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمانوں کا استحصال ہو جائے گا اور انہیں غلامانہ زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ بھارت میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا مگر مغربی بنگال کے ہندوؤں کو اس میں اپنی زبان اور نسل کے لیے کوئی خطرہ دکھائی نہیں دیا! کیا یہ کھلا تضاد نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان کے نام نہاد

رومن ایسپار کی شکست و ریخت کے بعد یورپ

برصغیر پاک و ہند آج اسی مقام پر کھڑا ہے جہاں قرون وسطیٰ میں رومن ایسپار کی شکست و ریخت کے بعد یورپ تھا۔ انگریز کے چاسر (Chaucer)، اٹلی کے دانٹے (Dante)، فرانس کے رابیلیر (Rabelais)، لاطینی کے مقابلے میں اپنی اپنی زبانوں کا جھنڈا بلند کرنے کے باوجود اپنے آپ کو سب سے پہلے یورپین ہی گردانتے تھے۔ ان یورپی دانشوروں نے سمجھا لیا تھا کہ مختلف علاقوں اور لسانی مظاہر سے بڑھ کر یورپی ثقافت بھی جوان میں مشترک تھی۔

لسانی بنیاد پر قوم پرستی کی بات کرنے والوں کو ہنگری، ہالینڈ یا سوئٹزر لینڈ کی مثال پسند نہیں آئے گی۔ مگر کیا ریاستوں کی تشکیل میں ہم زبان اور خطے کے کردار کو تاریخی حقائق کے معاملے میں زیادہ اہمیت دیں گے؟ رومن سلطنت کے ٹوٹ کر بکھرنے پر یورپ نے جو کچھ کیا وہی سب کچھ برصغیر میں بھی ہوا۔ مغل سلطنت کے بکھرنے پر مختلف علاقوں میں بااثر قائدین کے زیر اثر چھوٹی چھوٹی ریاستیں نمودار ہو گئیں۔ مقامی سیاست کے الٹ پھیر نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ بہادر اڑیسہ اور بنگال پر مشتمل علی وردی خان کی بادشاہت، اودھ اور آگرہ میں نوابوں کی حکمرانی، پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت، مغرب میں مرہٹوں کی، حیدر آباد اور میسور میں مسلمانوں کی فرماں روائی مجموعی طور پر الگ الگ ریاستوں کی شکل میں باقی رہ سکی تھی مگر برصغیر میں برطانیہ اور فرانس کی کشمکش نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

جو کچھ حکمرانوں نے لوگوں پر مسلط کیا اس سے ہٹ کر برصغیر میں اتحاد اور یکجہتی کی بنیاد ہمیشہ مذہبی ثقافت پر رہی ہے۔ مغرب کے سرہنے، مشرق کے بنگالی اور دوسرے بہت سے علاقوں کے ہندوؤں کی مذہبی روایات ایک تھیں۔ ان کے دیوتا مشترک تھے، گیتا اور اپنیشتر پران کا کامل یقین تھا۔ مہا بھارت اور رامائن ان کے لیے شخص تنظیم نہیں تھیں بلکہ ان میں وہ مذہبی احکام بھی تلاش کرتے تھے۔ البتہ یہ اتحاد ہلا استثنائیں تھا، جزوی تھا۔ کروڑوں مسلمان تھے جو کسی بھی اعتبار سے ہندوؤں کی مذہبی روایات کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ برصغیر کے باشندوں کو ایک لڑی میں پرونے والی چیز ہندو ازم تھا یا پھر اسلام۔ زبان یا نسل نے بھی اتحاد کی بنیاد کا کردار ادا نہیں کیا۔ اگر ہندو ازم اور اسلام کو ٹکال دیا جائے تو اس خطے میں صرف نسلی اور قبائلی روایات اور ان کے باہمی تصادم سے پیدا ہونے والی بدخواہی ہی رہ جائے گی۔

دانشور ہندوستان کے اس کھیل کو سمجھنے میں ناکام رہے اور انہوں نے بنگالی زبان کو اردو سے لاحق خطرات پر واویلا شروع کر دیا۔ راتوں رات یہ بدگمانی پھیلا دی گئی کہ پاکستان میں بنگالی زبان کے خلاف کوئی زبردست سازش ٹھہری کر دی گئی ہے۔

بنگال کی تاریخ اور قحط

نام نہاد بنگالی اسکالر ز یہ بھی بتانے لگے تھے کہ بنگال کا عظیم شافقی ورثہ خطرے سے دوچار ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بھول بیٹھے کہ بنگال اُس وقت تک ۱۹۴۳ء کے قحط کے اثرات سے ہی چھکارا نہیں پاسکا تھا جبکہ دوسری جنگ عظیم کے باعث معیشت اور معاشرت کو بچھنے والے نقصانات کا ازالہ بھی اُس وقت تک نہیں ہو سکا تھا۔ بنگال میں قحط عام بات تھی۔ مختلف ادوار میں غذائی اجناس کی شدید قلت رونما ہوتی رہی ہے۔ عام حالات میں بھی غذا ایک مسئلہ رہا ہے مگر اس حقیقت سے بھی نظر چرائی گئی۔ ۱۹۴۳ء کے قحط سے پہلے ۴۳ سال قبل بھی بنگال میں ایک ایسا قحط پڑا تھا کہ لاکھوں جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ بنگالی ادب ہر بیس پچیس سال کے بعد رونما ہونے والے قحط اور اس کے نتیجے میں ہونے والی خوراک کی قلت سے متعلق کہانیوں سے بھرا پڑا ہے اس حوالے سے شاعروں نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس تکلیف دہ صورتحال پر بہت سی نظمیں بھی لکھی گئی ہیں۔ مگر بنگال کے ناخواندہ لوگوں کو جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا اور خیالی پلاؤ پکانا اچھا لگتا ہے۔ بنگال کی تاریخ قحط، سیلاب، طوفان اور افلاس سے عبارت ہے مگر وہ ان تمام باتوں کو بھول کر اس خیال سے دل کو بہلانا چاہتے ہیں کہ بنگال میں تو ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی تھی اور یہاں بھی کوئی بھوکا نہیں مرتا تھا۔

صدیوں سے بنگال کے حصے میں مشکلات ہی آئی ہیں۔ آبادی کی بہتات اور بھوک نے اس خطے کو دبوچ رکھا

ہے۔ سترہویں صدی میں کلینڈر کی وضع پر لکھی جانے والی نظمیں ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونی چاہئیں۔ ان نظموں میں کشاکش زندگی میں پیچھے رہ جانے والے انسانوں پر ہر بارہ ماہ میں آنے والے چکر کا ذکر کیا جاتا تھا جو اپنے تن کے کپڑوں سے بھی محروم تھے اور جن میں زندہ رہنے کی لگن بھی ختم ہو چکی تھی۔ جو کچھ انہیں غلہ کے نام پر ملتا تھا وہ بعض دوسرے خطوں میں جانوروں کی خوراک کے لیے بھی ناکافی اور غیر معیاری سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ تہذیب کے دائرے سے باہر ہوتے تھے اور ان میں اپنی حالت کو سمجھنے کی صلاحیت بھی نہ سلیقہ۔

بنگال کی خوشحالی پر پیٹا جانے والا ڈھول

بنگال میں وسائل اور آبادی کے درمیان ہمیشہ کھینچ تانی رہی ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے وسائل میں اضافے کے لیے کسی نے نہیں سوچا۔ زمین تو محدود ہے اور خوراک کے دیگر ذرائع بھی۔ ایسے میں خوشحالی کا کیسے سوچا جاسکتا ہے؟ بنگال کی زمین زرخیز ہونے کے باوجود لوگوں کو پیٹ بھرنے کی سکت اس لیے نہیں رکھتی کہ یہاں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔

قدرتی آفات بھی بنگال کا باقاعدگی سے رخ کرتی ہے کسی اور خطے میں جس کو دولت کہا جاتا ہے اس طرح کی رہی ہیں۔ بنگلہ دیش سمندری طوفانوں، مون سون ولت کا بنگلہ دیش میں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ کسی زمانے ہواؤں اور سیلابی ریلوں کی زد میں رہتا ہے۔ ان قدرتی زمینداروں کا ایک طبقہ تھا جو بڑی حویلیوں میں رہتا تھا آفات سے جانی نقصان بھی بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ مگر انہیں اعلیٰ معیار زندگی کا کوئی شعور نہیں تھا۔ اب تو یہ سال میں کوئی ایک مہینہ بھی آفات سے مکمل طور پر محفوظ طبقہ بھی تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ یہ حویلیاں کیا تھیں؟ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ستمبر ۱۹۷۶ء کے سمندری طوفان میں بیٹوں کی بے ترتیب بدلتا دیواریں، بلا فریجی سجاد، مشرقی پاکستان کے ۵ لاکھ سے زائد باشندے جاں بحق یا دی سہولتوں سے محروم، حفظان صحت سے عاری! آخر ہوئے تھے۔ ۱۹۵۴ء کے بعد کے ۱۰ برسوں کے دوران ولن ی آسائشیں جن کا انہوں نے اہتمام کر رکھا تھا؟ سمندری طوفانوں سے سالانہ ۴۰ سے ۴۵ ہزار افراد موت تک معیار زندگی کا جدید تصور سامنے نہیں آیا تھا، انہی کے منہ میں جاتے رہے۔

بنگال میں کوئی بھی شخص ان تمام سنگین حقائق سے بے خبر نہیں ہے اور یہ خبر بھی نہیں سکتا۔ یہاں غربت کا یہ ما کہ جو خوش حال تھے وہ دن میں تین وقت دودھ، عالم ہے کہ جو لوگ صبح کا ناشتا اور دو وقت کا کھانا باقاعدگی سے کھاتے اور پھل پر مشتمل کھانے کا انتظام کر پاتے تھے۔

بنگال میں شاندار زندگی کا تصور

ایک عام بنگالی کے ذہن میں کامیاب زندگی کا تصور بس یہ ہے کہ اُسے اپنے کھیتوں سے اناج، تالاب سے درختوں سے پھل اور گھر کے موبیشیوں سے دودھ حاصل ہو جائے۔ بہتر زندگی وہی تصور کی جاتی تھی جس میں کچھ لینے دینے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو۔ زرعی معاشرے کی یہ سوچ اسی وقت کا رگر ثابت ہو سکتی ہے جب زرعی معاشرہ خود کو باقی دنیا سے الگ تھک کر لے اور پھر کچھ لینے دینے پر یقین نہ رکھے۔ ترون وسطیٰ کے بنگالی اب سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ "اعلیٰ معیار" کی یہ زندگی بھی محض چند ہی افراد کو میسر تھی۔ آبادی کا بڑا حصہ انتہائی کمزور تھا۔ بہت کم نرخوں پر بھی یہاں لوگ کھانے پینے کا سامان خریدنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ یہ افلاس کی زندگی میں کسی جدت اور اہم جوئی کے فقدان سے اور سنگین ہو گیا۔ یا شاید افلاس کی شدت کی وجہ سے وہ کچھ نیایا کرنے کا جذبہ اپنے اندر محسوس ہی نہیں کر پاتے تھے۔ انہیں کہیں اور پردیس میں جا کر قسمت آزمائے کا خیال دھچکا ہی نہیں تھا۔ آبائی علاقوں سے چھٹے رہنا ان کی نظر میں حب الوطنی تھی۔ کہیں کہیں اور کبھی کبھی تو یہ حب الوطنی نام منطقی حدود عبور کر جاتی تھی۔ بعض علاقوں کے لوگ بڑے دریا کو پار کرنا بھی معیوب اور منحوس سمجھتے تھے۔ پدم، ہم چڑا اور میگھنا محض دریا نہ تھے بلکہ حد بندی کا کام بھی کرتے تھے۔ ان دریاؤں کے درمیانی علاقوں میں لوگ اپنی آبادیوں تک محدود رہا کرتے تھے اور کنوئیں کے مینڈک بن گئے۔ ان کی سوچ اس قدر محدود ہو گئی تھی کہ وہ اپنے ہی خیالات کو معیار سمجھنے لگے اور پریشانی زندگی سے متعلق اپنے ان تصورات کو قابل تقلید نظریات کا درجہ دینے لگے۔ ہنک چیر جی، راہندر ناتھ ٹیگور اور سرت چند چیر جی کو بنگالی ادب کی تین اعلیٰ ترین شخصیات قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریروں سے کہیں بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوئی کہ بنگال میں زندگی کا اعلیٰ معیار عام تھا یا علوم و فنون کی غیر معمولی ترقی کی کیفیت پائی جاتی تھی۔

میزبانی کا تصور یہ تھا کہ مہمان کو چاول اور دالیں دے دی جاتی تھیں، جنہیں وہ خود پکاتا تھا۔ اگر مہمان راضی ہوتا تو دودھ سے بنی خام شکل کی مٹھائیاں بھی پیش کر دی جاتی تھیں۔

بنگال کے لوگوں کا مسلمانوں سے پہلی بار واسطہ تیرہویں صدی عیسوی میں پڑاجب مسلمانوں نے اسے فتح کیا۔ بنگال کے رہنے والوں کی روایات اور مسلم فاتحین کی اقدار میں بہت واضح فرق تھا۔ مفتوح زمین کے لوگ اپنے ذات پات کے نظام اور ہزاروں سال پرانی دیگر روایات سے چھٹے رہے اور صدیوں تک حکومت کرنے والے فاتحین کی اقدار کو بے آسانی قبول نہ کر سکے۔ جس طبقے نے مسلم فاتحین سے رابطے بڑھائے انہیں پتا چلا کہ کھانا پکانے کا فن کیا ہوتا ہے اور کھانے کے معمولات میں موزوں تبدیلی سے کس طرح زندگی کا معیار بلند کیا جاسکتا

ظالم کی رات

کبھی دروازہ نہیں ہوتی

حسینؑ کی
قربانی میں کی

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

پیوند کاری ہونے لگی اور اسلامی ریاست کا مزاج تبدیل ہونے لگا ہے اور اسلامی مملکت کی بنیادی اقدار خطرے میں ہیں تو انھوں نے وہی کچھ کیا جو اسلامی تعلیم کا عین تقاضا ہے اور اپنی قربانی سے اس کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب ہزار تالیفوں سے بھی اس کو چھایا نہیں جاسکتا۔

دنیا میں کسی شخص سے بھی چاہے وہ بڑھا کھسا ہو یا اُن پڑھ شہری ہو یا دیہاتی، اگر یہ پوچھا جائے کہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت کون سی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جان ہے تو جہان ہے

امام حسینؑ کی زندگی میں مسلمان ریاست کی وسعتوں میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا، جنگی فتوحات نے مسلمانوں کے دن بچھیر دیے تھے، ہر جگہ دولت کی بہتات کھلی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سیدنا حسینؑ اس صورت حال پر فخر کرتے اور اللہ کا شکر بجالاتے لیکن انھوں نے جیسے ہی محسوس کیا کہ خلافت کے ادارے میں ملوکیت کی

سیدنا

۱۹۷۱ء کی خانہ جنگی کے دوران امریکی پریس، بالخصوص ٹائمز ویک جیسے جراند نے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ بنگالیوں نے بنگالیوں پر اپنی ثقافت مسلط کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر بنگالیوں سے مراد مسلم بنگالی ہیں تو یہ بات سراسر بے بنیاد ہے کیونکہ بنگال اور پاکستان کے دیگر علاقوں کی عمومی ثقافت میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ بنگالیوں کو کوئی نئی طرز زندگی اپنانے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی جانب سے اپنی جانے والی صنعتی یا عیسائی کے نتیجے میں جدید ترین سہولتوں کے ساتھ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو بھی نئی زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ کچی مٹی سے لیے ہوئے فرش کی جگہ ٹائلز لگنے لگی۔ بانس اور گھاس بھوس کے بجائے سینٹ اور دیگر جدید تعمیراتی سامان کا استعمال عام ہوا۔ تنکوں کی چٹائی کی جگہ لکڑی اور دھات کی بنی ہوئی میز اور کرسیوں نے لی۔

سڑکوں کی تعمیر، مواصلات کے دیگر ذرائع کی ترقی، سرمایہ کاری اور صنعتی اداروں کے قیام نے زندگی ڈھانچا بنی بدل دیا تھا۔ پرانے اطوار کو اپنانے کا رجحان دم توڑ رہا تھا اور مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) کی تنہائی ہو رہی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو غیر ملکیتوں سے رابطوں کا زیادہ موقع مل رہا تھا جن کے طور طریقے بہت مختلف تھے۔ لال منیر ہاٹ اور شائستہ نگر جیسے دور افتادہ مقامات پر ایئر پورٹس، چندرا گھونا میں پیمپل اور کھانا میں نیوز پرنٹنگ مل، صوبے بھر میں پت سن کی مختلف ملوں کے قیام اور ہری پور اور نیپال میں گیس کی دریافت سے ترقی کی نئی راہیں کھلیں اور تبدیلی کے عمل کی ابتدا بھی ہوئی۔

معیشت کو سہارا نہیں دے رہے تھے بلکہ اس علاقے سے منافع بٹور رہے تھے۔ نفرت پھیلانے والوں کا دعویٰ کہ ماضی میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب کسی بیرونی کی ضرورت نہ تھی اور یہ خطہ غیر معمولی خوشحالی سے ہمکنار تھا۔ اور یہ کہ غیر بنگالیوں یا غیر ملکیتوں نے آکر مشرقی بنگال کی خوشحالی کو ختم کیا، اس کے وسائل لوٹے اور اسے غربت اور پسماندگی کی دلدل میں ڈھکیل دیا۔ لوگوں کو روز رفتہ یہ سوچنے اور سمجھنے کی تحریک دی گئی کہ ان کی سرزمین زرخیز ہے اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہے اور یہ کہ اسے لوٹا گیا ہے۔ لوگوں کو جب بھی فرصت ملتی تھی وہ اصل مشکلات کے بارے میں دیگر زمینی حقائق کے حوالے سے بھی سوچا کرتے تھے مگر مجموعی طور پر انہیں ا قدر جذباتی کر دیا گیا کہ وہ اس تصور کو درست سمجھنے لگے کہ بھی ان کی سرزمین خوشحال تھی اور اسے لوٹ کر دیا اور پسماندہ بنا دیا گیا۔ ہندوستانیوں کی شہ پر سازش کرنے والوں نے لوگوں کو یہ باور کرا دیا کہ ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔

ہے۔ حکمران طبقے سے انہوں نے پیار اور انس کریم بنانے کا فن سیکھا اور کھانے کا شعور پایا۔ نئے معاشی مواقع پیدا ہونے سے معاشرے میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں اور بڑی تعداد میں غیر بنگالی مشرقی پاکستان میں آباد ہونے لگے تھے۔ جدید سہولتوں نے بہت سے پرانے اور روایتی طریقوں کو خیر باد کہنے کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ یہ تھیں وہ تبدیلیاں جن کے باعث بنگال میں طرز زندگی کو ”خطرہ“ لاحق تھا اور بنگالیوں کو طرح طرح کی تشویش میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔ یہ دراصل بنگالیوں کا احساس کمتری تھا۔ غیر بنگالیوں کے خلاف نفرت پروان چڑھنے لگی۔ مشرقی بنگال کو بڑے پیمانے پر سرمائے کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس اپنا سرمایہ نہیں تھا۔ غیر بنگالیوں کے پاس سرمایہ بھی تھا اور مہارت بھی مگر رفتہ رفتہ ان کے خلاف نفرت میں اضافہ کیا جا رہا تھا اور لوگ انہیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے خلاف نفرت کو مزید پروان چڑھانے کے لیے یہ جواز تراشا گیا کہ غیر بنگالی مشرقی بنگال کی

اور اگر جان نہیں تو جہان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ جہان یعنی دنیا میں بے شمار نعمتیں ہیں۔ مطعومات کی کمی سے نہ مشروبات کی، ملبوسات کا شمار ممکن ہے نہ باقی اسباب زندگی کا اور اس کے علاوہ موسموں کی نیرنگی، پھولوں کی خوشبو، دریاؤں کا زریں، آبشاروں کا گرنا، چشموں کا ابلنا، تودوں کا پگھلنا، گھٹنوں گھٹاؤں کا جھوم کر اٹھنا، پر بت پر چھائی ہوئی بادلوں کی چھاؤنی، چیزوں کے کڑے ہوئے جھنڈے، سرسوں کے پھولے ہوئے کھیت، مسکراتی ہوئی کشت زعفران، گندم کی روہیلی فصل۔ ایسی بے شمار نعمتیں اللہ نے انسان کے لیے پیدا کر رکھی ہیں لیکن ان سب کا تعلق حیات انسانی سے ہے۔ جب تک زندگی ہے تو ایک نعمت سے فائدہ اٹھانے کا امکان باقی ہے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر نعمت بیش بہا ہے لیکن زندگی ان سب سے بڑھ کر انمول ہے۔ اس لیے کوئی شخص بھی بھائی ہوش و حواس اپنا سر کھوانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس عقیدے کا آخر کیا حل ہے کہ جتنے پاکیزہ ترین لوگ اس دنیا میں آئے ہیں اور جن کی عظمتوں سے انسانیت کا نام روشن ہے۔ ان میں سے کوئی شخصیت گزری کہ جس نے کبھی زندگی سے پیار کیا ہو اور جس نے اپنا مقصد حیات محض زندہ رہنا قرار دیا ہو۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

حالات جدھر آدمی کو کھینچے پھرتے ہیں آدمی اُدھر کو چلتا ہے۔ یہ وہ حیوانی زندگی ہے کہ جو اللہ کی پسندیدہ شخصیتوں کی زندگی سے مختلف ہے۔ وہ زندگی کو اللہ کی نعمت سمجھ کر شکر ادا کرتے ہیں۔ وہ زندگی کو مقصد نہیں بلکہ مقصد حیات کی ادائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جب کہیں مقصد حیات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو مقصد حیات کو بچانے کے لیے زندگی کو قربان کرنا پڑے تو ایک لمحے کے لیے تامل نہیں کرتے۔ حضرت علیؓ پر جب قاتلانہ حملہ ہوا اور تلوار انہیں نیچے تک اتر گئی اور آپ نے محسوس کیا کہ اب بچنا مشکل ہے تو بے ساختہ آپ

کی زبان سے نکلا ”هزت برب الكعبة“ رت کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ جنگ موتہ میں یکے بعد دیگرے حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ زخموں سے گھائل ہو کر گرے تو ہر ایک کی زبان سے یہی جملہ لوگوں نے سنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقصد حیات کے مسافر اپنے سفر کو اس قدر دراز سمجھتے ہیں کہ جس کا ایک سرائیہ کے ساتھ وابستہ ہے تو دوسرا آخرت سے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ زندگی کا سفر راستے میں ختم ہو جاتا ہے اور یہ مسافر اپنے سفر پر آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر بجز اس کے اور کوئی ارمان نہیں ہوتا کہ یہ زندگی جو اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس دین کی سر بلندی کے کام آجائے جو اس سے بھی بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ جب اس کا موقع پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے اپنی کامیابی قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

اعلیٰ اقدار اور انسانیت کی بقاء کے لیے مقصد حیات جسے دوسرے لفظوں میں دین کہا جاتا ہے (اور دین درحقیقت تمام اچھائیوں، تمام حقائق اور تمام صداقتوں کا مجموعہ ہے) سب سے قیمتی چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے جتنے عظیم بندے دنیا میں آئے ہیں۔ چاہے وہ اللہ کے نبی و رسول ہوں یا چاہے اس کے راستے پر چلنے والے لوگ وہ ہمیشہ انسانیت کے سرمائے کی حفاظت اور انسانیت کی بقاء کے لیے ہمیشہ اس راز کو اپنی قربانیوں کے ذریعہ کشف کرتے آئے ہیں۔ سیدنا حسینؑ نے بھی یہی احسان امت مسلمہ پر کیا اور مسلمانوں پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ تمہارا اصل سرمایہ وہ ہے جو اس وقت خطرے میں ہے۔ اسے بچانے کے لیے اگر مجھے جان دینی پڑے یا میرے بچوں کو ذبح ہونا پڑے تو یہ کوئی بہت بڑی قیمت نہیں۔ کیونکہ میں اس جان سے گزر کر فوراً اس زندگی سے ہمکنار ہو جاؤں گا جس کو کبھی فنا نہیں اور میرے بچے بھی میرے لیے آخری نجات اور بلندی درجات کا سبب بنیں گے لیکن میرے جان دینے سے نوع انسانی کو جو فوائد پہنچیں گے اس کا کوئی بدل نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر سیدنا حسینؑ کا سر کاٹا گیا، آپ کا خون کربلا کی ریت

زندگی کا سب سے بڑی نعمت ہونا تو ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن زندگی کا قربان ہو جانا اور اسے زندگی سے بھی بڑی نعمت سمجھنا یہ تو ایک عجیب معما ہے جس کا سمجھنا آسان نہیں لیکن امر واقع یہ ہے کہ اللہ کے تمام نبی اور ان کے راستے پر چلنے والے تمام پاکیزہ لوگ جن میں سے ایک اہم فرد سیدنا حسینؑ ابن علیؑ بھی تھے۔ دنیا پر اسی حقیقت کو آشکار کرنے کے لیے آئے ہیں کہ انسان کی انسانیت اقدار انسانیت کے فروغ کا نام ہے۔ انسان بظاہر زندہ ہو لیکن اس کی انسانیت مر جائے تو اسے کوئی شخص زندہ نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار کرنا مشکل ہے۔ اس لیے وہ دنیا پر راز و اشکاف کرتے ہیں کہ تم نے اپنے آپ کو سود و دیاں کے جن پیانوں میں جکڑ رکھا ہے۔ دراصل یہ زندگی کا مقصد نہیں۔ اس لیے حقیقت یہ ہے۔

بزر از اندیشہ سود زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اصل جواب تو وہی ہے کہ دنیا دار العمل سے دارالجزا نہیں اور دوسرے جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو جب اپنی رحمتوں اور درجات سے نوازنا چاہتا ہے تو اسے قربانیوں کے عمل سے گزرتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے قیامت کے دن جب لوگ اپنی تکالیف اور مصائب کا اجر دیکھیں گے تو تمنا کریں گے کہ کاش ہماری کھال فقیحوں سے کاٹی گئی ہوئی تاکہ آج ہم پیش از پیش اس کا صلہ پاتے۔

یہ بھی امر واقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملے کو قیامت پر ہی نہیں چھوڑتا بعض مرتبہ زمین پر بھی اس کا نوٹس لیتا ہے۔ قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور قوم نوح پر اللہ کے عذاب اس لیے ٹوٹ پڑے تھے تاکہ لوگ بالکل اللہ کے خوف سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ اسی طرح ہم شہادت حسینؑ کے سلسلے میں دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے آپ پر مظالم کے پہاڑ توڑے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ پروردگار نے انھیں کھلی چھوٹ دے دی ہو۔ جس وقت حضرت حسینؑ پیاس سے مجبور ہو کر دریائے فرات پر پہنچے اور پانی پینا چاہتے تھے۔ اس وقت بد بخت حسین بن میر نے تاک کر آپ پر تیر چلایا جو آپ کے دہن مبارک پر لگا اور اس وقت آپ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ میں اس کا شکوہ آپ ہی سے کرتا ہوں۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ قتل حسینؑ میں شریک تھے۔ ان میں سے ایک بھی نہیں بچا جس کو آخرت سے پہلے دنیا میں سزا نہ ملی ہو۔ کوئی قتل کیا گیا، کسی کا چہرہ سخت سیاہ ہو گیا یا خ ہو گیا یا چند ہی روز میں سلطنت بچھن گئی اور ظاہر ہے کہ یہ ان اعمال کی اصلی سزا نہیں بلکہ اس کا ایک نمونہ ہے۔ جو لوگوں کی

میں جذب ہو گیا۔ بظاہر آپ کی زندگی ختم کر دی گئی اس سے جس معنوی زندگی کو دوام ملا اور حوصلوں کی جو فصل بار آور ہوئی اور اسلام کی بنیادی صداقتوں کو جو بے پناہ تائید و نصرت نصیب ہوئی اور خلافت کا تصور جس طرح دل و دماغ میں رائج ہوا اور ملوکیت جس طرح گالی بن کر رہ گئی۔ بظاہر کامیاب ہونے والے جس طرح ناکام ہوئے اور بظاہر مارے جانے والے جس طرح سرفراز ہوئے یہ صداقتوں کے وہ قیمتی ابواب ہیں جنھوں نے صدیوں کو زندگی کی حرارت بخشی۔

اللہ کا عام قانون یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے جرم کی سزا دنیا میں نہیں دیتا۔ قیامت کا دن درحقیقت دارالجزا اور یوم الدین ہے۔ اگر دنیا میں ہی ہر نیکی بدی پر جزا و سزا کا انحصار ہوتا تو پھر قیامت کے آنے کا کوئی جواز نہ تھا اور پھر انسان کا امتحان بھی شاید مکمل نہ ہوتا کیونکہ انسان کا اصل امتحان ایمان بالغیب میں ہے۔

سیدنا حسینؑ نواسہ رسول اللہ ﷺ ہونے کے اعتبار سے نہایت ہی عزت و حرمت کے مالک تھے۔ لیکن ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اور وہ بھی مسلمان کہلانے والے کے ہاتھوں، یہ ایک ایسا تکلیف دہ حادثہ ہے کہ جس کی یاد بھی دل کو دہلا دیتی ہے۔ لیکن سمجھی سمجھی انسان سوچنے لگتا ہے کہ پروردگار نے ان ہاتھوں کو مفلوج کیوں نہ کر دیا جو آپ کے گل کے لیے اٹھے تھے اور ان لوگوں پر زمین کیوں نہ پھٹ گئی۔ جنھوں نے آپ کی لاشوں کی بے حرمتی کی اور ان لوگوں پر آگ کیوں نہ برسی جنھوں نے آپ پر پانی بند کیا۔ اس کا

اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے جرم کی سزا دنیا میں نہیں دیتا۔ قیامت کا دن درحقیقت دارالجزاء اور یوم الدین ہے اگر دنیا میں ہی ہر نیکی بدی پر جزا و سزا کا انحصار ہوتا تو پھر قیامت کے آنے کا کوئی جواز نہ تھا

عبرت کے لیے دنیا کو دکھا دیا گیا۔ ابن جوزیؒ کی روایت ہے کہ ایک بوڑھا آدمی حضرت حسینؑ کے قتل میں شریک تھا۔ وہ دفعتاً نابینا ہو گیا۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آستین چڑھائے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں تلوار ہے اور آپ کے سامنے چڑے کا وہ فرش ہے جس پر کسی کو قتل کیا جاتا ہے اور اس پر قاتلان حسینؑ میں سے ۱۰ آدمیوں کی لاشیں ذبح کی ہوئی پڑی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے مجھے ڈانٹا اور خون حسینؑ کی ایک سلاخی میری آنکھوں میں لگا دی۔ میں صبح اٹھا تو اندھا تھا۔ جس شخص نے حضرت حسینؑ کو تیرا اور اپنی نہیں پیٹنے دیا، اس پر اللہ نے ایسی بیماری مسلط کر دی کہ کسی طرح پیاس بجھتی نہ تھی۔ پانی کتنا ہی پیا جائے پیاس سے تڑپتا رہتا تھا یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور مر گیا۔

شہادت حسینؑ ۵۵ سال بعد ۲۲ ہجری میں مختار ثقفی نے قاتلان حسینؑ سے قصاص لینے کا ارادہ ظاہر کیا تو عام مسلمان اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس نے اعلان عام کر دیا کہ قاتلان حسینؑ کے سوا سب کو امن دیا جاتا ہے۔ اس نے تلاش و تفتیش کے بعد ایک ایک قاتل کو گرفتار کیا۔ ایک دن میں ۲۲۸ آدمی اس جرم میں قتل کیے گئے۔ شرذبی الجوش

حضرت حسینؑ کے بارے میں سب سے زیادہ شقی اور بد بخت تھا۔ اس کو قتل کر کے لاش کتوں کے سامنے ڈال دی گئی۔ عبداللہ بن اسید جہنی، مالک بن بشیر، حمل بن مالک کا محاصرہ کر لیا تھا، انھوں نے رحم کی درخواست کی۔ مختار نے کہا ظالمو! تم نے سبط رسول ﷺ پر رحم نہ دکھایا تم پر کیسے رحم کیا جائے۔ سب کو ختم کیا گیا اور مالک بن بشیر نے حضرت حسینؑ کی ٹوپی اٹھائی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ، دونوں پیر قطع کر کے میدان میں ڈال دیا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ عثمان بن خالد اور بشیر بن شمیٹ نے مسلم بن عقیل کے قتل میں اعانت کی تھی۔ ان کو قتل کر کے جلا دیا گیا۔ عمرو بن سعد جو حضرت حسینؑ کے مقابلے میں لشکر کی کمان کر رہا تھا اس کو قتل کر کے اس کا سر مختار کے سامنے لایا گیا۔ سنان بن انس جس نے سر مبارک کاٹنے کا اقدام کیا تھا کوفہ سے بھاگ گیا۔ اس کا گھر منہدم کر دیا گیا۔ یہ انفرادی سزائیں درحقیقت اس عظیم جرم کی سزائیں ہیں یہ تو صرف یہ بتانا ہے کہ **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلِعَذَابُ الْآخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُو يَعْلَمُونَ** ایسا بھی ہوتا ہے عذاب۔ البتہ آخرت کا عذاب اس سے بڑا ہے کاش وہ سمجھ لیتے۔

عبدالملک بن عمیر لیشی کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ کے قصر امارت میں حضرت حسینؑ کا سر عبید اللہ بن زیاد کے سامنے ایک ڈھال پر رکھا ہوا دیکھا۔ پھر اسی قصر میں عبید اللہ بن زیاد کا کٹا ہوا سر مختار ثقفی کے سامنے دیکھا۔ پھر اسی قصر میں مختار کا سر کٹا ہوا مصعب بن زبیر کے سامنے دیکھا۔ میں نے یہ واقعہ عبدالملک سے ذکر کیا تو وہ اس قصر کو نخوس سمجھ کر یہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو گیا۔

ان عبرت انگیز واقعات پر غور کیجئے اور اندازہ لگائیے کہ ظلم کی رات بھی دراز نہیں ہوتی۔ مظلوم کا خون رنگ لائے بغیر نہیں رہتا۔ ظلم کے اثرات مٹ جاتے ہیں لیکن حق کی خاطر دی ہوئی قربانی وقت کے ساتھ ساتھ نمایاں اور جلیجلی ہوتی جاتی ہے۔ اس کے اثرات روز بروز پھیلنے چلے جاتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ لوگ اس قربانی کو ظلم بناتے ہیں اور اسلام کی سرفرازی کے دن شروع ہو جاتے ہیں لیکن اگر

ہماری قریبی تاریخ میں سراج الدولہ نے موت کو لبیک کہا اور میر جعفر نے اپنے لیے زندگی کا سرو سامان کیا لیکن آج تاریخ سے پوچھیے کہ تاریخ کے ایوان میں کس کا نام روشن ہے؟ اور کون مر گیا؟ انگریزوں کے مقابلے میں ایک کردار نظام حیدر آباد دکن اور کولکنڈہ کے محمد علی جاہ کا ہے اور دوسرا کردار سلطان ٹیپو کا۔ پہلے دونوں کرداروں نے اپنی اور اپنی حکومت کی زندگی بظاہر درازی اور سلطان ٹیپو بظاہر اپنے باپ حیدر علی کی مھنتوں پر بھی پانی پھیر گیا خود بھی قتل ہوا اور اپنی مملکت بھی انگریزوں کی غلام بنادی۔ لیکن آج تاریخ سے پوچھو کہ ہندوستان کی آزادی میں نظام حیدر آباد دکن کی زندگی کا نام آئی یا ٹیپو کا خون کام آیا۔ یہ کیوں تھا کہ جس کی شہادت نے غیرت و حبیت کا مفہوم واضح کیا اور وہ کون تھا جس نے آزادی کی قدر و قیمت کو دوچند کر دیا اور وہ کون تھا کہ جس نے گیدڑ کی زندگی اور شیر کی زندگی میں فرق واضح کیا۔ ٹیپو آج بھی ان صدائقوں کا امین ہے۔ اس کے مزار سے ان صدائقوں کی خوشبو آتی ہے۔ وہ آج بھی ان تمام لوگوں سے زیادہ زندہ ہے جو زندگی کو زندہ رکھنا چھتے ہیں۔ آج بھی ہم جب پاکستان کی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں جس طرح اس کی پشت پر سید احمد شہید اور ان کے خلفاء نظر آتے ہیں۔ اسی طرح سلطان ٹیپو بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہ عظیم اور بیش بہا سبق ہے جو ہم کو ان شہداء کی شہادت سے ملتا ہے اور یہ درس ہمیں زیادہ توانائی اور پاکیزگی کے ساتھ سیدنا حسین ابن علیؑ نے دیا تھا۔ اس لیے محمد علی جوہر نے کہا

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

بعد کے آنے والے اپنا رویہ نہ بدلیں اور بڑی سے بڑی قربانی سے بھی سبق سیکھنے کی زحمت نہ کریں تو پھر از سر نو ظالموں کو ان پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ آج امت مسلمہ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ایک عرصے سے شہداء کی قربانیوں سے سبق سیکھنے کے بجائے انھیں اپنے اپنے گروہ کی شہرت کا سامان بنا لیا ہے اور اسلام کی کھیتی روز بروز زبردستی چلی جا رہی ہے۔ وہ پروددگار جو ہمیشہ ظالموں سے سرا دلواتا ہے۔ اس نے ہماری بد اعمالیوں کے لیے وقت کے بدترین ظالم ہم پر مسلط کر دیے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تقدیر کے یہ فترت کب تک ہماری فصد کھولنے میں استعمال ہوتے رہیں گے۔ عافیت اسی میں ہے کہ ہم محرم کے پاکیزہ مہینے میں یہ سبق سیکھنے کی کوشش کریں کہ ہماری سر بلندی اعلائے کلمہ الحق اور اللہ کے

دین کی حفاظت کے لیے قربانی دینے میں مضمر ہے۔ ذوالحجہ کا مہینا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا مہینا اور محرم کا مہینا حضرت حسینؑ کی قربانی کا مہینا ہے۔ ایک سال کا آغاز ہے اور دوسرا اختتام۔ یہ دنیا کی عظیم قربانیاں یقیناً مسلمانوں کو کوئی سبق دے رہی ہیں۔ ظفر علی خان نے جو سمجھا تھا وہ میں آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی جو رہا تو نام حسینؑ کا جسے زندہ رکھتا ہے کربلا

اور اقبال داستان حرم کو اسی میں مختصر قرار دیتا ہے غریب و سادہ و زکین ہے داستان حرم ابتداء ہے اسماعیل اور نہایت اس کی حسینؑ

ڈاکٹر محمد اسلم سلمیٰ کی یہ تحریر ان کی زندگی کے مشن کا عنوان ہی چاہیے۔ وہ کئی دہائیاں پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ مساجد کے سربراہ رہے۔ ریٹیری ہوئے بعد بھی کلاس پڑھاتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً پچیس برس کی عمر میں ان کی طبیعت اور دین کا سلسلہ جاری ہے۔ بلند آہنگی سے بات کرنے والے مولانا کی گفتگو میں دلائل ایک خاص فطری ترتیب سے آپ کے دل سے باہر کرتے گئے ہیں۔

سابقہ کربلا

دل پہ چھائی اُداسی کی وجہ

اسلام کے نام لیا

ایک دوسرے کے گھروں کو کربلا بنانے پر کیوں تلے ہیں؟

معروف اہل قلم، شاعر و نثر نگاروں کا خراج تحسین

فیصل شہزاد

اس کا خون وہ خون ہے، جو اعجازِ شہادتِ حق ٹھہرا
محرمِ رمزِ رضا بھی وہی اور قبلۂ اہلِ رضا بھی وہی!

(عقارِ صدیقی)

حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کے جگر گوشہ جناب
امام حسینؑ حضور اکرم ﷺ کے نواسے تھے۔ آپ ﷺ کی
وفات کے وقت آپؑ کی عمر سات سال تھی۔ آپؑ کے
بڑے بھائی جناب حسنؑ تھے۔ ان دونوں بھائیوں سے
حضور اکرم ﷺ کو بے حد محبت تھی۔ چھوٹے ہوتے ان کو
کندھوں پر اٹھالیتے تھے۔ بعض اوقات نماز میں سجدہ کی
حالت میں یہ آپؑ کی سر یا گردن پر بیٹھ جاتے تو آپؑ
شفقت و محبت کی وجہ سے سجدہ لمبا کر دیتے۔

حضرت حسینؑ اپنے علم و فضل، تقویٰ و پرہیزگاری اور
شجاعت و بہادری میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔
خلفائے راشدین کے دور میں ہونے والے جہاد اور
فتوحاتِ شام، اردن اور عراق و ایران میں آپ کا بھی حصہ
ہے۔ اس کے بعد اپنے والدِ محترم جناب علیؑ کے ساتھ مل
کر اندرونی مخالفین کا مقابلہ بھی کرتے رہے۔ لیکن اس
دوران پورے اسلامی اخلاق و آداب کا پاس کیا۔

حضرت علیؑ اور حضرت حسنؑ کی خلافت کے بعد حضرت امیر
معاویہؓ اسلامی مملکت کے امیر بن گئے۔ ان سے امام حسینؑ
کا عزت و احترام کا معاملہ رہا لیکن وہ دنیا سے جاتے
ہوئے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر گئے۔ جس کی فوج نے
آپ کے نڈر لے کر پیش کش کے باوجود لڑائی مسلط کر
کے آپ کو خاندانِ سمیت میدانِ کربلا میں
۱۰ محرم ۶۱ ہجری کو شہید کر دیا۔

☆☆

حق کا ساتھ دینا ہے یا ظلم کے

سامنے سجدہ ریز ہونا ہے

ہماری روشن اور منور اسلامی تاریخ میں لاتعداد
معروف اور غیر معروف اکابرین کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں
نے اسلامی تعلیمات کے منافی کاموں پر جابرِ سلاطین کے
سامنے مسلسل کلمہ حق کہا اور جبر، دھوکے اور تحریص کے
ہتھکنڈوں کے سامنے ہتھیار پھینکنے کے بجائے اپنے موقف
پر ڈٹے رہے جس کے نتیجے میں انہیں بے پناہ تشدد کا نشانہ
بنایا گیا اور بعض صورتوں میں انہیں جان کا نذرانہ بھی پیش
کرنا پڑا۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے کہ جس نے طاقتور کے
سامنے کلمہ حق ادا کیا، اس نے کلمہ حق کہنے کا حق ادا کر دیا
اور سچ یہی ہے کہ ہمارے عظیم اکابرین نے اس ضمن میں
کبھی کسی مصلحت سے کام نہیں لیا! ہمارے اکابر علماء ملا
نہیں مجاہد تھے، ان پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ہماری
تاریخ ہمیں ”ملا“ کی اذال اور ”مجاہد کی اذال“ کا فرق
صاف صاف بتاتی ہے۔

ہم جب ماضی میں جھانکتے ہیں تو جہاں اپنے ماضی پر
فخر محسوس ہوتا ہے وہاں دل پر اداسی کی کیفیت بھی طاری
ہوتی ہے۔ دل پر چھا جانے والی اداسی کا سبب یہ ہے کہ
متذکرہ شہسوار میدانِ جنگ میں بیشتر صورتوں میں تنہا یا
گنتی کے چند ساتھیوں کے ہمراہ کھڑے نظر آتے ہیں۔
امام حسینؑ کے بے شمار ماننے والے خانوادہ
رسول ﷺ کو یزید یوں کے ہاتھوں ذبح ہوتے دیکھتے ہیں

اور دیواروں کے ساتھ لپٹ لپٹ کر رونے پر اکتفا کرتے
ہیں۔ اسی طرح زین العابدینؑ کے بیٹے حضرت زیدؑ کے
حواری ان کا ساتھ عین وقت پر چھوڑ دیتے ہیں، ان کے
ساتھ صرف ڈھائی سو جاں نثار رہ جاتے ہیں، حاکم وقت
کے اہلکار حضرت زیدؑ کی پیشانی پر تیر چلاتے ہیں اور
اسلامی تاریخ کے دامن پر ایک اور خون ناحق کا داغ لگ
جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؑ کی کمر پر اعلائے کلمتِ الحق کی
یاداش میں کوڑے برسائے جاتے ہیں اور اس کے خلاف
کوئی آواز نہیں اٹھتی، امام ابوحنیفہؒ کو جیل میں اذیتیں دی
جاتی ہیں اور کوئی گھروں سے باہر نہیں نکلتا، حضرت عبداللہ
بن زبیرؓ کی لاش تین دن تک شہر کے چوک میں لگی رہتی
ہے اور لوگ اس کے قریب سے آنکھ چرا کر گزر جاتے
ہیں، ملوکیت آنکھوں کو بے نور بنا دیتی ہے اور سروں میں
سے مغز نکال لیتی ہے، اس نظام میں احساسِ زیاں بہت
دیر بعد ہوتا ہے کافی عرصے کے بعد حضرت امام حسینؑ اور
ان کے خانوادہ کے ساتھ ہونے والے مظالم کے خلاف
جاں نثاروں کا ایک گروہ سامنے آتا ہے اور سارے حساب
چکا تا ہے۔ لیکن۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟
تاہم اعلائے کلمتِ الحق کے لیے اپنی جان پر کھیل
جانے والوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ظلم اور نا انصافی
کے خلاف ڈٹ جانے والے مرکز بھی زندہ رہتے ہیں اور
طاقت کے زور پر حق کی آواز دبانے والے اور ان کے
آکر کار بننے والے حتیٰ کہ شہر اور اس کے ملکیں، کو فدا کر دینے،
رہتی دنیا تک نفرت کی علامت بن جاتے ہیں۔ اتنی
صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی اپنے نظریے کے لیے
قربانیاں دینے والے، لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں
زندہ ہیں اور ان سے اسی طرح ہدایت اور روشنی لی جاتی
ہے جس طرح وہ ہمارے درمیان زندہ موجود ہیں۔ اس
کے برعکس ان مجاہدوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوششیں
کرنے والے جابر حکمرانوں کی قبروں کے نشانات بھی

موجود نہیں ہیں، تاریخ میں ان کا نام گالی بن چکا ہے اور
ان کا مقام، مقامِ عبرت کے سوا کچھ نہیں!
آج بھی یہ سوال وقتاً فوقتاً ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا
ہے کہ ہم نے حق کا ساتھ دینا ہے یا ظلم کے سامنے سجدہ
ریز ہو جانا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم نے اپنی آئندہ
تاریخ کے ابوابِ سنہری لفظوں سے رقم کروانے ہیں یا اس
ضمن میں نامہ اعمال کی سیانی سے ہی کام چلایا جائے گا؟
(علا الحق قاسمی)

☆☆

غازی اونچے مرتبے والے پاک نژاد شہید
ساتھ امام کے، رسم وفا کی دے گئے داد شہید
سب کچھ پاگئے اک لمحے میں نیک مہاد شہید
میرے واسطے چھوڑ گئے بس اک فریاد شہید
(ریاض احمد)

شہادتِ امام حسینؑ

دنیا میں انسانی عظمت و شہرت کے ساتھ حقیقت کا
توازن بہت کم قائم رہ سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو
شخصیتیں عظمت و تقدس اور قبولِ شہرت کی بلند یوں پر پہنچ
جاتی ہیں، دنیا عموماً تاریخ سے زیادہ افسانہ اور خیال کے
اندر انہیں ڈھونڈنا چاہتی ہے، اسی لیے فلسفہ تاریخ کے
بانی اول ابن خلدونؒ کو یہ قاعدہ بنانا پڑا کہ جو واقعہ دنیا میں جس
قدر زیادہ مقبول و مشہور ہوگا، اتنی ہی افسانہ سرائی اسے
اپنے اپنے حصارِ خیال میں لے لے گی۔ ایک مغربی شاعر
گوئے نے بھی حقیقت ایک دوسرے پیرایہ میں بیان کی
ہے۔ وہ کہتا ہے انسانی عظمت کی حقیقت کی انتہا یہ ہے کہ
افسانہ بن جائے۔ تاریخ اسلام میں حضرت امام حسینؑ کی
شخصیت جو اہمیت رکھتی ہے، محتاجِ بیان نہیں۔
خلفائے راشدینؓ کے عہد کے بعد جس واقعہ نے اسلام کی
دینی، سیاسی اور اجتماعی تاریخ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا
ہے، وہ ان کی شہادت کا عظیم سانحہ ہے۔ بغیر کسی مبالغہ
کے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے کسی المناک حادثہ پر نسل

انسانی کے اس قدر آنسو نہ بہے جس قدر اس حادثہ پر بہے ہیں۔ پچھلے کئی سو برسوں سے ہر محرم اس حادثہ کی یاد تازہ کرتا رہا۔ امام حسینؑ کے جسم خونچکاں سے دشت کربلا میں جس قدر خون بہا تھا، اس کے ایک ایک قطرے کے بدلے دنیا اشک ہائے ماتم و الم کا ایک ایک سیلاب بہا چکی ہے۔

(ابوالکلام آزاد)

☆☆

خلافت و ملوکیت کی ٹکڑ

حضرت امام حسینؑ نے ایک اصولی موقف پر اپنی جان کی بازی لگا دی اور بلاشبہ یہ انہی کو زیب دیتا تھا کہ ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین اور مسلمانوں کے اجتماعی مقصد کے لیے جان کی بازی لگائیں۔ شہادت امیر جزہؓ کو بھی ملی اور شہید حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ بھی ہوئے اور شہید تو خود حضرت حسینؑ کے والد بزرگوار حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور برادر بزرگ امام حسنؑ بھی ہوئے لیکن ہماری ملی تاریخ میں شہادت کا سرخ رنگ جس قدر حضرت حسینؑ کا کھڑا تاریخ کے ماتھے کا جھومر بن گیا ہے، اتنا نکھار شاید اور کسی شہادت کو میسر نہیں آیا ہے۔ یہ عظیم حادثہ دراصل خلافت و ملوکیت کی ٹکڑھی جس میں خلافت کے اصولوں کو چکنا چور کر دیا گیا اور وراثتی ملوکیت اور شخصی حکومت مسلمانوں پر غالب آگئی اور پھر آج تک امت نظام خلافت کے لیے ترس رہی ہے۔ سیدنا حضرت امام حسینؑ نے جو کچھ کیا وہ قیام ”حکومت الہیہ“ کے لیے کیا۔ مسلمان سے قرآن کا یہ پہلا مطالبہ ہے۔ قرآن نے خالص خدا پرستی کا جو سبق دیا ہے حضرت امام حسینؑ نے اس کی روح کو سمجھا اور بدرجہ اتم پورا کیا اس لیے آپ کی محبت یہ ہے کہ آپ کی اس سنت کو فراموش نہ کیا جائے اور جو کچھ آپ کے نام سے کیا جائے خدا پرستی کے لیے کیا جائے۔

☆☆

کرب و بلا کا حادثہ کائنات میں اپنی مثال آپ ہے، عالم شش جہات میں

سامحہ کربلا

بلاشبہ ۶۱ ہجری میں کربلا کے مقام پر جو واقعہ پیش آیا اس میں شامل افراد ربے کے اعتبار سے بہت عظیم اور قیمتی تھے اور اس واقعے میں انہوں نے جس کردار کا مظاہرہ کیا وہ ربی دنیا تک اہل حق کے لیے ایک روشن مثال رہے گا کہ امام عالی مقامؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کر کے جس رسم کا آغاز کیا تھا اس سے نہ صرف اسلامی تاریخ کے ایک روشن باب کا آغاز ہوا بلکہ اہل دنیا کو بھی آزادی رائے اور انسانی حقوق کا وہ سبق ملا جس کے باعث اہل یورپ نے سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں وہ راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے آج ہر طرف جمہوریت کا بول بالا ہے اور انسانی حقوق کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔

امام عالی مقامؑ تمام مسلمانوں کے لیے لائق عزت و احترام ہیں اور ان کی شہادت ہر کلمہ گو کے لیے راہ حق میں دی جانے والی سب سے بڑی قربانی ہے تو پھر ہم عقیدے کے نام پر مختلف جماعتوں میں بٹ کر جو ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں کیا یہ اس عظیم شخصیت کی بے مثال قربانی کی توہین کے مترادف نہیں! مولانا محمد علی جوہر نے تو کہا تھا کہ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد..... یہ کیسا اسلام ہے جس کے نام لیوا ایک دوسرے کے گھروں کو کربلا بنانے پر تے ہوئے ہیں!!

(امجد اسلام امجد)

☆☆

اے لوگو یہ حال تو دیکھو، دونوں جہاں کا امام اس کے سامنے صرف بہتر، باقی سپاہ شام نیزے، بھالے، تیرہمکانیں جھک جھک کریں سلام روچیں سچے مولیٰ ایسی جسم میں لالہ فام

(رباض احمد)

حضرت امام حسینؑ کی سنہری باتیں

خاور سائل

☆ خوشامد تیرے تکبر کا ختم ہے۔

☆ ذلیل وہ ہے جو بخیل ہے۔

☆ غرور کا سر ہمیشہ نیچے ہوتا ہے۔

☆ زبان کی حفاظت بہترین عبادت ہے۔

☆ جب پیسا بولتا ہے تو سچائی ختم ہو جاتی ہے۔

☆ ایمان کے لیے خرچ کرنا اسراف نہیں ہے۔

☆ اگر کسی کو خوشی نہیں دے سکتے تو غم بھی نہ دو۔

☆ ایماندار وہی ہے جو آخرت کے لیے توشہ جمع کرے۔

☆ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ والدین کی نافرمانی ہے۔

☆ جس شے کا وجود نہیں اُسے ہم اعتماد سے پیدا نہیں کر سکتے۔

☆ شکم سیری بیماری کی جڑ اور پرہیز سازی بیماری کا علاج ہے۔

☆ اس چیز کے پیچھے نہ بھاگو، جسے تم سمجھ نہیں سکتے یا پانہیں سکتے۔

☆ سردار بننا چاہتے ہو تو حرکت و عمل اور جدوجہد کو اپنا معمول بناؤ۔

☆ جو شخص ارادے کا پکا ہو وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔

☆ انسان کو بادل ہونا چاہیے جو پھولوں کے علاوہ کانٹوں پر بھی برستا ہے۔

☆ دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس سے غیرت آبرو کو برقرار رکھو۔

☆ جو لوگ تمہارے دوست بننا چاہتے ہیں اُن کے دوست بنو، عادل کہلاؤ گے۔

☆ ملامتِ خلق کا شکوہ نہ کر کہ ذاتِ حق بھی زبانِ خلق سے محفوظ و سلامت نہیں رہی ہے۔

☆ وہ سب رخصت ہو گئے جن سے محبت تھی اور اب میں ان لوگوں میں ہوں جو مجھے پسند نہیں۔

☆ دنیا میں سب سے کمزور وہ ہے جو اپنی خواہش پر قابو نہ رکھتا ہو۔ قوی وہ ہے جو ضبط کی قوت رکھتا ہے۔

رشتوں کا سب سے زیادہ لحاظ کرنے والے اور اہل و عیال کے ساتھ جڑ کر رہنے والے

حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب

ایک سخی کا قصہ دلپذیر
خدا کے رسولؐ بھی ان کی خوبیوں کا ذکر جیل فرماتے

ہلاکت

کے سال ”عام الرمادہ“ میں جب انسان و حیوان اور نباتات و بہادات سخت قحط کا شکار ہو گئے تو امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کھلی فضا میں مسلمانوں کے ساتھ نماز استسقا پڑھنے اور اللہ رحیم و کریم سے باران رحمت کے لیے گڑگڑا کر دعا کرنے کے لیے باہر نکلے۔ پھر حضرت عمرؓ ایک مقام پر کھڑے ہو گئے اور اپنے دائیں ہاتھ سے حضرت عباسؓ کا دایاں ہاتھ تھام کر آسمان کی طرف بلند کر کے دعا گو ہوئے:

”اے اللہ! پہلے ہم تیرے نبیؐ کی وساطت سے تجھ سے بارش کی دعا کرتے تھے اور اس وقت نبیؐ

ہمارے درمیان موجود تھے۔ اللہ! آج ہم تیرے نبیؐ کے چچا کی وساطت سے بارش طلب کرتے ہیں، اللہ! ہم پر بارش برسا!“ مسلمان ابھی یہاں سے مل نہیں پائے تھے کہ بارش آ گئی اور اس قدر برسی کے چروں پر تازی کی لہر دوڑا دی، ہر طرف پانی پانی کر دیا اور زمین کو سبز و شاداب کر ڈالا۔ صحابہؓ حضرت عباسؓ کے پاس گئے، ان سے بغل گیر ہونے لگے، ان کی پیشانی کے بوسے لینے لگے اور یہ کہتے ہوئے ان کو بابرکت قرار دینے لگے:

”اے (اہل) حرمین کی پیاس بجھانے والے شکر یہ!“

☆☆

حضرت عباسؓ جس قدر رسول اللہؐ سے محبت

رکھتے تھے رسول اللہؐ بھی اسی قدر ان کو عزت و اکرام دیتے تھے۔ آپؐ ان کی تعریف و ستائش کرتے اور ان کی خوبیوں کا ذکر جیل فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ فرماتے:

”یہ میرے باپ دادا کی نشانی ہیں۔“

”یہ عباسؓ بن عبدالمطلب ہیں قریش کے سب سے بڑے خنی اور رشتوں کا سب سے زیادہ لحاظ رکھنے والے۔“ جس طرح حضرت حمزہؓ رسول اللہؐ کے چچا بھی تھے اور ہم جولی بھی، اسی طرح حضرت عباسؓ آپؐ کے چچا بھی تھے اور ہم عربی بھی۔

رسول اللہؐ اور حضرت عباسؓ کی عمروں میں دو یا ۳ سال کا فرق ہے، حضرت عباسؓ رسول اللہؐ سے ۳۳ سال بڑے تھے۔ اس طرح رسول اللہؐ اور آپؐ کے چچا عباسؓ ایک ہی عمر کے بچے اور ایک ہی نسل کے جوان تھے۔ ایک اور چیز جس کو انسانیت کے پرکھنے میں نبیؐ کے نزدیک ہمیشہ اولین حیثیت حاصل رہی وہ حضرت عباسؓ کا اخلاق اور اچھی صفات تھیں۔

حضرت عباسؓ خنی تھے، بہت بڑے خنی..... گویا وہ ان اچھی خوبیوں کے بھی چچا ہی تھے۔ آپؐ رشتہ داروں اور اہل و عیال کے ساتھ جڑ کر رہنے والے انسان تھے۔ ان دونوں کے رشتوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں آپؐ اپنے مال و متاع یا سعی و جہد اور اثر و رسوخ میں سے کسی بھی اعتبار سے منحل نہیں کرتے تھے۔ آپؐ عام رشتہ داری اور خاندانی قربات داری کے معاملے میں حدود و دانشندی سے کام لیتے تھے۔ آپؓ کی اسی دانشمندی و ذہانت نے آپؓ کو قریش کے درمیان بلند مقام سے سرفراز کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ جب رسول اللہؐ نے دعوت کا برملا اظہار کیا تو حضرت عباسؓ اس قابل تھے کہ رسول اللہؐ کو پہنچائی جانے والی بہت سی تکلیفوں کو آپؓ سے رفع کر سکیں۔

☆☆

رسول اللہؐ کے خادم حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں: ”میں عباسؓ بن عبدالمطلب کا نوکر تھا اور اس وقت اسلام اس گھر کے افراد میں داخل ہو چکا تھا۔ عباسؓ

ایک اور چیز جس کو انسانیت کے پرکھنے میں نبیؐ کے نزدیک ہمیشہ اولین حیثیت حاصل رہی وہ حضرت عباسؓ کا اخلاق اور اچھی صفات تھیں

=====

مسلمان ہو گئے، ان کی بیوی ام فضل مسلمان ہو گئیں اور میں بھی مسلمان ہو گیا مگر عباسؓ اپنا اسلام چھپا کر رکھتے تھے۔“ حضرت ابورافعؓ کی یہ روایت غزوہ بدر سے قبل حضرت عباسؓ کے قبولیت اسلام کی وضاحت کرتی ہے۔ رہی بات ہجرت نبویؐ کے بعد مکہ میں ان کے ٹھہرے رہنے کی تو یہ ایک ایسی حکمت عملی تھی جس نے بہترین طریقے سے اپنے اہداف کو حاصل کیا۔

قریش حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے ارادوں میں شکوک و شبہات کو کب چھپا رہنے دے سکتے تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ جناب عباسؓ کے مقابل میں آنے کا بھی ان کے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ کیونکہ بظاہر ان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اسی دین اور طریقے پر تھے جس کو قریش پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ غزوہ بدر کا موقع آگیا اور قریش کو حضرت عباسؓ کے دل میں چھپے ارادوں کا امتحان لینے کا موقع مل گیا۔ جناب عباسؓ قریش کی اس مکر وہ تدبیر سے بھلا کاب لا علم رہنے والے تھے۔

آپؓ اگرچہ قریش کی حرکات و سکنات کی خبریں مدینہ میں رسول اللہؐ کو پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن قریش بھی عنقریب آئیں اس معرکہ میں شرکت کے لیے نکال باہر لانے میں کامیاب ٹھہرنے والے تھے جس معرکہ میں شرکت پر جناب عباسؓ ایمان رکھتے تھے نہ کوئی ارادہ۔ تاہم یہ جنگ جناب عباسؓ کے لیے ایک مقررہ

حضرت حمزہ قریش کے ظلم و عدوان اور ابوجہل کی درشتیوں کا علاج اپنی ”منا ڈالنے والی تلوار“ کے ذریعے کرتے تھے جبکہ حضرت عباسؓ اپنی ذہانت و ہوشیاری اور تدبر کو استعمال میں لاتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے اسلام کو اسی طرح نفع پہنچایا جس طرح دفاع کرنے والی تلواروں نے اسلام کی حمایت و حفاظت کا حق ادا کیا۔

متعین کامپانی تھی جو اہل قریش کے لیے ہی تباہی و بربادی لانے والی تھی۔

غزوہ بدر میں دونوں طاقتیں آمنے سامنے آتی ہیں اور تلواریں ہر گروہ اور فریق کے انجمام کا تعین کرتے ہوئے پوری خوفناکی کے ساتھ آپس میں ٹکرانے کے لیے تیار ہیں۔ رسول اللہؐ اپنے اصحاب کو مخاطب فرماتے ہیں: ”کچھ بنو ہاشم سے اور کچھ بنو ہاشم کے علاوہ لوگ مجبور کر کے نکالے گئے ہیں، انھیں ہمارے ساتھ لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، ان میں سے کسی کا سامنا تم میں سے کسی کے ساتھ ہو جائے تو وہ اسے قتل نہ کرے۔“

جو شخص ابولہب بن ہشام بن حارث بن اسد کو پائے وہ اسے قتل نہ کرے۔

اور جو عباس بن عبدالمطلب کو پالے وہ بھی ان کو قتل نہ کرے، ان کو قتل مجبور کر کے جنگ میں لایا گیا ہے۔“

رسول اللہؐ اس حکم کے ساتھ اپنے چچا عباسؓ کی کسی خوبی کو مخصوص نہیں کر رہے تھے، خوبیاں بیان کرنے کا یہ موقع تھا نہ وقت۔ اگر رسول اللہؐ کے نزدیک آپ کے چچا مشرکین میں سے ہوتے تو آپ ایسے نہ تھے کہ اپنے صحابہ کے سروں کو میدان جنگ میں متحرک دیکھتے اور پھر بھی اپنے چچا کے لیے سفارش کرتے..... اللہ اکبر رسول اللہؐ کے چچا ابوطالب جن کی آپ اور اسلام کے لیے بہت سی قربانیاں تھیں، رسول اللہؐ کو اس چچا کے لیے مغفرت کی دعا کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ عقل و شعور کا فیصلہ یہی ہے کہ ایسا رسول اللہؐ غزوہ بدر میں جائے تو اپنے مشرک آباء و اخوان کو قتل کرنے والوں سے کہے کہ میرے چچا کو قتل نہ کرنا۔

ہم اس گفتگو کا بیان وفد کے ارکان میں سے ہی ایک رکن پر چھوڑتے ہیں۔ یہ رکن وفد حضرت کعب بن مالکؓ ہیں، فرماتے ہیں:

”ہم کھانی کے اندر بیٹھے تھے، رسول اللہؐ کا انتظار کر رہے تھے یہاں تک کہ آپ ہمارے پاس آگئے اور آپ کے ساتھ عباس بن عبدالمطلب تھے۔ عباس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا ”اے خزع! تمہیں معلوم ہے کہ محمدؐ ہم میں سے ہیں اور ہم نے ان کو اپنی قوم سے اس طرح بچا کر رکھا ہے کہ وہ اپنی قوم میں ایک معزز و باوقار حیثیت رکھتے ہیں اور علاقے میں محفوظ بھی ہیں لیکن وہ یہ سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس آ رہے ہیں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ جس چیز کی طرف تم نے انھیں بلایا ہے اس سے وفاداری کرو گے اور انھیں ہر اس شخص سے بچا لو گے جو ان کی مخالفت کرے گا تو پھر تم جو کر رہے ہو خوشی سے کرو۔“

اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تم ان کو اپنے پاس لے جا کر بے یار و مددگار چھوڑ دو گے اور انھیں رسوا کرو گے تو پھر ابھی سے پیچھے ہٹ جاؤ اور انھیں نہ لے جاؤ۔“

جناب عباسؓ اپنے یہ کاٹ دار اور فیصلہ کن الفاظ کہہ رہے تھے تو ان کی آنکھیں انصار کے چہروں پر گر گئی تھیں۔ آپ اپنی باتوں کے جواب اور ان کے فوری رد عمل کا انتظار کر رہے تھے۔

حضرت عباسؓ کی عظیم ذہانت عملی ذہانت ہونے کی بنا پر مادی میدان میں حقیقت کا احاطہ کر لیتی تھی، وہ ایک باخبر نگران اور تفتیش کار کی طرح دور دور تک حقیقت کا پیچھا کرتے تھے، لہذا آپؓ نے اسی گفتگو پر اکتفا نہ کیا بلکہ انصار سے ایک اہم سوال کر کے بات کو نئے سرے سے شروع کیا ”مجھے بتاؤ کہ تم اپنے دشمن سے کس طرح جنگ کرتے ہو؟“

حضرت عباسؓ اپنی ذہانت اور قریش کے ساتھ اپنے تجربے کی بنا پر یہ جانتے تھے کہ اسلام اور مشرک کے درمیان جنگ ناگزیر ہے، کیونکہ قریش بھی اپنے عناد،

آپ ﷺ سے پوچھا گیا
آپ کو اللہ تعالیٰ نے
فتح عظیم سے سرفراز فرمایا
ہے پھر کیوں سو نہیں سکے؟
تو آپ ﷺ نے جواب دیا
”مجھے بیڑیوں میں جکڑے
عباسؓ کی کراہیں سنائی
دے رہی تھیں“

=====

سرداری اور دین کو چھوڑ نہیں سکتے اور اسلام جو ہمیشہ حق ہوتا ہے وہ کبھی باطل کے لیے اپنے قانونی حقوق سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ تو کیا انصار جو اہل مدینہ ہیں، مستقبل میں پیش آنے والی اس جنگ کے تحمل ہو سکیں گے؟ اور کیا وہ کڑ و فر اور جنگ کے ماہر قریش کے تکنیکی اعتبار سے ہم پلہ ہو سکتے ہیں؟ یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے انصار سے مذکورہ سوال کیا۔

انصار بھی وہ لوگ تھے جو جناب عباسؓ کی گفتگو پر ہمدرد گوش تھے گویا وہ انسانی چٹائیں ہوں۔ حضرت عباسؓ اپنی گفتگو سے فارغ ہوئے تو انصار نے بات شروع کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام نے جناب عباسؓ کے مذکورہ سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

”ہم..... اللہ کی قسم..... اہل حرب ہیں، ہمیں جنگ کی غذا دی گئی ہے، اس کا عادی بنایا گیا ہے اور اپنے آباء سے نسل در نسل ہمیں یہ وراثت میں ملی ہے۔“

ہم تیمروں کے ذریعے تیر اندازی کرتے ہیں یہاں تک کہ تیر ختم ہو جاتے ہیں۔

پھر ہم تیمروں کے ذریعے نیزہ زنی کرتے ہیں، یہاں تک کہ نیزے ٹوٹ گرتے ہیں۔

برپا کرنا ملے کر لیا۔

”اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوہ حنین کے روز (اس کی دشگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا۔ مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول ﷺ پر اور موتین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔“ (التوبہ: ۲۵، ۲۶)

اس روز حضرت عباسؓ کی آواز اور ثابت قدمی سکینت و بہادری کے نمایاں ترین مظاہر میں سے ایک مظہر تھا۔ ہوا یوں کہ مسلمان اپنے دشمن کی آمد کے انتظار میں تہامہ کی ایک وادی میں جمع ہونے والے تھے کہ مشرکین ان سے پہلے ہی وادی میں پہنچ گئے اور وادی کے نشیب و فراز میں گھاتیں لگا کر بیٹھ گئے اور اچانک مسلمانوں پر بھرپور حملہ کیا اور انھیں اس قدر خوفزدگی کے عالم میں دور تک مار بھجایا کہ کوئی مسلمان پیچھے مڑ کر دوسرے مسلمان کو نہیں دیکھتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اچانک حملہ آور ہونے والے دشمن کی یہ کارروائی دیکھی تو فوراً اپنے سفید خنجر پر سوار ہوئے اور باواز بلند پکارنے لگے:

”لوگو بھاگ کر کہاں جا رہے ہو؟ میری طرف واپس آجاؤ۔ یہ ہرگز جھوٹ نہیں کہ میں نبی ہوں، میں عبدالمطلب کا پوتا ہوں۔“

اس لمحے نبی ﷺ کے اردگرد ابو بکرؓ، عمرؓ، علیؓ بن ابوطالبؓ، عباسؓ بن عبدالمطلبؓ، عباسؓ کے بیٹے فضلؓ، جعفرؓ ابی طالبؓ، ربیعہؓ بن حارثؓ، اسامہؓ بن زیدؓ، ایمنؓ بن عیید اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی تھوڑی سی نفری موجود تھی۔

اس موقع پر یہاں ایک خاتون تھیں، جنھوں نے اپنی شجاعت و بسالت سے بہادریوں کے درمیان بلند مقام پایا۔ یہ خاتون ”ام سلمہ بنت مہان“ رضی اللہ عنہا تھیں۔

یہاں لفظ ”قبائل“ سے ان جنگوں کی کیفیت کے بارے میں دھوکا نہیں کھانا چاہیے جن میں رسول اللہ ﷺ ساری زندگی مشغول رہے کہ یہ تو بس چھوٹے چھوٹے پہاڑی قبیلوں کی جھڑپیں تھیں، کوئی بڑی جنگیں نہ تھیں جو یہ قبائل اپنے قلعوں میں لڑتے تھے۔

یہ قبائل شدید ترین جنگجوؤں کی بے شمار صفوں کی صورت میں جمع ہو گئے۔ مسلمان ۱۲ ہزار کی تعداد میں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلے۔

۱۲ ہزار.....؟ کن لوگوں میں سے ۱۲ ہزار.....؟ ان لوگوں میں سے جنھوں نے ابھی کل ہی مکہ فتح کیا تھا اور بت اور بت پرستی کو اس کی آخری اور بدترین جگہ پر پہنچا دیا تھا، ان شکور کشاؤں کے پرچم آسمان کے افق پر اس طرح بلند ہو رہے تھے کہ ان کے سامنے کوئی قوت مزاحمت نہ کر رہی تھی۔

یہ سوچ کچھ غرور پیدا کر دیتی ہے اور مسلمان شر کے آخری پھیر میں آجاتے ہیں۔ اس سوچ کی وجہ سے وہ غرور تکبر کا شکار ہو گئے جو ان کی کثرت تعداد اور مکہ کی فتح نے پیدا کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ کہہ دیا ”اب ہم قلت تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔“

جب آسمان انھیں جنگ سے بڑے اور اعلیٰ مقاصد کے لیے تیار کر رہا تھا، اس وقت ان کا اپنی عسکری قوت اور جنگی فتح کے غرے میں آجانا ایک نامناسب عمل تھا جس سے انھیں جس قدر جلد ممکن ہو سکتا نجات دلانا ضروری تھا خواہ یہ نجات صدمہ پہنچا کر دلائی جائے۔

یہ صدمہ شافیہ لڑائی کے آغاز میں بہت بڑی شکست کی صورت میں رونما ہوا۔ یہاں تک کہ مسلمان اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے اور آپس کے دامنوں کو چھوڑ کر اللہ کے دامن سے چپٹ گئے، اپنی قوت پر بھروسے کو چھوڑ کر اللہ کی قوت پر توکل کرنے لگے۔ تب جا کر یہ شکست فتح میں بدلی اور مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

رسول اللہ ﷺ اپنے چچا عباسؓ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جس روز غزوہ بدر اپنے انجام کو پہنچا اور آپ کے بچانے حالت اسیری میں رات گزاری تو آپ رات بھر سو نہ سکے۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے فتح عظیم سے سرفراز فرمایا ہے پھر کیوں سو نہیں سکے؟ تو آپ نے جواب دیا:

”مجھے بیڑیوں میں جڑے عباسؓ کی گراہیں سنائی دے رہی تھیں۔“ کسی مسلمان نے آپ کے یہ الفاظ سنے تو فوراً قیدیوں میں جا کر حضرت عباسؓ کی مشکیں ڈھیلی کر دیں اور آکر خبر دی کہ: یا رسول اللہ ﷺ میں نے عباسؓ کی بیڑیاں کچھ ڈھیلی کر دی ہیں۔

لیکن صرف ایک عباسؓ کی ہی بیڑیاں کیوں ڈھیلی کی گئی ہیں۔ آپ نے اپنے صحابی کو حکم دیا ”جاؤ اور تمام قیدیوں کے ساتھ یہ نری کر دو۔“ جب قیدیوں سے فدیہ لینا پتہ ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا سے فرمایا ”عباسؓ! اپنا، اپنے بھائی کے بیٹے عقیل بن ابی طالب کا، نوفل بن حارث کا، بنی حارث بن فہر کے بھائی اور اپنے حلیف عتبہ بن عمرو کا فدیہ ادا کرو، تم مالدار ہو۔“ حضرت عباسؓ کا ارادہ تھا کہ بغیر فدیہ کے ہی اپنی قید ختم کرا لوں، لہذا آپ سے عرض کیا: ”یا رسول اللہ ﷺ میں تو مسلمان ہوں، میری قوم مجھے مجبور کر کے لے آئی!“

لیکن رسول اللہ ﷺ نے فدیہ لینے پر اصرار کیا، اس موقع پر قرآن مجید بھی نازل ہوا جو حضرت عباسؓ کے دل کی کیفیت پر ایک مبلغ تہرہ بھی ہے اور خوشخبری بھی:

”اے نبیؐ، تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہاری خطا میں معاف کر دے گا، اللہ درگزر کرنے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔“

اس طرح حضرت عباسؓ نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا فدیہ دیا اور مکہ کی راہ لی۔ اس کے بعد قریش انہیں ان کی عقل و دانش اور دین و ہدایت کے معاملے میں دھوکا نہ دے سکے۔

آپؐ نے اپنا مال و متاع اکٹھا کیا اور خیبر کے مقام پر رسول اللہ ﷺ سے جا ملے تاکہ قافلۂ اسلام میں شریک ہو سکیں۔ اس طرح آپؐ مسلمانوں کی طرف سے عظیم اکرام و محبت کا مرکز قرار پائے کیونکہ مسلمان رسول اللہ کی ان کے ساتھ محبت و تکریم اور آپؐ کے فرمان سے بخوبی آگاہ تھے کہ آپؐ نے فرمایا ہے:

”لوگو! من لو کہ عباسؓ میرے لیے باپ کی جگہ ہیں، جس نے عباسؓ کو تکلیف دی گویا اس نے مجھے دی۔“

حضرت عباسؓ کو اللہ نے بڑی بابرکت والا دکان باپ بنایا، خبر امت حضرت عبداللہؓ آپؐ کے بیٹوں میں سے ایک ہیں۔

تاریخی اور عظیم گفتگو ہوئی۔

☆☆

ہجرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آشوب برس یعنی اس وقت جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو اپنے دین اور رسول ﷺ کے لیے فتح کر دیا تھا۔ جزیرہ عرب کے بعض سردار قسم کے قبائل پر یہ گراں گزرا کہ ایک بالکل نیا دین اس تیزی کے ساتھ اس قدر بڑی فتح حاصل کر لے۔ لہذا ہوازن، ثقیف، نضر، جشم اور دوسرے قبائل اکٹھے ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ

پھر ہم تلواریں لے کر نکلتے ہیں اور تلوار زنی کرتے ہیں یہاں تک کہ ہم میں سے جو پہلے موت کے منہ میں جانے والا ہوتا ہے وہ موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے یا پھر ہمارا دشمن موت کا شکار ہو جاتا ہے۔“

حضرت عباسؓ نے خوش ہو کر جواب دیا ”پھر تو تم اہل حرب ہو، کیا تمہارے پاس زر ہیں بھی ہیں؟“ انصار نے جواب دیا ”ہاں..... ہمارے پاس پورے جسم کو ڈھانکنے والی زر ہیں۔“

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور انصار کے درمیان

رسول اللہؐ نے اپنے چچا سے فرمایا
 ”عباسؓ! اپنا، اپنے بھائی کے
 بیٹے عقیل بن ابی طالب کا،
 نوفل بن حارث کا، بنی حارث
 بن فہر کے بھائی اور اپنے حلیف
 عتبہ بن عمرو کا فدیہ ادا کرو
 تم مالدار ہو“

=====

انھوں نے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑتے دیکھے تو فوراً اپنے
 خاوند ابوطالبؓ کے اونٹ پر سوار ہوئیں اور اسے بھگاتے
 ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آ گئیں۔ ان دنوں یہ عظیم
 خاتون اپنے رحم میں کسی خوش نصیب کی پرورش کر رہی
 تھیں۔ اونٹ کے بھاگنے کی وجہ سے بچے نے رحم کے اندر
 حرکت کی تو انھوں نے اپنی چادر اتار کر مضبوطی سے پیٹ
 پر باندھ لی اور ہاتھ میں منجر لہراتے ہوئے جب خدمت
 رسول ﷺ میں پہنچیں تو آپؐ مسکرا دیے پھر فرمایا ”ام سلمہ
 ہے؟“ انھوں نے جواب دیا ”ہاں.....“ یا رسول اللہ ﷺ
 آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں! ان لوگوں کو قتل کر
 ڈالیے جو آپؐ کو چھو کر بھاگ رہے ہیں، جس طرح آپؐ
 ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو آپؐ کے ساتھ جنگ کر رہے
 ہوں۔ یہ اسی لائق ہیں۔“

چہرہ رسالت پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ام سلمہؓ سے
 فرمایا ”اے ام سلمہؓ ان کے لیے اللہ ہی کافی ہے اور وہ جو
 کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔“

اس موقع پر جبکہ رسول اللہ ﷺ ایسے سخت حالات
 میں تھے حضرت عباسؓ آپؐ کے پہلو بلکہ آپؐ کے قدموں
 میں کھڑے آپؐ کے خچر کی لگام پکڑے موت اور خطرے کو
 مقابلے کا چیلنج کر رہے تھے! رسول اللہ ﷺ نے آپؐ کو حکم

دیا کہ لوگوں کو بلند آواز سے بلاؤ۔ چونکہ حضرت عباسؓ
 بھاری جسم کے آدمی ہی نہ تھے بلکہ بلند آہنگ بھی تھے۔
 آپؓ نے لوگوں کو بلانا شروع کیا ”اے انصار! اے
 بیعت والو۔“

یہ آواز جو نبی اچانک حملہ سے بھاگ اٹھنے والے اور
 وادی میں ادھر ادھر منتشر ہو جانے والے لوگوں کے کانوں
 سے ٹکرائی تو ان سب نے بیک آواز جواب دیا ”ہم حاضر
 ہیں..... ہم حاضر ہیں۔“

یہ سارے لوگ آندھی کے مانند تیزی سے واپس
 آئے یہاں تک کہ اگر کسی کا اونٹ یا گھوڑا اڑ گیا تو وہ
 اسے وہیں چھوڑ کر اپنے تیر کمان اور زرہ اٹھائے پیدل
 ہی اس طرف بھاگنا شروع ہو گیا جہاں سے جناب عباسؓ
 کی آواز آرہی تھی۔

اب معرکہ نئے سرے سے اپنی سختی اور خوفناکی کے
 ساتھ شروع ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے آواز بلند فرمائی
 ”میدان اب گرم ہوا ہے۔“

میدان گرم ہوا تو ہوا زن وثقیف کے جنگجو ڈھیر
 ہوئے، اللہ کا لشکر لات کے جتھوں پر غالب آیا اور
 اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور مومنوں پر اپنی سکینت
 نازل فرمائی۔

☆☆

۱۴/رجب بروز جمعہ ۳۲ ہجری کو مدینہ کے باشندوں
 نے کسی اعلان کرنے والے کو یہ اعلان کرتے سنا کہ ”اللہ
 اس شخص پر رحم فرمائے جس نے عباسؓ بن عبدالمطلب کو دیکھ لیا“
 لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ حضرت عباسؓ وفات پا گئے
 ہیں۔ جناب عباسؓ کے جنازے میں اس قدر عظیم تعداد
 میں لوگ نکلے کہ مدینہ نے اس سے پہلے اس کا مشاہدہ نہ
 کیا تھا۔ خلیفہ مسلمین حضرت عثمانؓ نے آپؓ کی نماز جنازہ
 پڑھائی۔ مدینے کے قبرستان بقیع میں ابوالفضل جناب
 عباسؓ بن عبدالمطلب کا جسد محو استراحت ہے۔ آپؓ ان
 نیک لوگوں کے ساتھ محو خواب ہیں جنھوں نے اللہ سے
 کیے ہوئے اپنے عہد کو پورا کیا۔

اس تک پہنچنے میں دو ماہ لگے۔ یہ ایک حیرت انگیز آدمی سے ملاقات تھی۔ کسی افسانوی کردار دالیم (ڈھاکا کا اثار) جیسی انوکھی اور یادگار۔ ڈھاکا کا میجر شریف الحق دالیم معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے دادا اور نانا ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس میں شریک تھے۔ وہ دسویں میں تھا تو اپنی بہادری اور جارج طبیعت کی وجہ سے ڈھاکا کے سائیکل رکشا چلانے والوں کا صدر بن چکا تھا۔

دالیم نے ۱۹۶۳ء میں پاکستان ایئر فورس میں شمولیت اختیار کر لی اور رسالپور اکیڈمی سے پائلٹ بن کر نکلا۔ ۶۵ء کی جنگ میں اپنے ساتھی شاہینوں سے سرمنی عقاب کا خطاب پایا۔ ۶۵ء کی جنگ کے بعد طبی بنیادوں پر اس کے پاس گراؤنڈ ہونے کا بھی آپشن تھا مگر اس نے پاک آرمی کو اپنے خوابوں کا مرکز بنالیا۔

۱۹۶۶ء کو اپنے لڑاکا جہاز کے کاک پٹ سے نکلا اور پاکستان ملٹری اکیڈمی کے کیدیوں میں جا کھڑا ہوا۔ وہاں گزرے شب و روز نے اس کو اکیڈمی کے نمایاں افسروں میں شامل کر دیا۔ اس کے بیچ کے ۲۲ لڑکے جنرل کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچے۔ سندر بن کے رائٹ ٹائیگر کی سی چستی اور پارے جیسی سیب صفت شخصیت کا مالک دالیم دوست بنانے اور دوستی نبھانے میں بہت مشہور تھا۔

کاکول کے خوبصورت گراؤنڈ میں وہ آخری ہانکا بنگالی بٹالین سارجنٹ تھا۔ زیر تربیت کیدیوں کو صلاحیت کی بنیاد پر ملے عہدوں میں بٹالین سارجنٹ میجر تیسرا بڑا عہدہ تھا جو اس کی پہچان بنا۔ برفانی بھیڑیے کی سی خوب لے وہ اپنے گروپ کے لڑکوں کے لیے کسی سے بھی بھڑکتا تھا۔

اس کے دوست اسے ناقابل شکست اور پاکسٹنگ رنگ کا محمد علی اور اسکے ستارے ہوئے اسے پی ایم اے کا جگا، ڈھاکا کا بد معاش ”ٹیلا دی ہن“ کہتے لیکن ایک بات پر سبھی متفق ہیں کہ جنرل بیٹی خاں اور اس کے ۳۳ رکنی فوجی ٹولے..... جنرل پیر زادہ، میجر جنرل رحیم اور میجر جنرل کریم نے ڈھاکا

کی سرزمین پر جنرل مکا خاں کی سربراہی میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات بندوق اور ٹینک کے ذریعے عوامی سیاسی تحریک کو کچلنے کے لیے فوجی اکیشن کا سہارا لیا ہوتا اور وہ رات اپنے ہی بنگالی فوجیوں اور سولین کے خون سے سیاہ تر نہ ہو گئی ہوتی اور میجر شریف الحق دالیم اپنے ۲ ساتھیوں سمیت کونڈہ گیریشن سے ۱۳ اپریل ۱۹۷۱ء کی شب روانہ ہو کر بہاولنگر سے سرحد پار کر کے ہندوستان نہ چلا جاتا تو یقیناً ۳۸ روپے پی ایم اے کے جرنیلوں میں سے ایک ہوتا۔

وہ زندگی بھر کسی نہ کسی مشن سے وابستہ رہا۔ اس کے اندر کی سیما ہستی نے اسے کبھی چین سے نہ بیٹھے دیا۔ کلکتہ کے عجیب مگر میں قائم بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کے صدر، وزیراعظم اور ملتی ہائی کے کمانڈر ان چیف کرنل عثمانی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا کیونکہ وہ سبھی اسے کسی نہ کسی حوالے سے جانتے اور عزیز رکھتے تھے۔

اس نے فرار میں شریک اپنے ساتھی لیفٹیننٹ نور کو کرنل عثمانی کے ملٹری سیکرٹری کے طور پر چھوڑا اور خود تیسری بنگال رجمنٹ کے لیفٹیننٹ مطیع الرحمن موتی کے ساتھ آگ اور بارود سے ڈھکی سرحد پار کر گیا۔ ملتی ہائی اور بنگلہ لبریشن آرمی کا انچارج بھارتی جرنیل اوبان سنگھ چندری ملاقاتوں میں اس کی صلاحیتوں اور عسکری و سیاسی امور پر گرفت کا قائل ہو گیا تھا۔ اس نے اسے پیشکش کی کہ مشرقی کمان کے جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کے فورٹ ولیم ہیڈ کوارٹر کے زیر سایہ عہدی پرواز کے لیے وہ پاکستان آرمی کے باغی دستوں پر مشتمل ایک الگ فوج تشکیل دے جو انڈین کمان کے زیرِ تحرت ہو اور انڈیا بنگلہ دیش کی دوستی اور یک جہتی کے کام آئے۔ اس کا یونینام بھارتی فوج جیسا ہو اور اسے یہیں سے کمانڈ کیا جائے۔ بھارتی عزائم کا یہ رخ دیکھ کر وہ پوری جرأت سے کرنل عثمانی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے انکار کے بعد یہ فورس عوامی لیگی قادر صدیقی کو سونپی گئی اور آنے والے برسوں میں اس فورس نے بدنامی اور ظلم میں سب کو مات کر دیا۔

مشرقِ بازو میں اسے ملتی ہائی کا گوریل ایدوا نذر مقرر کیا گیا۔ پاک فوج کے خلاف جاری اس جنوبی جنگ میں جو

بچالیوں کے ناموس اور آزادی کی پری کے لیے لڑی جا رہی تھی، اس نے گوریل دستوں سے وہ رشتہ استوار کیے جو بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد بھی اس کی قوت، طاقت اور ہمت بنے۔

جنگ آزادی کے دوران زخمی ہونے کے بعد اس نے کلکتہ میں ہجرت کر کے آئی ایک لڑکی نئی سے ڈرامائی طور پر شادی کر کے عبوری حکومت کے ہیڈ کوارٹر میں سراسنگی پھیلادی۔

بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد وہ بنگلہ بندو شیخ عجیب الرحمن کے قریب تھا مگر وہ کھوکھلے غرور کا قیدی جبر و تشدد کے قہیدے پڑھنے والوں، سیاسی ٹھکوں مفاد پرستوں اور لیبروں کے ہجوم میں گھرا وزیراعظم عوام سے کٹ چکا تھا۔ اسے نہ اپنے عوام کے دکھوں کا احساس تھا نہ ملک میں پھیلی انارکی اور ظلم سے زیادہ بھوک کا حتیٰ کہ جس نے ۵۰ ہزار سے زیادہ قحط کی ماری خواتین کو پہننے کا لباس تک اپنی خوراک کے لیے چھینا پڑا تھا۔ انجمن مفید الاسلام کے ڈاکٹر عبدالحمید نے بدانتظامی کا ذکر کرتے ہوئے ایک روز اس سے کہا تھا ”ہم عام طور پر ڈھاکا سے روزانہ ۲ درجن قحط کے مارے مردہ لوگوں کی لاشیں اٹھاتے تھے۔ اب یہ تعداد ۶۰۰ روزانہ تک پہنچ چکی ہے۔ قحط زدہ لوگوں کی امداد، خوراک اور سامان تک عوامی لیگ کے لیڈروں کے گھروں میں پہنچ گیا۔ یہاں تک کہا جانے لگا کہ شیخ عجیب کے حصے کا مبل بھی ان تک نہ پہنچے گا۔

ملتی ہائی (فوج آزادی) کے متوازی کھڑی کی گئی عجیب ہائی، راہی ہائی، لال ہائی، نیل ہائی، قادر ہائی جیسے منگول لشکر کی لوٹ مار ملک کو تہ و بالا کر چکی تھی۔ بھارتی فوج کی لوٹ مار آگ سے تھی۔ بقول مولانا بھاشانی وہ ۱۶ ہزار کروڑ ڈالر مالیت کا ساز و سامان اور فیکٹریاں لوٹ کر لے جا چکی تھی۔ بنگالیوں کو پاکستان سے آزادی بہت مہنگی پڑی تھی۔ پاکستانی حکومت صرف آمریت تھی اب فسطائیت کا دور دورہ تھا۔ نہ زندگی محفوظ رہی نہ عزت و آبرو، یہ ساری باہنیاں شتر بے مہار بنی، ہر چھوٹے بڑے شہر میں دندناتی پھرتی تھیں۔ عوامی لیگ کے مخالف مردوزن کو اٹھاتی، تشدد کرتی اور مار دیتیں۔ اس دوران خود دالیم پر ۳ بار جان لیوا حملہ ہو چکا تھا۔ ایک بار تو شیخ عجیب

کے ایک چہیتے نے اسے مارنے کے لیے بیوی سمیت بھری ٹھکل سے اغوا کر لیا تھا۔

تب ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کی رات شریف الحق دالیم اور جنگ آزادی میں شریک اس کے ملتی ہائی کے دوستوں نے ایک انقلابی فیصلہ کیا اور بدعنوان حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ جس میں شیخ عجیب اور اس کا خاندان کام آگیا۔

صدر کھنڈر مشتاق اور جنرل ضیاء الرحمن کی قیادت میں اس حکومت کے خلاف جوابی انقلاب آیا تو دالیم وہاں بھی لمحہ لمحہ جان ہتھیلی پر لیے باغی بریگیڈر خالد شرف اور اس کے ساتھیوں سے مذاکرات کے ڈول ڈالتا رہا تا کہ بنگلہ دیش کی فوج باہم نہ لڑ پڑے۔ جنرل ضیاء الرحمن کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد میجر دالیم لیفٹیننٹ کرنل بنا اور پھر ۱۹۷۶ء میں اس کی خدمات فارن آفس کے سپر وڈر دی گئیں۔ اس سے پہلے اسے بہادری اور شجاعت کا سب سے بڑا اعزاز ”پیراٹم“ عطا ہو چکا تھا۔ عوامی جمہوریہ چین میں کامیاب سفارت کاری کے بعد اسے برطانیہ، ہانگ کانگ، کینیا اور تنزانیہ میں بنگلہ دیش کے ہائی کمشنر کے فرائض انجام دینے کی عزت ملی۔

۱۹۹۵ء میں وہ گورنمنٹ سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ سیاحت، کتب بینی، سپورٹس اور اب مذہب اس کی زندگی کی ترجیحات میں شامل ہیں۔ کئی گھنٹوں پر مشتمل اس ملاقات کا اہتمام ایک دوست ملک میں کیا گیا جہاں دالیم ان دنوں اپنی بیٹی کے ہمراہ مقیم ہے۔ کچھ عرصہ قبل وہ اپنی بیوی کو کھو چکا جو بیماری سے ہار کر ایک طویل محبت بھری زندگی کا اچانک اختتام کر کے رخصت ہو گئی۔

میرے لیے یہ بات بہت حیرت کی تھی کہ کئی روز تک ملکہ برطانیہ کا ذاتی مہمان رہنے والا دالیم، جنوبی افریقہ کے نیلین منڈیلا اور ملائیشیاء کے مہاتیر محمد کا ذاتی دوست، جس کے یارانے ہنری کسنجر سے لے کر دنیا کے کتنے ہی مصروف و مقبول لوگوں سے ہیں، سفارت کاری کے طویل کیریئر کے بعد ایک پرسکون اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے حالانکہ اس کے اپنے وطن میں اس کے سر پر بھاری رقم کا اعلان ہے۔ اس ملک میں اسے سزا سنائی جا چکی ہے جس کے لیے وہ

اپنی ہی فوج سے نکلنا تھا۔ سونا بنگلہ میں آج اس کا داخلہ ممکن نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ حسرتہ واجد کی زندگی میں اب یہ ممکن نہیں رہا۔ اس نے آئین میں دی گئی انقلاب کے حصہ داروں کی سزاؤں کے لیے ہر قسم کا انتہائی ختم کر دیا ہے اور گن گن کر ان لوگوں سے بدلے لے رہی ہے جس نے اس کے والد اور خاندان کو اس جہاں سے رخصت کیا تھا۔

دائیم نے ۱۹۳۶ء میں آنکھیں کھولیں تو تحریک پاکستان جاری تھی۔ اس کے بزرگ اس تحریک کا حصہ تھے۔ جوں ہوا تو اپنے وطن کی آزادی کے پرول دستے میں خود شامل تھا۔ اس کی بیوی اس کی پشت پناہ تھی۔ آج جب وہ زندگی کی ۶۶ بہاریں دیکھ چکا ہے، اس سے مل کر حیرت دو چند ہو جاتی ہے۔ متحرک آنکھیں اور بولتے لفظ اب کسی سیاسی اور ہنگامی موضوع کا احاطہ کرنے میں کم دلچسپی لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسے ایک بار پھر پاکستان اور پاکستان کے لوگ بھاتے ہیں۔ وہ گھٹنوں اس موضوع پر بات کرتا ہے بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے وہ امت مسلمہ کے حوالے سے سوچتا ہے۔

اس کی شخصیت میں اتنی تبدیلی دیکھ کر میں نے پوچھا کہ کل کا سرمستی عقاب، کتنی ہانسی کا انقلاب گور یلا، فوج کا ایک دلیر کمانڈر، کامیاب سفارت کار، مطمئن بزنس مین..... ایک شخصیت نے کتنی شخصیتوں کو چھپا رکھا ہے؟ موسم بہار کی ایک خوبصورت سہ پہر جب ہماری

ملاقات طے تھی۔ ملاقات سے پہلے وہ اپنی اہلیہ کی قبر سے ہو کر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قرآن پاک تھا جسے وہ باقاعدگی سے قبر پر بیٹھ کر پڑھتا ہے۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پان تھے۔ ہر شست میں جب تک میں چائے کا کپ ختم کرتا یا عابریں مٹھائیوں کا مٹھاس بھرا کوئی چھوٹا ٹکڑا کاٹ کاٹ کر منہ میں رکھتا تو وہ ایک پان کھا چکا ہوتا۔

یہ ملاقات بے شک بہت طویل تھی۔ بہت مختلف تھی مگر بہت اچھی تھی۔ اپنے وطن کے ٹوٹنے، ایک حصہ علیحدہ ہونے کا دکھ برسوں سے ازرا کا باعث تھا اور میں نہیں جان پاتا تھا کہ اتنا بڑا واقعہ، اتنا بڑا سانحہ چند دنوں میں کیسے وقوع پذیر ہوا اور جن کے ہاتھوں یہ ڈھم لگا وہ کیسے لوگ تھے؟ چند نام، چند چیزیں اس غصے اور ناراضی کا مرکز بننے رہے مگر پوری بات بھی سامنے نہ آئی۔ علیحدہ ہونے والوں پر کیا بیتی۔ اب وہ کیا سوچتے ہیں۔ ان کی کہانی کیا ہے؟

صفحات کی تنگ دامانی حاصل نہ ہوتی تو ضرور بتاتا کہ سفید پاچامے اور سفید قمیض میں ملبوس آج کا دائیم سیاسی کم دانشور اور صوفی زیادہ لگتا ہے جس کی چند سال قبل خواب میں آنحضرت ﷺ سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان کے وجود سے نکلی روشنی اس کو نہلا دیتی ہے اور لندن کے خنک موسم میں خوفزدہ ہو کر اٹھ بیٹھتا اور پھر اپنی بیوی اور ساس کے کہنے پر وہ پہلی بار نفل نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے اور تب وہ

یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ نماز کیسے پڑھنی ہے۔

آئیے..... اس ملاقات میں آپ بھی شریک ہوں۔ اس بھارتیوں کی رائے ہے کہ بنگلہ دیش ایک اور پاکستان ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو ہمیں کس طرح بحالی تعلقات کے لیے پیش قدمی کرنی چاہیے؟

ج: ٹھیک ہے ملک ٹوٹ گیا۔ جیسے دیوار ٹوٹ گئی تو کیا اسے دوبارہ جوڑا نہیں جاسکتا؟ دوبارہ بنایا نہیں جاسکتا۔ ہمیں آگے دیکھنا چاہیے۔ علیحدگی کے بعد ہم نے ایک دوسرے کے لیے کیا کیا؟ کیا بنگلہ دیش کے لوگ آپ پر Trust کرنے کو تیار ہیں؟ تعلقات تب بہتر ہوتے ہیں جب لوگوں کو معاشی فائدہ ہوتا ہے تو وہ محبت کو بھی قبول کرتے ہیں۔

آپ نے ان کا خون چوسا، اسے بھولنے کے لیے انھیں کچھ دیں گے تو بھولیں گے۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ کتنے لوگوں نے اب یہاں سے جا کر وہاں کارخانے لگائے ہیں۔ یہی کام پہلے بھی ہو سکتا تھا۔ حکومتی سطح پر ہوتا تو نتائج اور بھی اچھے ہوتے۔ حسرتہ واجد کے آنے سے پہلے تک وہاں کے لوگوں میں آپ کے لیے بہت acceptance پیدا ہو گئی تھی۔ ڈھاکہ میں ہونے والے کرکٹ میچ کو دنیا نہیں بھولی جب امریکا تک میں کہا گیا تھا کہ ایسا لگتا تھا جیسے پاکستان ہوم گراؤنڈ پر میچ کھیل رہا تھا۔ اندرا گاندھی اور اس کے مشیر برائے مشرقی پاکستان ڈی بی دھر کے بیانات آن ریکارڈ موجود ہیں کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر ہم نے غلطی کی (انھوں نے بلند زور کا لفظ استعمال کیا)۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کمزور ہو جائے گا۔ بنگلہ دیش ان کا غلام اور طفیلی بن جائے گا۔ الٹا کیا ہوا کہ بنگلہ دیش ایک اور پاکستان بن گیا۔

۳۰ ہزار کے قریب فوجی تھے جو ملک ٹوٹنے کے بعد پاکستانی فوج سے ادھر گئے۔ یہ فوج کے لوگ تھے۔ ان کے دل آئیں میں بہت جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی یاد، کوئی بات اور اچھا وقت نہیں بھولتے۔ جنرل ضیاء الرحمن کے زمانے میں ہمیں اسلحہ چاہیے تھا جو کہیں سے مل نہیں رہا تھا تو پاکستان میں جنرل ضیاء تک بات پہنچانی گئی کہ ہمیں اسلحہ چاہیے۔ اس نے پوچھا، ضرورت بتائیں۔ ہزاروں گینیں

پاکستان نے دیں اور ان کے پیسے بھی نہیں لیے۔ اس طرح کے اظہار سے ملکوں میں تعاون بہت بڑھتا ہے۔ افواج، سکولوں، کالجوں کے طلبہ، سیاسی و اقتصادی اور کچھل و فود کے تبادلے اور سب سے ضروری معاشی سرگرمیاں بڑھانی چاہئیں۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں! بنگلہ دیش کے قیام نے دو قومی نظریے کی سچائی کو اور پختہ کر دیا ہے۔ ہندوستان ایک کثیر الاقوامی ملک تھا، قوم نہیں تھا۔

س: ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد مجیب کو اقتدار کیوں نہیں دیا گیا؟ آپ اس ادارے کا حصہ تھے جس نے اسے بااختیار ہونے سے محروم رکھنے کا فیصلہ کیا تھا؟

ج: مجیب کو اقتدار دینے سے کیوں ڈرتے تھے، میں نہیں سمجھ پایا۔ اس نے تو بھی آزاد بنگلہ دیش کا نعرہ ہی نہیں لگایا تھا۔ اس میں ایسی ہمت بھی نہیں تھی۔ آپ اسے وزیر اعظم بنا دیتے، جس طرح کا وہ نااہل حکمران ثابت ہوا، ۲ سال نہیں چل سکتا تھا۔ آپ نیا حکمران لے آتے۔ مجھے نہیں سمجھ آئی کہ فوجی جفا اور پاکستانی سیاسی اشرافیہ کو اس سے کیا ڈر تھا۔ کیا وہ وزیر اعظم بن کر اسلام آباد کی اینٹیں اٹھوا کر لے جاتا.....!

نااہلیت کی حد یہ ہے کہ وہ جو بابائے قوم (بنگلہ بندھو) کے مقام پر فائز تھا اُس نے اپنی ناقص پالیسیوں، ناہنجی، اقربا پروری اور غلط بخششوں کی وجہ سے پورے ملک کو رسال کے اندر تیس برس کر دیا۔

۱۶۰۰۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ مالیتی سامان بھارتی فوج لوٹ کر لے گئی۔ باقی عوامی لیگ کے رہنماؤں نے اپنی اپنی بابائیاں (فوج) بنالیں۔ ان کی لوٹ مار، قتل و غارت، سہلگن جیسے جرائم پر بھی پردہ ڈال دیا گیا۔ پورے بنگلہ دیش میں ایسی انارکلی پھیل گئی کہ فوج کو بلانا پڑا۔ فوج آتو جاتی ہے لیکن اس کی واپسی ہمیشہ مشکل ہوتی ہے پھر فوج کو کرپٹ لوگوں کے خلاف کام سے روک دیا گیا۔ مجیب کے اندر ایک بدترین آمر تھا۔ آخر میں تو وہ تاجر صدر بننے والا تھا۔ ایسی ہی سوچ بھٹو صاحب میں بھی تھی۔

س: کبھی بھٹو سے ملاقات رہی۔ وہ اس عہد میں

پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ہونے والی واحد حکم عدولی



ملٹری اکیڈمی کے انٹیمیوس پی ایف اے کی پانگ آؤٹ سے ذرا پہلے سات روزہ قیادت ایکسرسز ختم ہوئی تو سارے لڑکے کامیابی سے برف میں سات دن گزار کر بیماری اور تھکاوٹ کے ساتھ واپس آ رہے تھے تو جنرل میٹھا نے خلاف توقع تحسین کرنے کے بجائے سزا سنائی کہ کوئی کیڈٹ سڑک یا ٹرانسپورٹ استعمال نہیں کرے گا اور یہاں سے ۳۵ کلو میٹر دور اکیڈمی پہاڑی رستے سے جائے گا۔ یہ بہت ناروا اور ظالمانہ حکم تھا۔ کسی کیڈٹ کی جسمانی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ پہاڑی راستے سے زندہ سلامت اکیڈمی پہنچ پاتا۔ دائیم نے انھیں سڑک استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ راستے میں تین چار لڑکے پکڑے گئے۔ جنرل میٹھا نے حکم عدولی پر پورے بیچ کوئی نکال دینے کا عندیہ دیا اور تائید کے لیے جی ایچ پی سی لکھا گیا جہاں دائیم کے جیسے ہوئے تین لڑکے اپنے جرنیل باپوں کو اصل صورت حال سے آگاہ کرنے اور جنرل میٹھا کے ظالمانہ حکم کے نقصان بتانے پہنچ چکے تھے۔ یوں اس کی حکمت عملی سے یہ لوگ سزا سے بچ گئے۔

بڑے مقبول لیڈر ہوا کرتے تھے؟

ج: بھٹو سے میری ۲ ملاقاتیں ہوئیں پہلی اس وقت جب میری پوسٹنگ کوئٹہ میں تھی۔ کراچی سے جہاز لیٹ اڑا تو پتا چلا کہ بھٹو آ رہا ہے۔ جہاز میں دو تین ایئر ہوسٹس بھی زیادہ تھیں۔ اس روز بھٹو میرے دائیں طرف ایک قطار چھوڑ کر بیٹھا ہوا، کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس سے آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے مجھے بلایا اور پینے کی دعوت دی۔ میرے انکار پر وہ قہقہہ لگا کر بولا ”تمھارے میس میں تو مفت ملتی ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ تم نہ پیو.....؟“

کوئٹہ قریب آیا تو اس کے کارندوں نے پیچھے سے آکر اس کے کپڑے بدلے۔ کوٹ پہنایا۔ ماؤ کپ دی۔ مجھے تو زار مارا لگا۔ کوئٹہ پہنچ کر جہاز سے اتر کر اس نے پانی منگوایا پھر یہ کہہ کر پینے سے انکار کر دیا کہ یہاں غریب لوگوں کو پانی میسر نہیں، میں کیسے پی سکتا ہوں؟ یہ میرے سامنے ہوا۔ مجھے بہت برا لگا۔ بالکل فونٹکی حالانکہ بڑے جلسے میں اس نے خوب خطاب کیا۔

س: ہندوستانی جنرل اوبان سے کب واسطہ پڑا، ملاقات کب ہوئی اور اس کا بنگلہ دیش موومنٹ سے کیا تعلق تھا؟

ج: ہندوستانی بارڈر کراس کرتے ہوئے ہم نے اپنے آپ کو ہندوستانی حکام کے حوالے نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم پاک فوج کے افسر تھے اور ہندوستانی تفتیش کاروں نے دہلی خبر ہونے تک ہمیں اوجھڑ کر رکھ دینا تھا۔ ہم نے دہلی میں وزارت خارجہ میں اپنے آپ کو ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور



اندر گاندھی کے نام ایک خط لکھ کر پوسٹ کر دیا۔ اس کی ایک نقل عبوری بنگلہ دیش حکومت جس کے سربراہ نذیر الاسلام اور وزیراعظم تاج الدین تھے، کے نام

بھی بھجوا دی اور خود لنگا لنگے سے کا لگا ایکسپریس لے کر دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ دہلی میں ہم ۲ دن ۲ رات راج ہوٹل میں رہے۔ شہر کی سیر بھی کی اور ۱۰ ہزار پاکستانی روپوں کو تبدیل بھی کرایا۔ تب اوپن مارکیٹ سے ایک پاکستانی روپے کے ہمیں ایک روپے ۷۰ روپے بھارتی ملے تھے۔ موٹی نے تمام خبریں اس انجینیئر، اخباروں، رسالوں کے نمبر حاصل کر کے سب کو بلا لیا اور ہم نے ان کی موجودگی میں اپنے آپ کو وزارت خارجہ کے حوالہ کیا۔ تب جوائنٹ سیکریٹری اے کے رائے نے ہمارا استقبال کیا۔ مجھے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ سے ملوایا گیا۔ سفید قمیص اور سفید پاجامے میں ملبوس ایک نوجوان سے بھی ملوایا۔ یہ جنرل اوبان سنگھ تھا۔ پتا چلا کہ راکے ریسرچ اور تجزیہ ونگ کا ڈائریکٹر جنرل ہے۔ اچھا، سادہ اور منکسر الحواج آدمی تھا۔

۴۰ سالہ بریگیڈر نارائن بھی وہاں موجود تھا اور وہ ہمارا میزبان تھا۔ وہ ہم تینوں کو لے کر بازار گیا۔ شاپنگ کرائی، سنے کپڑے، جوتے اور شب خوابی کا لباس لے کر دیا۔ اگلے ۲ روز ہم تفتیشی افسروں کے سوال ناموں کے جوابات تیار کرتے رہے۔ ہمارے جوابات کی ایک منظم طریقے سے جانچ پڑتال کی گئی۔ انھوں نے ہم سے بہت سی قیمتی معلومات بھی اگلو لی تھیں۔ دفاعی تخصیصات، مواصلات، فوج کا طریق کار، طرز زندگی، سکیورٹی سسٹم، بنگالی فوجی، افسران، بیوروکریٹس، ذاتی، خاندانی زندگی، دوستوں، رشتے داروں کے نام پتے۔ یہ مشق ۴ دن اور ۴ راتیں جاری رہی۔

س: عبوری حکومت کے عہدے داروں سے ملاقات کب اور کیسے ہوئی اور آپ نے ان کو کیا پایا؟

ج: ہمیں ۴ دن بعد عبوری حکومت کے وزیراعظم تاج الدین احمد، وزیر خارجہ کھنڈکر مشتاق احمد اور مکتی بھائی کے کمانڈر ان چیف کرنل عثمانی (کرنل ایم اے جی عثمانی جو بعد میں جنرل عثمانی کے نام سے پہچانے گئے) سے ملوانے کے لیے گایاں بدل بدل کر لے جایا گیا۔



کرنل عثمانی نے کہا ”لو! آپ کو آنا مبارک ہو۔ میں آپ کی حب الوطنی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ ہمیں آپ جیسے افسروں کی اشد ضرورت تھی۔ ہم چاہتے ہیں آپ جیسے اور افسر بھی پاکستان سے آجائیں۔“

میں نے بتایا ”سر بہت سے اور افسر بھی آنا چاہتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ ہندوستانی حکومت کا ان کے ساتھ رویہ کیسا ہوگا؟ وہ ایسا قدم اٹھانے سے ڈرتے اور ہچکچاتے ہیں۔ اگر ہم ان کو بتائیں کہ ہندوستانی حکومت اور فوج کس قدر ہمارے مقصد کے ساتھ ہمدرد ہے اور کس قدر تعاون کر رہی ہے تو بہت سے اور افسر بھی آجائیں گے۔“

س: اس فوج کا سربراہ جنرل اوبان سنگھ تھا اور اس کا اصل فرض کیا تھا؟

ج: آزادی کے بعد عوامی لیگ کی حکومت کو تحفظ اور مسلح حمایت دینا تھا۔ اس کا نام بنگلہ دیش لبریشن آرمی (BLA) رکھا گیا۔ اس فوج کو بعد میں مجیب بھائی کہا گیا اور ایک نام جاتیور بھی بھائی (GRB) بھی تھا۔ اس نے بہت ظلم کے پہاڑ توڑے۔ ہندوستانی حکومت نے فیصلہ کیا کہ پاکستان سے فرار ہو کر آنے والے تینوں فوجی

۶ جنوری ۶۸ء کو اچانک ۲ سینئرز ایس پی آفیسرز اور ۲۶ رد فوجی مقامی بنگالی آفیسرز کی گرفتاری ہوئی۔ حکومت نے پریس ریلیز جاری کی کہ انھوں نے دسمبر ۶۷ء میں ڈھاکہ میں قائم بھارتی قونصلیٹ کے ساتھ مل کر علیحدگی کی سازش کی۔ ۱۷ جنوری کو شیخ مجیب رہا ہوئے اور فوراً انھیں دوبارہ گرفتار کر کے چھوٹی منتقل کر دیا گیا کہ یہ اگر ملہ سازش کیس کا بڑا ملزم ہے۔ وہ ۵۵ رٹروم میں شامل ہی نہ تھا۔ بحریہ کے لیفٹیننٹ کمانڈر معظم حسین مسلح افواج میں بنگالی افسروں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک پر بولتے تھے۔ وہ اس منصوبے کے خالق تھے۔ شیخ مجیب کا سیاسی مستقبل تاریک کرنے کے لیے اسے سازش میں ڈال دیا گیا۔ کیس کے دوران حکومت کے خلاف غم و غصے کا طوفان کھڑا ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ مجیب خود مختاری کے حامی تھے۔ علیحدگی کا انھوں نے نام نہیں لیا البتہ مولانا عبدالحمید بھاشانی نے کئی سال پہلے ولیم السلام مغربی پاکستان کہہ کر آزاد بنگلہ ریاست کے لیے ذہن ہموار کرنے شروع کر دیے تھے۔

افسر جنرل اوبان کے ساتھ مل کر BLA کو قائم اور منظم کریں۔ وہ ہمیں غیر سیاسی اور شیخ مجیب پر اندھا اعتماد کرنے والا سمجھتے تھے۔ ہمارے دفاعی پس منظر، پیشہ ورانہ صلاحیتوں، اندھی جرأت اور مقصد سے بچی لگن کے باعث عبوری حکومت بھی اس فیصلے میں ان کے ساتھ تھی۔ آنے والے دنوں میں میں نے نوٹ کیا ہندوستانی افسر، بنگالی افسروں پر اعتماد نہیں کرتے تھے ہندوستانی فوج کے مشرقی کمانڈر جنرل اروڑا کے بعد میں ایک انٹرویو میں جو اس نے مسٹر فیصل چکروٹی کو دیا، کہا ”مسلح افواج کے بنگالی ممبران اور افسروں پر نہ صرف مجیب اور ان کی پارٹی شکوک و شبہات رکھتی تھی بلکہ خود ہندوستان کے حکام بھی ان پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔“

س: ہندوستانی حکام کو دوسرا خوف اور خطرہ کس سے تھا؟

ج: کنسل باڑیوں جیسی انتہائی بائیں بازو کی قوتوں سے تھا۔ کنسل باڑی پہلے ہی مکتی بھائی کی صفوں میں گھس کر نفوذ حاصل کر چکے تھے۔ مغربی بنگال، اڑیسہ، بہار، آسام، تری پورہ، منی پورہ، میزورام جیسی ملاحند ہندوستانی ریاستیں یا صوبے ایسے تھے جہاں کنسل باڑی تحریک پر واک چڑھ رہی تھی۔ لہذا طے ہوا کہ ان کو شروع سے ہی اکٹھا پیچیدہ جائے ورنہ یہ لوگ بعد میں فوجی حکام سے مل کر عوامی لیگ کی قیادت کے لیے بہت مسائل پیدا کریں گے۔ ان کے اندر سیاسی قیادت پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ پورا

انقلاب ہائی جیک کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ ہمیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ اپنے کیریئر اور جانوں کو داؤ پر لگا کر اس جنگ میں کود پڑنے والوں کے بارے میں کسی غلط رائے قائم کی گئی۔ ہمیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان کے حکام اصل میں علیحدگی کے جس نقشے پر کام کر رہے تھے، اس میں بنگلہ دیش کی آزادی نہیں تھی، دارالحکومت اسلام آباد سے کلکتہ شفٹ کرنے کا مسئلہ تھا۔ ایک کمزور سا ملک جسے مستقل طور پر اپنا غلام بنا کر رکھنے کی ساری تیاری تھی کہ کہیں کسی طرح آنے والے وقت میں یہ قوم اپنے قدموں پر کھڑی نہ ہو جائے۔

س: سنا ہے یہ جانتے ہی آپ تینوں نے حلف اٹھایا کہ اس کمزور منصوبے کا حصہ نہیں بنیں گے۔ کیا یہ درست ہے؟

ج: بالکل درست ہے۔ ہم نے حلف لیا اور طے کیا کہ اپنے آپ کو پوشیدہ طور پر منظم کریں گے۔ اصل میں انہی دو تین ہفتوں میں ہندوستانی حمایت، کوششوں اور سرگرمیوں کو دیکھ کر ہمارے ضمیر نے بغاوت کر دی تھی۔ ہماری اولین خواہش یہ تھی کہ وہیلی سے عجیب نگر (کلکتہ) پہنچ کر ہم محاذ جنگ پر پہنچ جائیں، آگے کے حالات ہم سنبھال لیں گے۔ لوگوں کو خود منظم کر لیں گے۔

س: کلکتہ میں پاکستان مشن کا انحراف اور بنگلہ پرچم کا لہرایا جانا تب بڑا واقعہ تھا؟

ج: کلکتہ میں پاکستان مشن کے انحراف کی داستان ہمیں شہاب الدین اور امجد نے سناٹی۔ وہ ہم سے ملنے آتے تھے۔ مشن میں بنگالی افسر حسین علی کے بعد رفیق اسلام چوہدری سینئر ترین افسر تھے۔ وہ وہاں فرسٹ سیکریٹری انچارج تھے۔ ان کی تقرری خفیہ طور پر انجیلی جنس ایجنسی کے ذریعے ہوئی تھی اس لیے وہ بہت اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ عملے کے زیادہ لوگ بنگالی تھے۔ جونہی عبوری جلاوطن حکومت کا اعلان ہوا، ان سب نے منحرف ہو کر بنگلہ حکومت کی حمایت اور اطاعت کا اعلان کر دیا۔ ۱۹ دسمبر کو ایوبیہ پر واقع یہ پہلا غیر ملکی مشن تھا جس پر پاکستان کے بجائے بنگلہ کا

پرچم لہرایا گیا اور تمام پاکستانی عملے کو مشن سے نکال دیا گیا۔ س: کچھ ۵۸ ہائی گنج کے بارے میں بتائیے جہاں عجیب کے ساتھیوں نے ہندوستان کی چھتری تلے عبوری حکومت کا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ وہاں جا کر کیا محسوس ہوا؟

ج: یہ بلند دیواروں سے گھرا ہوا ایک دو منزلہ بنگلہ تھا۔ باہر گیٹ کے قریب ایک پول پر بنگلہ دیش کا مجوزہ بزنرنگ کا پرچم جس کے درمیان سرخ ابھرتا ہوا سورج اور اوپر پیلے رنگ کا بنگلہ نقش تھا، لہرا رہا تھا۔ گیٹ پر سنتری موجود تھے۔ یہ عجیب نگر کی عبوری حکومت کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اندر چند خیمے لگے تھے۔ گیٹ پر پی ایس ایف کے مسلح گارڈ تھے۔ ساری عمارت لوگوں سے بھری رہتی تھی۔ ہمیں حیرت تھی کہ جنگ ملک کے اندر لڑی جا رہی ہے اور ہیڈ کوارٹر وہاں سے دور ہائی گنج کلکتہ میں کیوں ہے؟ ہمیں یہ سارا معاملہ عقل سے بعید اور قدرے ناواقف لگا۔ ہم نے پوچھا کرنل عثمانی کہاں ہے؟ یہ ملتی ہائی کے کمانڈر ان چیف تھے۔ بتایا گیا کہ وہ وزیر اعظم تاج الدین کے ساتھ ادھر ہی رہتے ہیں۔ دوسری منزل پر واقع ان کے کمرے میں لے جایا گیا۔ کمرے میں ایک طرف بیڈ اور دوسری طرف کچڑوں کا شیلف تھا۔ ایک میز، چار کرسیاں، لکڑی کا لمبا سانچہ بھی پڑا تھا۔ اس کمرے میں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ کرنل نے ہمیں خوش آمدید کہا اور بولا اچھا لڑو! یہ میرا چھوٹا سا دفتر اور رہائش ہے۔ اب تم بیٹھ جاؤ پھر بولے، شام کو کابینہ کی میٹنگ کے بعد آئندہ لائحہ عمل پر بات کریں گے۔



تاج الدین

نی الحال آؤ وزیر اعظم سے مل لیتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ چلتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں گئے۔ وزیر اعظم بیڈ پر لیٹے

کاغذات دیکھ رہے تھے۔ یہ کمرہ بھی کرنل عثمانی کے کمرے جیسا تھا۔ ۲۰ دسمبر بعد ہم واپس آگئے اور وہ دونوں کابینہ کے اجلاس کے لیے چلے گئے۔

س: ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات ایسا کیا ہوا تھا جس نے ملک کی تاریخ ہی نہیں جغرافیہ بھی بدل کر رکھ دیا؟ آپ بھی اسی وجہ سے پاک فوج سے فرار ہوئے؟

ج: دیکھیں بنگ مین..... ۲۵ مارچ کی رات ایک فیصلہ کن رات تھی۔ یہ رات نہ آتی تو ملک بھی نہ ٹوٹتا۔ ملک کے بے اصول، بددیانت فوجی ٹولے نے اپنی مسلح افواج کو مشرقی پاکستان کے نیٹے لوگوں پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے دیا۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ ہزاروں معصوم اور بے گناہ بنگالیوں کے ساتھ ساتھ پاک فوج کے بنگالی افسر اور جوان بھی اس خون ریزی کا شکار ہوئے۔ لوگ اس برق رفتاری و غارت کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار نہ تھے۔

افسوس ناک اور مایوس کن پہلو یہ بھی تھا کہ شیخ عجیب کو حملے اور ملٹری ایکشن کی اطلاع بھی تھی مگر اس نے نہ تو کسی متبادل نظام اور لیڈر شپ کا اہتمام کیا اور نہ خود عوام کے ساتھ کھڑا ہوا۔ ہزاروں لوگ راتوں رات مارے گئے۔ شیخ عجیب نے عملاً اپنے آپ کو ایک نااہل لیڈر ثابت کیا۔ لوگ

میں اتنے برسوں بعد پورے خلوص سے سمجھتا ہوں کہ پاکستان اللہ کا بہت بڑا عطیہ اور تحفہ ہے، اسے قائم رہنا ہے۔ اس کی حفاظت ضروری ہے۔ قائد اعظم جیسے حوصلے اور صلاحیتوں کے حامل رہنما کی ضرورت ہے جو ملک کے وقار کو بڑھائے، عزت اور ترقی کی راہ پر لگائے۔ اس عظیم قائد نے انگریز راج کو ہی نہیں ہندو چاکلیہ کو بھی شکست سے دوچار کیا تھا۔ اب بھی لیڈر شپ کی سوچ میں آتی ہی پیچورٹی کی ضرورت ہے۔ ۷۱ء میں علیحدگی سے ہم نے کچھ حاصل کیا ہو یا نہ پیچورٹی ضرور حاصل کی ہے۔

میں نے چند سال پہلے بطور سفیر بائگ کانگ میں ایشیائی ملکوں کے ایک سیمینار میں کہا، بھارت جیسا ہے ویسا نہیں رہے گا تو بھارتی نمائندے ہر انٹیم میرے پاس آئے اور میرے پیپر پر ناراضی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا، یہ بطور ڈپلومیٹ نہیں بطور تجزیہ نگار میرا جائزہ ہے۔ ڈپلومیٹ تو وہ ہوتا ہے جو جھوٹ بچتا ہے اپنے وطن کی محبت اور قائد سے! مجھے بعد میں فارن سروس سے بھی پوچھا گیا۔ میں نے کہا جس بنیاد پر ہم ملک بنے۔ اس بنیاد پر بھارت کی بارہ تیرہ ریاستیں تو ضرور آزاد ہو گئیں۔ ہماری آزادی کی جنگ میں شامل بھارتی آفیسرز اپنے اپنے صوبوں میں جا کر آزادی کی تحریکوں کو منظم کر رہے ہیں۔

آخر دم تک منتظر رہے کہ اس کی طرف سے مسلح جدوجہد کا کوئی پیغام اور اعلان آ سکے مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ وہ بے حس و حرکت رہے اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے "میں روایتی سیاست پر یقین رکھتا ہوں، مسلح جدوجہد پر نہیں۔" ہزاروں لوگوں کے قتل عام پر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا متحدہ پاکستان کا لیڈر بننا اس کی سب سے بڑی اور اولین خواہش تھی جو ہر چیز پر بھاری تھی۔ وہ اپنے گھر پر سکون انداز میں بیٹھا رہا پھر اچانک پُر اسرار حالات میں اپنی گرفتاری دے دی۔ اس کی بیوی اور بیٹی حسینہ واجد کے علاوہ باقی ماندہ سارا خاندان بھی حکومت پاکستان کی میزبانی کے حزرے لیتا رہا۔

س: شیخ عجیب نے نہیں تو پھر اعلان آزادی کس نے کیا؟ ج: شیخ عجیب کی بے وفائی پر پوری قوم صدمے کی کیفیت میں تھی۔ ان نازک لمحات میں فوج کے ایک غیر معروف میجر ضیاء الرحمن نے جو حب الوطنی کے جذبات سے سرشار تھا، اپنے ساتھیوں کے مشورے سے کلور گھات ریڈیو اسٹیشن چٹاگانگ سے آزادی کا اعلان کر کے قوم کو مسلح جدوجہد کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی اپیل کی۔ اس اعلان نے قوم کو متحد اور متحرک کر دیا۔ بنگال ریمینٹس کے علاوہ تمام پاکستانی یونٹس کے ای پی آر، پولیس، انصار،

بنگالی میں کہو

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے دوستوں کی ایک دعوت تھی۔ جس میں فوج، انٹیلی جنس آفیسر، کچھ بڑے تاجر اور چند سیاسی لوگ شامل تھے۔ پاکستان نوٹنے پر بات چل نکلی۔ کسی نے سوال کیا، ملک نوٹنے کی اصل وجہ کیا تھی؟ سبھی اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ میں خاموشی سے کھانا کھاتا رہا پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ ظاہر ہے اصل بات کوئی اور کیسے بتا سکتا تھا؟ میزبان نے کہا آپ ضرور کچھ کہیے، میں نے سکراتے ہوئے کہا۔ ”وجہ ساری دنیا جانتی ہے۔“

”اصل وجہ اس سے مختلف ہے۔“ میں نے میزبان سے کہا۔ ”آپ نے مجھ سے ایک جملہ کہا، ”آپ کچھ کہیں“، بنگلہ میں اسے کیا کہتے ہیں؟“

وہ بچپانی تھا۔ اس نے کہا ”میں کیسے بتا سکتا ہوں؟“

یاد رہے وہ ایک مشہور آدمی ہے۔ میں نے کہا، چلو چھوڑیں، یہاں ۲۰۱۵ء بندے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک آدمی ہی بتا دے کہ ان لفظوں کو بنگالی میں کیسے ادا کریں گے؟

پھر میں نے کہا، یہاں اکثریت پنجاب کے لوگوں کی اور وہاں اکثریت بنگالی بولنے والوں کی ہے۔ آپ لوگ آپس میں کیونسی کیٹ ہی نہیں کر سکتے تو کتنے کیسے رہ سکتے تھے؟

آپ نے کوشش ہی نہیں کی، نہ زبان میکنے کی، نہ انھیں ساتھ رکھنے کی۔ نہ کوشش ہو اور نہ خواہش ہو تو دھکے سے کوئی کب ساتھ رہتا ہے۔ یہ آپ نے قومی طور پر غلطی کی تھی اسے دھرایے مت، اس سے سیکھیے اور اپنے مسائل کا حل نکالے۔

جاتیو راہگی باہنی کو متبادل کے طور پر پروان چڑھایا۔ اس صورت حال میں فوج کے پاس بھی دو خفیہ تنظیمیں، فوجی کونسل اور گاونڈو باہنی بنانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ۱۹۷۲ء کے بعد جب پوری قوم دہشت زدہ تھی اور ایک فوجی کرٹل ضیاء الدین نے ہی سب سے پہلے آواز اٹھائی تھی اور بھارت سے ۲۵ سالہ معاہدہ دوستی یا غلامی ختم کرنے پر زور دیا تھا۔

ج: ۱۵ اگست کے انقلاب کی فوری کامیابی کی کیا وجہ تھی؟

ج: ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو بنگلہ دیش کی تاریخ نے اپنے آپ کو پھر دہرایا اور آمر مطلق شیخ مجیب کا تختہ الٹ دیا گیا۔ تبدیلی پر پوری قوم نے جشن منایا اور کھنڈ کر مشتاق احمد کو صدر بنا دیا گیا۔ پھر زور عوامی حمایت نے اسے ایک عوامی انقلاب کی صورت دے دی اور حمایت نے اس انقلاب کو اخلاقی جواز بھی مہیا کر دیا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو پارلیمنٹ کے اسپیکر، مرزا غلام حفیظ نے کہا ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو شیخ مجیب الرحمن سیاسی تبدیلی

جمہوریت کو فنا کیا اور قوم پر ایک جماعتی نظام نافذ کر دیا۔ حد یہ کہ تمام اخبارات بند کر دیے۔ صرف ۴ سرکاری اخبارات کو چھپنے کی اجازت دی۔ عدلیہ کو ایگزیکٹو برانچ کے انتظامی کنٹرول میں دے دیا۔ بنیادی حقوق، عوامی آزادی اور عدلیہ سب کچھ فنا کر دیے گئے۔

ج: بنگلہ دیش کی فوج میں ایک خفیہ فوج بنانے کی کہانی کی کیا حقیقت ہے؟

ج: بنگلہ دیش کی مسلح افواج آزمودہ محب وطن بنگالیوں اور پاکستانی مسلح افواج سے بھاگے ہوئے ارکان پر مشتمل تھی۔ انھوں نے بڑی مشکلات کیں اور وفا داری پر لمبی سزائیں کائی تھیں۔ اس لیے بنگلہ دیش کی مسلح افواج کا کردار دنیا کی روایتی افواج سے مختلف تھا۔ افواج کے اراکین کا ایمان تھا کہ عوام اور قومی مفاد اہم ہے نہ کہ کوئی سیاسی گروہ یا پارٹی۔ فوج کی اس سوچ نے شیخ مجیب کی حکومت کو بہت بھڑکا دیا۔ وہ فوج کو قائم رکھنے کے ہی حق میں نہیں تھا۔ اس نے فوج کے مقابلے کے لیے

بھتیار ڈالنے کی تقریب ہمارے خیال سے جنرل عثمانی اور مشنر کے کمانڈ کے اعلیٰ ترین کمانڈر جنرل اروڑا کے سامنے ہوئی چاہیے مگر جنرل عثمانی کو وہاں آنے ہی نہیں دیا گیا اور جنرل اروڑا کو واحد فاتح کے طور پر پیش کیا گیا۔

س: شیخ مجیب کے عروج کو اس قدر جلد زوال کیسے آیا؟ آپ کو تو ان سے بڑی قربت بھی تھی؟

ج: یہ درست ہے میں انھیں کبھی کبھی چچا کہہ کر بلاتا۔ ان کے گھر آنا جانا عام بات تھی۔ خاندانی تعلقات کی قربت کا اندازہ اس بات سے کریں کہ آزادی کے بعد ڈھاکہ میں جو بھی سماجی تقریب ہوئی، وہ میری شادی کی پہلی سالگرہ تھی جس میں شیخ مجیب کے اہل خانہ اور وزراء بھی شامل ہوئے تھے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجیب اور اس کی پارٹی عوامی کسکال کا دور حکومت ایک خوفناک خواب کے مانند ہے۔ یہ بھوتوں کی طرح آکر ڈراتا رہتا ہے۔ مجیب نے پاکستان سے رہائی کے بعد براہ راست ڈھاکہ آنے کے بجائے

دہلی جانا ضروری سمجھا۔ کہا جاتا ہے کہ اندرا گاندھی کے حکم پر ہی قوم پرستی، سوشلزم، جمہوریت اور سیکولرازم کو بغیر کسی عوامی منظوری یا استصواب کے آئین کے ۴ بنیادی اصولوں کی طرح نافذ کر دیا گیا۔ اس عجیب و غریب فلسفے کو ”عجیب وارڈ“ کا نام دیا گیا اور کھنڈ کر محمد الیاس نے جعلی فلسفی بننے کے لیے عجیب وارڈ کو کتابی صورت دے ڈالی۔

بنگلہ دانشوروں نے اس کا موازنہ ہٹلر کی کتاب ”میں کیسے“ سے کر کے اسے فاشزم اور آمریت کی تمہید قرار دیا۔

عوامی کسکال (یہ عوامی لیگ کا بدلا ہوا نیا نام تھا) کا دور بنگلہ دیش کی تاریخ کا سب سے تاریک اور بدترین دور ہے۔ ۱۹۷۵ء میں شیخ مجیب نے قلم کی ایک جیش سے

مجاہد فورس سے فرار ہو کر آنے والے فوجیوں اور سول انتظامیہ کے ممبران نے جو بھی بھتیار ہاتھ میں آیا، لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے بھتیار لاشیاں، بلم، شارٹ گنیں، ۳۰۳ رائفلیں تھیں۔ یہ ساری چیزیں پاکستانی فوج کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ اس لیے مزاحمت ٹھوس صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔

س: حملے کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

ج: ۳۳ دسمبر کو شام تقریباً ۵ بج کر ۲۸ منٹ پر پاکستانی فضائیہ نے ہندوستانی علاقوں میں سرحدوں کے نزدیک چند ہوائی اڈوں پر ایک حملہ کر دیا۔ بیک وقت سری نگر، اوتی پور، پٹھان کوٹ، اترا لائی، جودپور، انبالہ اور آگرہ پر بھی ہوائی حملے کیے گئے۔ اس وقت اندرا گاندھی کلکتہ میں ایک جلیے سے خطاب کر رہی تھی۔ اس کو جیسے ہی اطلاع ملی اس نے جلیے کے اندر ہی اعلان جنگ کر دیا۔ دہلی جانے سے پہلے مشرقی کمان کے کمانڈروں کو مشرقی پاکستان پر حملے کا حکم دے دیا گیا۔ جنرل اروڑا کی کمانڈ میں ۳۳ آرمی کور (۲۳۳۲) تھیں۔ جنرل بی این راؤ کا ہیڈ کوارٹر کراچی میں تھا اور جنرل تھیا اور جنرل ناگر اپنی اپنی کور کے ساتھ تھے۔

ہندوستان کی کل فوج ۵ لاکھ تھی اور اسے تقریباً ایک لاکھ کتی باہنی اور ایک لاکھ دوسرے مجاہدین آزادی کی مدد حاصل تھی۔ انھیں مطلوبہ ہوائی اور سمندری مدد دی گئی۔ حملہ بیک وقت کیا گیا، برج ہیڈز قائم کیے جاتے رہے۔ ان تمام برج ہیڈز سے پیش قدمی کر کے فوج ڈھاکہ کی طرف روانہ ہوئی۔ پاکستانی فوج کو جگہ جگہ پسپائی کے راستے بند کر کے قید کر دیا گیا۔ پاک فوج کے مقابلے پر ۵۷ لاکھ بھارتی فوج اور ۲ لاکھ بھارتی باہنی کے جوان تھے۔ یہ قوت ۶ لاکھ زیادہ تھی۔ پاک فوج مزاحمت جاری نہ رکھ سکی اور ۱۴ دسمبر دن اس نے غیر شروط طور پر بھتیار ڈال دیے۔

۲۵ مارچ کی رات ایک فیصلہ کن رات تھی

یہ رات نہ آتی تو ملک کبھی نہ ٹوٹتا

کے نتیجے میں مارے گئے۔ محبوب اور باقی لوگوں کی موت کسی طور پر معمول کی ہلاکت نہیں تھی۔ وہ مسلح جھڑپ کے نتیجے میں مارے گئے تھے۔ اسی دن اس وقت کے وزیر اعظم شاہ عزیز الرحمن نے ضیاء الرحمن کی اجازت سے بڑے واضح انداز میں کہا۔ ۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء کو جس انداز میں کالا قانون ایوان میں ۱۵ ممبروں کے اندر منظور کر کے ۸ کروڑ عوام کے گلے میں ایک پارٹی کے اقتدار کا پسندنا ڈالا گیا تھا۔ فوجی انقلاب اس فاشٹ حکومت کے خلاف تھا۔ اس اجلاس میں ۳۰۰ ممبروں میں سے ۲۳۱ نے سزاؤں کے استثنیٰ کا بل پاس کیا اور اسے پانچویں ترمیم کے طور پر آئین کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس طرح ضیاء الرحمن جب بعد میں براہ راست صدر منتخب ہوئے تو بی این بی حکومت نے ۱۵ اگست کے انقلاب کو قانونی استحقاق مہیا کر کے اس کے حق میں حتمی فیصلہ دے دیا تھا۔

س: حسین واجد حکومت تو اس استثنیٰ کو نہیں ماننی، وہ تو اسے قتل کا جرم قرار دے رہی ہے جس کا ارتکاب چند ناراض فوجیوں نے کیا جو قواعد و ضوابط سے عاری تھے۔ ج: اگر یہ معاملہ ہے تو پھر حکومت کی تاریخی تبدیلی کے بعد مسلح افواج بی ڈی آر، پولیس، عدلیہ، انتظامیہ، حتیٰ کہ راکھی بائی کے سربراہان نے کھنڈ کر مشاق کی حکومت کی حمایت و تائید کر کے تعاون کیوں پیش کیا؟ ان کے بیانات ریڈیو اور ٹی وی پر آئے۔ عوامی یکسال کے رہنمائی حکومت میں شامل کیوں ہوئے؟ پوری قوم جشن کیوں مناتی رہی؟ عوام نے کرفیو کیوں توڑے اور سینا بائی زندہ باد کے نعروں سے ڈھا کیا کیوں گونجتا رہا؟

بکسال کا کوئی ایک لیڈر بھی ملک کے کسی حصے میں جلوس نہ نکال سکا۔ انقلاب بے شک افواج نے برپا کیا تھا مگر اس کے پیچھے اصل طاقت تو باغیہ عوام کی تھی۔ اگر وہ انقلاب نہ آتا تو آج کی ۸۰ سیاسی جماعتیں کب اور کیسے وجود میں آتیں۔

س: ۱۹۹۶ء کے انتخابات حسین واجد نے حجاب اوڑھ کر اور بیج بھتہ میں لے کر لڑے اور کھلے عام شیخ مجیب کی بکسال حکومت کی غلط کاریوں کو تسلیم کر کے عوام سے ووٹ



پاکستان میرے دل سے نہیں نکلا

میرا مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان میرے دل سے نہیں نکلا، الگ ملک بنا کر اسے اپنے خوابوں کا مرکز بنایا مگر میرے سارے خواب ٹوٹ گئے۔ جس کو لیڈر بنایا اسی نے دھوکا دیا۔ جن پر اعتبار کیا انھوں نے قبلہ اسلام آباد کے بجائے دہلی کو بنانے کے ۲۵ سالہ معاہدے کر لیے۔ فوج کے ظلم کے خلاف ملک چھوڑا جہاں عوامی لیگ کے بڑے لیڈر نے اپنی اپنی باہنی بنا کر ظلم و جبر کا ایسا طوفان برپا کیا کہ آزادی کے پہلے سال ۲۰ ہزار سے زائد لوگوں کو چن چن کر مار دیا گیا۔

حکمت عملی کی وجہ سے ۲۹۹ کے ایوان میں ۲۳۰ سینیٹیں مل گئیں اور اس نے وزیر اعظم بننے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنی اتحادی پارٹی کے جنرل حسین محمد ارشاد کو صدر بنانے سے انکار کر دیا۔ اس نے پھر پرانے بدلے چکانے پر کمر باندھی ہے۔ اپنے باپ کے نام پر ادارے، پبل، سڑکیں جہاں جہاں ممکن ہے، اس کا نام لکھا جا رہا ہے۔ شیخ مجیب کے قتل میں ملوث تمام افراد کے وارنٹ جاری کروائے۔ انھیں سزائیں سنائی جا رہی ہیں۔ میرے سر پر بھی ۱۰۰۰۰۰ روڈار کی ہینڈز لگی رہی ہے۔

ٹرانسپیری انٹرنیشنل نے ۲۰۱۲ء تک ڈبجیل بنگلہ دیش کے خواب دکھانے والی حسینہ کے بنگلہ دیش کو دنیا کا کرپٹ ترین ملک قرار دیا ہے۔ خود حسینہ پر بنگلہ دیش کے بزنس مین نکل اسلام فاروقی سے پاور پلانٹ لگانے کی منظوری دینے کے لیے ۳۳۱۰۰۰ روڈالر (۳۰ ملین ٹک) کی رشوت لینے کا کیس عدالت میں ہے۔

رات بھگ رہی تھی۔ ملاقات جاری تھی۔ پاکستان سے فرار ہونے کی سبھی چیز کھانی، کس گس نے کہاں اور کیسے مدد کی۔ کیسے کونڈے سے آکر بارون آباد سے بھارت کی سرزمین پر قدم رکھا۔ شیخ مجیب کے ہاتھوں برطانی سے جنرل ضیاء الرحمن کے طویل دور حکومت میں اعزازات اور خدمات، تصوف کی طرف رجحان اور دنیا کی ہر اچھی کتاب کے پڑھنے کا جنون تفتی بی اور باتیں ہوئیں مگر ان کا تذکرہ پھر سب سے اتنا ضرور ہے کہ زمین اور زبان کے مسئلے پر دشمن بننے، دشمن کا ساتھ دینے اور پھر اپنے ہم زبانوں کے ظلم و ستم کا شکار بننے کا لہرہ سیکھنے اور برسوں بعد اپنی غلطیوں پر سوچنے کا موقع تو ضرور دیتا ہے۔

اس کی پارٹی کو شرمناک شکست سے دوچار کیا۔ اب وہ دوبارہ حکمران ہے اور اسی انتقامی سیاست پر کاربند ہے۔

س: حسینہ شیخ کی سیاسی سوجھ بوجھ کے حوالے سے آپ کے تحفظات ہیں مگر ۷۵ء میں اپنی پوری ٹیم کی ہمدردی کے بعد ۸۱ء تک ہندوستان میں جلاوطن رہنے کے بعد بنگلہ دیش مانگے تھے۔ پھر وہ اپنی موجودہ جارج حکمت عملی تک کیسے واپس پرہے۔ کچھنی کہ سب پرانے کیس کھول دیے گئے ہیں، سزاؤں کے استثنیٰ ختم کر دیا گیا ہے۔

ج: ۷۲ء اور ۷۵ء کے درمیان عوامی بکسال حکومت کے گلے ہی سال ۸۲ء میں جنرل حسین محمد ارشاد نے جرائم اس قدر زیادہ تھے کہ عوامی لیگ (بی اے ایل) نے ریش لاء لگا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ۸۳ء میں حسین واجد پوری چالاکی سے کام لیتے ہوئے ۹۶ء کے انتخابات میں اپنے ۱۵ پارٹیوں کے اتحاد کے ساتھ جنرل ارشاد کے منشور میں اس ”قومی انقلاب اور یوم بچہتی“ کا کوئی ذکر نہیں ملا مہم کا آغاز کیا۔ کبھی گرفتار اور کبھی رہائی کے ساتھ کیا۔ ۹۶ء میں حسین واجد اکثریت نہ پاسکی۔ پھر جنرل ۸۱ء میں اس نے خالدہ ضیاء کے ساتھ مل کر فوج کے ارشاد کے ساتھ معاہدے کیے اور عوامی لیگ نے جاتیو پارلیمان جدوجہد کی۔ ۹۰ء میں بالآخر ۸ پارٹیوں کے اتحاد کے ساتھ اتحاد کیا۔ جنرل ارشاد کو رہا کیا جو خالدہ دور میں سالانہ جنرل ارشاد کے خلاف کامیابی حاصل کر لی۔ بی این بی گئی سزا بھگت رہے تھے۔

۲۱ سال کے بعد حسینہ شیخ نے اقتدار میں آتے ذائقہ بھجوا دیے۔ اس نے جنرل اے ایس ایم سیم کی ۹۶ء حجاب اور بیج کو پھینک دیا اور اس کے ساتھی اپنے اصل رنگ کی گئی بغاوت کو سپورٹ کیا اور پاور میں آتے ہی میں واپس آ گئے۔ انھوں نے پہلا حکم فوجی انقلاب اور یوم بچہتی کو معمول کی ریٹائرمنٹ دے دی جب کہ بچہتی کو آئندہ حکومتی سطح پر نہ منانے کا دیا۔ آئین ۷۹ء کے پہلے برطرف کیا گیا تھا۔ حسینہ واجد نے ۲۰۰۷ء میں سزاؤں کے استثنیٰ کا قانون نکال دیا اور ۱۵ اگست اور ۷ نومبر میں یوم بچہتی کی ملٹری کو، کی حمایت ہی نہیں کی، اسے کے ہیروز کو گرفتار کر لیا۔ ”محبوب قتل“ اور ”بیل قتل“ کے ہونی تحفظ کا وعدہ بھی کیا اور پھر جنرل حسین ارشاد کی پارٹی سے دو بڑے مقدمات کا آغاز کیا۔ شیخ مجیب کی بیٹی نے اتحاد کر کے حکومت حاصل کر لی اور جنرل ارشاد کو صدر ۹۶ء سے ۲۰۰۱ء کے ۲۵ سالہ دور میں اپنی پارٹی کے خوفناک کیا۔ اس نے جنرل معین کو بھی صدر بنایا۔ اس نے ماضی کو پھر سے تازہ کر دیا۔ وہ پہلے سے زیادہ ظالم اور انتہا پسند بن گیا۔ ملٹری سروسز میں پروموت کیا۔ چکی تھی۔ عوام نے پریشانی اور غصے میں ۲۰۰۱ء کے الیکشن میں ۲۰ کے پارلیمانی انتخابات میں اسے کیئر ٹیکر حکومت کی

ٹینڈر نوٹس

محکمہ لوکل گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ ضلع گجرات کے منظور شدہ مفید اداران جنہوں نے موجودہ مالی سال (2012-13) کیلئے رجسٹریشن / تصدیق کروائی ہے اس سے مارکیٹ ریٹ پر درج ذیل کاموں کے لیے MRS BI-ANNUAL PERIOD 1st AUG 2012 TO 31st JAN 2013 سے کم یا زیادہ مفید کاموں پر مہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ ٹینڈر رفاہ امور مورخہ 2012-2012-10 کو دفتری اوقات کار تک جاری کئے جائیں گے اور مورخہ 2012-2012-11 کو بوقت 1 بجے تک وصول کر سکتے ہیں۔ منظور شدہ کمپنی / موجودہ مفید اداران یا ان کے نمائندگان کی موجودگی میں 2 بجے تک کھلے جائیں گے۔ کسی وجہ سے ٹینڈر بند / مقررہ تاریخ کو جاری / وصول نہ ہو سکے تو مورخہ 2012-2012-15 کو جاری اور مورخہ 2012-2012-17 کو وصول کر کے کھلے جائیں گے۔ تجزیہ جات کی تصریحات و دیگر تفصیلات دفتری اوقات کار کے دوران دفتر اسسٹنٹ انجینئر یا گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ گجرات سے ملاحد کی جاسکتی ہیں۔

شرائط: (i) ٹینڈر کے ساتھ شہرت رجسٹریشن / مطلوبہ زر ضمانت 2% کا ڈیپازٹ تمام اسسٹنٹ انجینئر لوکل گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ گجرات میں جو کہ بھی شیڈول نمک کی ہوائی کرنی ہوگی۔ بغیر / کم زر ضمانت والا ٹینڈر وصول نہ کیا جائے گا۔

(ii) منسلک اسٹروڈ اینڈ ریڈ ڈاک پیسے کے ٹینڈر قابل قبول نہ ہونگے۔

(iii) 4.99 فی صد سے زائد کم ریٹ دہندہ مفید ادارہ کو بولی کی رقم کے برابر بطور پرفارمنس سیکورٹی جمع کروانا ہوگی۔ عدم تعمیل کی صورت میں 2% CDR جمن کی کر لی جائے گی اور مفید ادارہ کے نام سے کنسل کر دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں گورنمنٹ کے تمام مروجہ قوانین بھی نافذ العمل ہونگے۔

(iv) زیر تصدیق کوئی حاصل ہوگا کہ بغیر وجہ بتائے کوئی ایک یا تمام ٹینڈرز منسوخ کر دے۔

(v) ان منصوبہ جات کی ایڈمنسٹریشن پر دو سالہ ٹینڈر نمبری 7(30)DDC/GRT/2012 مورخہ 19-11-2012 کو ہوئی ہے۔

(vi) اس ٹینڈر نوٹس میں منسلک منصوبہ جات کے اسٹیٹس کی فنی منظوری متعلقہ 1st AUG 2012 TO 31st JAN 2013 BI-ANNUAL PERIOD سے تحت ہوئی ہے۔

نوٹ: صرف ٹینڈر رفاہ کی چھپائی کی فیس ادا کرنے کے بعد بلا معاوضہ ٹینڈر رفاہ دفتر اسسٹنٹ انجینئر لوکل گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ گجرات اور لوکل گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ آف پنجاب کی ویب سائٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈسٹرکٹ ڈویلپمنٹ پروگرام برائے سال 2012-13 حلقہ پی 111

نمبر شرا	تفصیل کام	تخمین لاگت (لاکھوں میں)	زر ضمانت (فراہم میں)	میدان کام	ٹی ٹی سی نمبر / LGTS/GRT
1.	تعمیر گلیاں دہالیاں یونین کونسل نمبر 45 گجرات ٹی۔ "تعمیر گلی جامع مسجد چھتری محلہ مسلم پورہ زردار چوک" "امانت دانی والی محلہ مسلم پورہ" "مرزا عثمان بیگ والی محلہ مسلم پورہ" "قاری محمد فضل امام مسجد محلہ مسلم پورہ" "قلم حسین والی محلہ مسلم پورہ" "کاشف بٹ والی محلہ قدرت آباد" "مٹیاں والی اور منیرہ والی محلہ قدرت آباد"	24,00,000/-	48,000/-	برطانیہ ورک آؤڈر	41-11-2012

2.	تعمیر گلیاں دہالیاں یونین کونسل نمبر 46 گجرات ٹی۔ "تعمیر گلی جنازہ گوالی محلہ غیاث پورہ" "گلی نمبر 4 راجہ ارشد والی محلہ فیروز آباد" "گلی نمبر 6 پنڈاریاں والی محلہ خالدا آباد" "مسجد فاروق والی آبی عثمان پورہ" "مفضل چیلوان والی محلہ غیاث پورہ" "عمر اکرم والی دینی روڈ محلہ غیاث پورہ" "رشید فونی والی سے مین گلینڈ پورہ محلہ عثمان پورہ" "گلی نمبر 2 اختر والی سراج کالونی"	20,69,000/-	41,380/-	//	//
3.	تعمیر گلیاں دہالیاں یونین کونسل نمبر 46 گجرات ٹی۔ "تعمیر گلی نمبر 6 غوث اعظم روڈ محلہ خالدا آباد" "جامع مسجد بلال والی مین سراج کالونی روڈ" "حبیب ستار والی نمک مین سراج کالونی روڈ" "گلی نمبر 8 غوث اعظم روڈ محلہ خالدا آباد" "گلی نمبر 2 چاچی نمبر 3 غوث اعظم روڈ محلہ خالدا آباد" "گلی محبوب الہی بٹ والی (سائیں گلوان) غوث اعظم روڈ اور تعمیر پٹی گلی نمبر 5 کے سامنے محلہ خالدا آباد۔"	21,13,000/-	42,260/-	//	//
4.	تعمیر گلیاں دہالیاں یونین کونسل نمبر 47 گجرات ٹی۔ "تعمیر گلی مسلم لڑکوں والی نزد (چوگی والی مسجد گورہ ماروڈ محلہ قدرت آباد" "ذکا مہدی والی (حسین جت والی) محلہ طارق آباد چوکل" "گلی حاجی مرزا احمد ریس والی (حاجی مشتاق) محلہ خرمیا آباد نزد میلے لائن چوکل" "گلی نمبر 1 حاجی یونس والی محلہ مین آباد" "گلی ڈیرہ کجھی بابا اکبر والی اٹھان کالونی" "عمران چوہان والی محلہ مین آباد" "گلی دہالیاں اور سہ ڈیرہ انصاریاں نزد قبرستان گلی گوریاں"	20,49,000/-	40,980/-	//	//
5.	تعمیر گلیاں دہالیاں یونین کونسل نمبر 48, 54 & 58 گجرات ٹی۔ "تعمیر گلی مولوی کھیل والی محلہ سلطان پورہ UC-48" "چیمبر سٹریٹ نزد یوان خاص ہوسٹل جی ٹی روڈ گجرات UC-48" "گلی مولوی عظیم والی محقق گلی ارشد مہدی والی محلہ سلطان پورہ UC-48" "علی سٹریٹ اور محلہ اکرم کریم آباد نزد والی ایک سائڈ سائیں کالج محلہ سلطان پورہ UC-48" "بھجوانا اور سبالی پاپ لائن گلی نمبر 2 منٹور میر والی محلہ غریب پورہ UC-54" "گلی حاجی خالد محمد والی محلہ حسن پورہ UC-54" "گلی بیٹھ مسعود والی اور ذوالفقار محمد والی نزد سٹیشن سٹریٹ محلہ گچھور UC-58"	22,67,000/-	45,340/-	//	//
6.	تعمیر گلیاں دہالیاں یونین کونسل نمبر 49 گجرات ٹی۔ "تعمیر گلی فیصل بٹ والی محلہ چا کوٹے والا" "انور پاشی والی محلہ چا کوٹے والا" "ملک فضل والی نانا پور پٹے نزد ذوالشریف پارک "انور بٹ والی محلہ نور پور پٹے میرال صاحب روڈ" "عزیز احمد والی محلہ نور پور پٹے میرال صاحب روڈ" "مسجد بلال والی جنازہ رشتہ کار کالونی نزد میلے لائن"	20,54,000/-	41,080/-	//	//

چشم کشاں پورٹ

ہمارے ہاں انرجی ڈرنکس کی خرید و فروخت
میں سات سو گنا اضافہ کیا ہوگا لگے گا؟

انرجی ڈرنکس یا موت کے پیامبر

ان مشروبات کے استعمال سے لوگ ذیابیطس کے مریض بن رہے ہیں

کلیم اللہ فاروقی



7.	تقریریں دہلیاں یونین کونسل نمبر (B) 49 گجرات ٹی۔ "تقریر گلی ملک اسلام والی محلہ قاسم پورہ" "فرنگی مارکٹ والی عزیز چوک محلہ قاسم پورہ" "بابہ نیارہ والی میراں صاحب روڈ" "جامع مسجد اقصیہ والی بلہاٹل گرین ٹاؤن شادیوال روڈ" "حاجی اعجاز والی خطہ آخر شاہ کالونی شادیوال روڈ" "ابوبکر صدیق والی نزدیکی مسجد شادیوال روڈ"	40,100/-	20,05,000/-	//	//
8.	تقریریں دہلیاں یونین کونسل نمبر (C) 49 گجرات ٹی۔ "تقریر مارہاٹل نور پور پٹے تانیا تقریر شدہ مارہاٹل نور پورستان میراں صاحب" "نالا" گلی محلہ پٹے کھولے چایا حصہ"	40,440/-	20,22,000/-	//	XEN/TS/CDM/GRT Dt. 20-11-2012
9.	تقریریں دہلیاں یونین کونسل نمبر 53 & 49 گجرات ٹی۔ "تقریر گلی چوہدری بشیر پٹوالی نزدیکی شریف پارک UC-49" "دوسرا شادیوال کریم سٹریٹ محلہ قاسم پورہ UC-49" "زادہ اسلام والی میراں صاحب روڈ محلہ قاسم پورہ UC-49" "گلی ارشد قبرستان میراں صاحب UC-49" "اسد والی عبداللہ سٹریٹ الٹیما کالونی محلہ مسلم ٹاؤن UC-53" "ظہیر حسین والی (راہب حسن چوک) بابا غبار UC-53"	40,900/-	20,45,000/-	//	SE/LG/TS/GRT Dt. 20-11-2012
10.	تقریریں دہلیاں یونین کونسل نمبر 53 گجرات ٹی۔ "تقریر گلی نالہ میراہ مسلم آباد روڈ تاجپال پورہ شہاں روڈ اور ملحقہ گلی نمبر 3"	43,280/-	21,64,000/-	//	XEN/TS/CDM/GRT Dt. 20-11-2012

استغفر اللہ

لوکل گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ گجرات
برائے ایگزیکٹو انجینئر لوکل گورنمنٹ مرکل گجرات

IPL # 15391

گزشتہ

دونوں میری لینڈ کی رہائشی خاتون
وینڈی کراسلینڈ نے مونسٹر
انرجی کے خلاف مقدمہ دائر کیا
ہے کہ اس کی ۱۲ سالہ بیٹی

انہیں فوراً صحت کی موت مونسٹر انرجی ڈرنک سے ہوئی
تھی۔ انکس نے ۲۳ مارچ (۱۰ مئی لیٹر) مشروب پیا تھا
جس میں ۲۴۰ ملی گرام کئفین تھی جو کہ نئے اسٹینڈرڈز میں
مذکورہ مقدار سے ۶۰ ملی گرام زیادہ تھی۔ نتیجتاً FDA نے ۴
دوسری اموات جن کا تعلق بھی مونسٹر انرجی ڈرنک سے تھا،
کے متعلق تحقیقات شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی مونسٹر
انرجی ڈرنک جس کے شہیر کی قیمت گذشتہ دو برس کے دوران
دوگنی ہو چکی تھی کی فروخت صرف ۲۳ گھنٹے کے اندر اندر
فیسدم ہوئی۔

۲۰۰۰ء سے انرجی ڈرنکس کی فروخت میں ۷۰۰ فیصد
اضافہ ہوا ہے۔ مونسٹر کا خوبصورت لوگو، پرکشش سلوگینز کے
ساتھ اشتہارات لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے کافی تھے۔
۲۰۱۱ء میں مونسٹر ڈرنک مارکیٹ کا ۳۵ فیصد شہیر رکھتا تھا اور
ریڈ بل کے ۳۰ فیصد مارکیٹ شہیر کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا
تھا۔ راک اشار کا مارکیٹ شہیر ۱۹ فیصد تھا۔ لیکن اس واقعے کے
نتیجے میں کینیڈین حکومت نے قوانین کے تحت اس مشروب کی
فروخت پر پابندی لگا رہی ہے۔ یہی نہیں ایسے مشروب جن
سے صحت پر مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں ان کے متعلق اور
انہیں بنانے والی کمپنیوں کے متعلق ڈیٹا جمع کیا جا رہا
ہے۔ ۲۰۰۹ء تک مونسٹر انرجی کے استعمال کے نتیجے میں
۵ اموات سامنے آچکی ہیں۔ مونسٹر انرجی کے نمائندے کے
مطابق صرف ایک موت کا انہیں علم ہے۔ وہ یہ ماننے کو تیار
نہیں کہ ان کا مشروب موت کا باعث ہوا ہے۔ اسی طرح
سنٹرل واشنگٹن یونیورسٹی کے ۹ طلبہ ایک پارٹی میں
فور لکوف (Four Lokof) پینے کے نتیجے میں ہسپتال پہنچ
گئے۔ ۱۸ سالہ ڈکونا سیلر بڑے سائز کے دو انرجی کین
استعمال کرنے کی وجہ سے بعد ۵ دن تک ہسپتال میں
رہا۔ ایک اور ۱۸ سالہ آئرش اٹھلیٹ Ross Conney

باسکٹ بال گیم کے چند گھنٹے بعد موت کا شکار ہوا۔ اس
نے ریڈ بل کے ۴ کین استعمال کئے تھے۔ فرانس نے اس
واقعے کے بعد اس مشروب کی فروخت پر پابندی عائد
کر دی۔ جسے ۲۰۰۰ء میں مقدمے کے بعد بحال کیا گیا۔

یہ سوال بھی اٹھایا جا رہا ہے کہ مشروب بنانے والی
کمپنیاں ایسی رپورٹس موصول ہونے کے بعد کوئی عملی
اقدامات کر رہی ہیں یا نہیں اور یہ جاننے کی کوشش کر رہی ہیں
کہ واقعی ان کی پراڈکٹ محفوظ ہے یا نہیں؟

یو ایس سیٹائنس ایبوز اینڈ مینٹل ہیلتھ ایڈمنسٹریشن کے
تحت میوکلینک کے شریک مصنف بکھر کے مطابق ۲۰۰ ملی
گرام استعمال کرنے والے افراد میں اس مشروب کے
استعمال سے رد عمل سامنے آیا ہے۔ کئفین والے مشروب
سے کم از کم چار اموات ہو چکی ہیں۔ بچے ان مشروبات
کے استعمال سے فتنہ انگیزی پر اثر آتے ہیں۔ سنٹر فار
سائنس اینڈ پبلک انٹریسٹ کی اسٹڈی کے مطابق یہ
مشروبات بچوں کو hyperactivity کا شکار بناتے
ہیں۔ نیویارک ٹائمز میں گریٹن رینالڈز کی ایک رپورٹ
کے مطابق کئفین اور الکحل سے بھرے انرجی ڈرنک فور لوکو
کی تیاری اور فروخت فوری طور پر ممنوع قرار دی گئی ہے۔
۲۰۱۱ء میں ہیلتھ جرنل آف پیڈیاٹرکس نے ”بچوں،
بالغوں، اور نوجوانوں پر انرجی مشروبات کے اثرات“ کے

ایرجی میں پہنچنے والے کیس

۲۰۰۵ء میں امریکہ میں قومی سطح پر انرجی ڈرنکس
کے استعمال کے نتیجے میں ایرجی میں پہنچنے والے
کل ۱۱۲۸ کیسز تھے جبکہ ۲۰۰۹ء میں یہ تعداد ۱۳۱۲۲ تک
جا پہنچی۔ جو کہ ۲۰۰۵ء کے مقابلے میں ۱۰ گنا زیادہ
تھی۔ اکتوبر سے دسمبر ۲۰۱۱ء میں ۶۷۷ کیس سامنے
آئے۔ اس سال ابھی تک ۳۳۱ کیس اوور ڈوز اور سائیڈ
ایفکٹس کے سامنے آچکے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اب
FDA پر مناسب قوانین بنانے کے لیے دباؤ بڑھ رہا ہے۔

حیران کن انکشاف:

بھارت میں پیپسی اور کوکا کولا کو بطور کیڑے مار دوا استعمال کیا گیا۔ چنانچہ چند ریاستوں میں ان کی فروخت پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ ایسی ہی وجوہات کی بنا پر اور لوگوں کی awareness کی وجہ سے امریکہ میں ان مشروبات کا استعمال کم ہوتا شروع ہوا تو مشروبات بنانے والی کمپنیوں نے شمالی افریقہ، مشرق وسطیٰ، اور جنوبی ایشیاء کو ٹارگٹ کرنے کے لئے اداکاروں، اداکاروں، اور کھلاڑیوں کا سہارا لیا۔ ان مشروبات کے تبادلے کے طور پر مغربی دنیا اب معدنی پانی کے علاوہ پیپسی نے Kurkure اور Aquafina کوکا کولا Kinley اور Minute Made جیسے برانڈ متعارف کرائے تاکہ آمدنی میں کمی نہ ہونے پائے۔

عنوان سے ایک ڈراؤنی رپورٹ شائع کی۔ اسی طرح نیشنل کونسل آف اسپورٹس اینڈ فٹنس نے ”نوجوان اور انرجی مشروبات“ کے عنوان سے رپورٹ میں متنبہ کیا کہ بچے اسپورٹس ڈرنک اور انرجی مشروبات کا فرق نہیں سمجھتے۔ حال ہی میں میڈیکل جرنل آف آسٹریلیا نے اپنی چونکا دینے والی رپورٹ میں انکشاف کیا کہ کیفین کے استعمال سے متاثرہ ۲۹۷ افراد کی عمریں اوسطاً ۱۷ سال تھیں۔

طبی ماہرین کہتے ہیں کہ سوفٹ ڈرنکس، اسپورٹس ڈرنکس اور انرجی ڈرنکس اگر صرف ایک ماہ تک مسلسل استعمال کر لئے جائیں تو زندگی بھر رہنے والی بیماریاں اور صحت کے مسائل جنم لے سکتے ہیں۔ ان کے استعمال سے نہ صرف جسم کا اندرونی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، بلکہ ناپ۔ ۲ ڈی این بیٹس، ہڈیوں میں درد کی شکایت اور جلدی تھکن کا شکار ہو کر انسان زندگی بھر کے لئے عذاب میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

امریکی ماہرین نے ریڈ بل، سیانک شوٹر، ریڈ لائن کے متعلق رپورٹوں میں کہا ہے کہ یہ بیماریوں کے اچانک حملے، نظر کی خرابی، دل کے امراض اور گردوں اور جگر کی خرابی کا باعث ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انرجی ڈرنک کیا ہے؟ اور لوگ اسے کیوں استعمال کرتے ہیں؟

ذہنی یا جسمانی توانائی میں فوری اضافہ کرنے والا مشروب جس میں کیفین جیسے محرک کے علاوہ دیگر اجزاء شامل ہوں۔ اگرچہ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ انرجی ڈرنک کا استعمال بھی ورزش سے قبل نیوروسکولر ہم آہنگی کی ابتدا کرنے والے (primer) کے طور پر ہو سکتا ہے۔ لیکن اکثر ماہرین اس کے استعمال کے خلاف ہیں کیونکہ ان میں شکر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

۲۰۰۷ء سے کیفین کے استعمال سے ۵۰۰۰ واقعات سامنے آئے ہیں جن میں ۴۶ فیصد کی عمر ۱۸ سال تھی۔ بعض انرجی مشروبات میں شکر، امانو ایسڈز، میتھائی



زیادہ فروخت ہونے والا مشروب متعارف کرایا۔ اس کی بنیاد ایک تھائی مشروب Krating Daeng تھا جو خود لیوڈان کے نقل تھا۔ ۱۹۹۷ء سے امریکہ میں ریڈ بل کا مارکیٹ شیئر سب سے زیادہ (۴۷ فیصد) تھا۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا میں فرکٹوز بیور تاجر کمپنی نے 'V' کے نام سے بھی ایک مشروب لانچ کیا جو ایس اے بی ملر (SAB Miller) اور مولسن کورز بریوئنگ (Molson) کے نام سے

لیکھیٹھاٹنز (Methylxanthines) (بشمول کیفین)، کاربوئیڈ وائر، ریبا، ایس، اکی (acai)، تارین، جننگ، مالٹو ڈیکسٹریں، انوسٹیل، کارنی ٹائن، کریٹائن، گلوکوریٹون، ایکٹون، جنکو پلو، اور گوارانا یا دیگر نباتاتی مرکبات شامل ہوتے ہیں۔ آغاز میں کوکا کولا کو جس میں کوکا کے پتوں اور کوکاٹنس سے حاصل شدہ کیفین استعمال کی جاتی تھی، انرجی ڈرنک ہی سمجھا جاتا تھا۔

سوفٹ ڈرنک اور بچے

سافٹ ڈرنک استعمال کرنے والے بچے موٹاپے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سوفٹ ڈرنکس میں بھی ایک سے زائد عنصر شامل ہوتے ہیں جن میں فاسفورک اور سائٹرک ایسڈ، ٹارٹرک اور دیگر نامیاتی تیزابی عناصر وائنوں کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ اس لئے امریکن بیورٹیج ایسوسی ایشن ۱۲ سال سے کم عمر کے بچوں کو اپنی تیار کردہ مصنوعات کو فروخت کرنے سے منع کرتی ہے۔ نیز ڈرنکس بنانے والی کمپنیوں کو کہا گیا ہے ڈرنکس کے لیبل پر لکھا ہو کہ بچے، حاملہ عورتیں، نرسنگ کے شعبے سے متعلق خواتین اور ایسے لوگ جو کیفین کے لئے sensitive ہوں، ان مشروبات کو استعمال نہ کریں۔

Coors Brewing) کی جوائنٹ ویچر میکن اور کارپوریشن سے ۱۹۰۶ء میں خرید لیا گیا تھا۔

اسپورٹس مشروبات کا استعمال کیوں؟

گیمپریڈ، پاور ایڈ جیسے مشروبات میں پانی میں نمک، شکر ایسی نسبت کے ساتھ ملایا جاتا ہے کہ جسم اسے جلد جذب کر لیتا ہے۔ پسینے کے ذریعے ضائع ہونے والا نمک اور پانی جلد جسم کو واپس مل جاتا ہے۔ مسلسل کام کرتے رہنے کے لئے عضلات کو شکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ نمک کی ٹھوڑی سی مقدار ہائپوٹینیمیا کے خلاف water intoxication کا کام کرتی ہے۔

ریڈ بل کے چار ڈرنک

آئرش اٹھیلیٹ کی موت کا باعث بن گئے۔

توانائی بخش مشروبات کی تاریخ

برطانیہ میں ۱۹۲۹ء میں لوکوزیڈ (Lucozade) کے نام سے ایک مشروب ہسپتالوں میں مریضوں کی صحت کی بحالی میں مدد دینے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں اسے زائل شدہ توانائی کو بحال کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں امریکہ میں ڈاکٹر ایف (Dr. Enuf) کے نام سے شکاگو کے ایک تاجر ولیم مارک شوارٹز نے اپنے ساتھیوں کی فرمائش پر گئے کے رس، وٹامن بی اور کیفین ملا کر ایک مشروب تیار کیا۔ ۱۹۶۰ء میں جاپان اور ساؤتھ کوریا میں لپو ویٹان (Lipovitan) کے نام سے ملتے جلتے مشروب بازار میں لائے گئے۔ ۱۹۸۵ء میں امریکہ میں جولٹ کولا کے نام سے مشروب تیار ہوا۔ ۱۹۹۵ء میں پیپسی کو (PepsiCo) نے جوسٹ نامی مشروب لانچ کیا لیکن ۱۹۹۹ء اس کی تیاری بند کر دی۔ یورپ میں ایس۔ اسپنٹر کمپنی نے پاور ہاؤس کے نام سے انرجی ڈرنک متعارف کرایا۔ اس سے قبل آسٹریلیا کے انٹرپرائیٹس Dietrich Mateschitz نے دنیا بھر میں سب سے

مشہور انرجی مشروب ریڈ بل کا اہم
تاریخ (taurine) ہے جو کہ سائڈ (بیل) کے پیش
اور جسمی مادے میں پائی جاتی ہے۔ بیل کے چگالی کر
کے نتیجے میں بننے والے تھوک میں بھی تاریخ ہوتی ہے
جسے مصنوعی طریقے سے تیار کیا جاتا ہے۔
واضح رہے کہ ریڈ بل کی ۸۰ ملی لیٹر کی بوتل میں
کیفین کی مقدار کوک کی عام بوتل میں پائی جانے
کیفین کی مقدار سے تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ یو کے
اسٹینڈرڈ انجینی اس مشروب کو جس میں ۱۰۰ گرام
میں ۱۰ گرام شکر ملی ہو "ہائی شکر پراڈکٹ" کا نام د
ہے۔ ریڈ بل کی ۸ اونس کے کین میں ۲۶ گرام
کیتو ریڈ میں ۱۳ گرام شکر موجود ہے۔ ریڈ بل عام
جانے والی غذا سے ۵ گنا زیادہ تاریخ کا حامل ہے۔
بل کے دو کین میں روزانہ غذا میں پائے جانے والے
تاریخ کی مقدار سے ۵۰۰ گنا زیادہ تاریخ
ہے۔ (جگہ کی کمی کے باعث اس کے تمام اجزاء
فہرست نہیں دی جارہی)

میرا تھن کے دوران
لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مشروبات کام میں لگن اور خود
اعتمادی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ ان
میں حیاتین اور کیمیکلز ہوتی ہیں جو بہت قلیل مدت کے
لئے توانائی کا لیول بڑھاتی ہیں۔ ان میں کیفین، ایف
ڈرین، شکر، گوارانا اور جسنگ وغیرہ ملی ہوتی ہیں۔
در اصل اسپورٹس ڈرنکس کے استعمال کا اصل مقصد
کھیل کود میں زائل ہو جانے والی توانائی کی جلد بحالی
ہوتا ہے۔ لہذا اگر اسپورٹس ڈرنک کا استعمال ضروری ہی
سمجھا جائے تو کھیل کے دوران یا بعد میں کیا جائے، نہ
کہ کھیل سے پہلے۔ عموماً اسپورٹس ڈرنکس میں
ایکسٹرا لائینس موجود ہوتے ہیں۔ یوں سوڈیم کی زیادہ
مقدار جسم کو پانی کی نسبت جلد بائیڈریٹ کر کے توانائی
بحال کرنے میں مدد ثابت ہوتی ہے۔ ذہن بیدار
رہتا ہے اور سستی طاری نہیں ہوتی۔ ماہرین کے مطابق
کھیل شروع ہونے کے بعد ۳۵ منٹ تک کسی مشروب
کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ اگر موسم بہت گرم ہو تو جب
پاس اور گرمی بہت زیادہ محسوس ہو تو پانی یا اسپورٹس

۲۔ اس کے استعمال کے نتیجے میں سیریل نیمہ ہو سکتا ہے۔

۳۔ اس میں الکحل کی ملاوٹ سے یہ مشروب

کا بم (death bomb) بن جاتا ہے جو براہ راست جگر حملہ آور ہوتا ہے اور اسے ہمیشہ کے لئے ناکارہ بناتا ہے۔

۴۔ اس میں وٹامن ب-۱۲ ہوتا ہے جو کوہا جانے والے مریضوں کو دیتے ہیں اور اس کے آثار باثریشن excitement پیدا کرتے ہیں

ڈرنک پینے میں حرج نہیں۔ بلکہ پیاس نہ بھی محسوس ہو تو بھی پانی کا استعمال جاری رکھیں۔ لیکن میراتھن دوڑ چو کہ ۲ گھنٹے سے زیادہ دیر تک جاری رہتی ہے، اس میں اٹھلیش کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفے سے چند گھونٹ پانی یا کسی اچھے اسپورٹس ڈرنک کا پینا سودمند ثابت ہوتا ہے۔ میراتھن دوڑ کے راستے میں تقریباً ۸ تک واٹر اسٹیشن ہوتے ہیں۔ اور اکثر اٹھلیش ہر اسٹیشن پر رکے بغیر پانی یا اسپورٹس ڈرنک کا استعمال کرتے ہیں۔



کیفین والے مشروب کم سے کم چار جانیں لے چکے ہیں۔

ریڈبل کی حقیقت اور وارننگ

حقیقت یہ ہے کہ ریڈبل کو ویتنام جنگ میں امریکی سپاہیوں کا مورال بلند رکھنے کے لئے بنایا گیا تھا تاکہ جنگ کے نتیجے میں ذہن پر مرتب ہونے والے منفی اثرات کو کم کیا جائے۔ لیکن اس کے استعمال کے نتیجے میں مختلف سائید ایفیکٹس جیسے مائیگرین دماغی رسولی اور جگر کے امراض پیدا ہوئے۔ اس میں وٹامنز ملا کلوروفوٹو لیکٹون جیسا انتہائی خطرناک کیمیکل استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے فرانس اور ڈنمارک اسے Cocktail of Death (موت کا مشکل مشروب) کا نام دیتے ہیں۔ اسی مشروب کو اب دوسرے اجزاء ملا کر بازار میں لایا گیا ہے جو انتہائی خطرناک اور مضر ہے۔ چنانچہ کیلیفورنیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر خالکا گیارا..... ایم ڈی، یوسی ایل اے کی تحقیق کے نتیجے میں وارننگ دی گئی کہ:

۱۔ اس کے استعمال کے بعد جسمانی مشقت نہ کی جائے۔ کیونکہ دل کی دھڑکن کو تیز کرتا ہے اور اچانک موت کا باعث ہو سکتا ہے۔

انسان نشے کی حالت میں ہو۔

۵۔ اس کا مسلسل استعمال مستقل اور ناقابل علاج اعصابی امراض کا باعث ہو سکتا ہے۔

یہ مشروبات اپنے مردانہ قسم کے ناموں جیسے ریڈبل مونسٹر، روک اسٹار، پیم جوں اور زبردست تشہیر کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کھینچتے ہیں اور ایک تہائی تا بالغ اور نو جوان تشہیر سے متاثر ہو کر بلا وجہ مسلسل انرجی ڈرنک استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ۶ سال سے کم عمر کے بچے بھی استعمال کرتے ہیں جو نہیں جانتے ہوتے کہ کیفین الکحل ملا مشروب رطوبت کو ختم کرتا ہے، صحت تباہ کر ہے۔

انرجی مشروبات کے استعمال پر پابندی ریڈبل کی فروخت پر فرانس میں پابندی لگائی جا

■ مصروفیات
■ مشاغل
■ کارنامے

یارانِ وطن دیارِ غیر میں

ماہِ نو فصل

دیارِ غیر میں مقیم پاکستانیوں کے دل ہر وقت پاکستان کے لیے دھڑکتے رہتے ہیں۔ انہوں نے آج تک پاکستان کو نہیں بھلایا، پاکستان نے بھی اور ہم نے بھی اُن کو ایک لمحہ کے لیے نہیں بھلایا۔ آئیے..... ۲۱ پاکستانیوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ سب سے پہلے سید زہیب احمد سے ملتے ہیں۔ آپ آج کل کینیڈا میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آخر میں ایک جرمن فیملی کی داستان پڑھیں، باپ کی نگاہ میں اسلام صرف گلہ پڑھا دینا ہے، لیکن صرف گلہ کیا کچھ کر سکتا ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۹ سالہ زوہیب اسد

اولیول کے ۲۸ رمضان میں A گرید

اور تمام ۲۸ رمضان میں اے گرید حاصل کر کے ”اولیول“ میں ورلڈ ریکارڈ قائم کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہ ریکارڈ ابراہیم شاہد نے ۲۳ رمضان میں اے گرید حاصل کر کے قائم کیا تھا اور اسے سید زوہیب اسد نے ۲۸ اے گرید حاصل کر کے توڑا ہے۔

سید زوہیب اسد نے اے لیول کے (یونیورسٹی آف

کیونیورسٹی میں زیرِ تعلیم غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ۱۹ سالہ واہ کینٹ پاکستان کے نوجوان سید زوہیب اسد (یونیورسٹی آف کیمبرج انٹرنیشنل Edexcel لندن انٹرنیشنل) بورڈز کے تحت پاس کیا

کینیڈا

انرجی ڈرنک چونکہ ان دنوں فیشن میں ہیں جیسے کی زبان میں ”ان“ کہتے ہیں۔ ایسے میں اندھے کنوڑ نہیں آتے۔ یہ بھی تحقیق و جستجو کے بعد دی گئی وارنٹ ہے۔ امریکہ اور یورپ کی عیرودی کے بغیر سانس نہیں وہاں پابندی کی باتیں ہو رہی ہیں اور ایسی باتیں ہم سننے پڑھتے ہیں۔

ہم نے بڑے بڑے سٹورز کا وزٹ کیا تو رپا کے ڈسپلے فرٹ میں سب سے نمایاں جگہوں پر دیکھنے ان کی فروخت کے اعداد و شمار بھی حیران کن پریشان کن تھے۔ ۲۰۰ سے ۷۰۰ گنا تک اضافہ رپا کیا گیا ہے۔ نوجوانوں کی بڑھتی طلب دیکھ کر گورنر فوڈز بھی اپنا انرجی ڈرنک مارکیٹ میں لے آئی ہے۔ کتنے ہی جعلی انرجی ڈرنکس بھی دستیاب ہیں۔ ہم تو اسی صدے سے نہیں نکل پائے تھے کہ پیپسی جیسی میں ۲۱/۲ چھچھنی کے مقابلے میں ماؤنٹین ڈیو ۱۱ چھچھنی پائی جاتی ہے اور عدالت نے اسے ڈرنک کے زمرے سے نکال کر انرجی ڈرنک میں شامل کرنے کا کہا ہے۔

روپے) سپارک گورمٹ (۲۵۰ ملی لیٹر۔ قیمت: روپے) ۳۰۰ ملی لیٹر۔ قیمت: ۹۰ روپے اسٹنگ ۵۰۰ ملی لیٹر۔ قیمت: ۳۵ روپے)۔ ان مشروبات کے بلا ضرورت چند ماہ تک مسلسل استعمال کی وجہ سے ذیابیطس کے مریض بن چکے ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ حکومت کے ادارے نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ پی سی ایس آر کے حکام سے بار بار رابطہ کرنے پہ جواب ملا ہمارے پاس معلومات ہوں تو نہیں دے سکتے صرف سرکار کو بتاتے ہیں۔ پھر یہ تو اسلام آباد ادارے کا مسئلہ ہے۔ لاہور تو صوبائی حکومت کے کار میں آتا ہے۔ خدا جانے عوام کی صحت کس دائرے میں آتی ہے۔

اتنا اثر نہیں ڈالتا، اور مسلسل استعمال کا کردگی پر مثبت اثرات کا حامل نہیں ہوتا۔ البتہ نفسیاتی اثر قائم رہتا ہے۔ وہاں بھی روک اشار، مونشٹر، ریڈ بل اور ایمپ کے خوبصورت کین اسٹورز پر نظر آتے ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ انھیں اپنی اسپورٹس کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے کوچ انھیں اس کی ترغیب دیتے ہیں۔

شوگر فری ریڈ بل زیادہ نقصان دہ ایک اور تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ تحلیلش جو اس کے عادی تھے ان میں شوگر فری Red Bull جو کہ کھین سے بھری ہوئی تھی، کارکردگی میں اضافہ نہیں کرتی۔ اور یہ پیشاب آور ہوتی ہے، اس لئے نابدیدہ کاری یعنی جسم کی رطوبت کو ختم کرنے (dehydration) کا باعث ہوتی ہے۔ جس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے۔

پاکستان میں اس وقت ۵ کے لگ بھگ انرجی ڈرنکس زیادہ مقبول ہیں۔ ریڈ بل، (۲۵۰ ملی لیٹر۔ قیمت: ۱۵۰



ان سب سے بڑے ہیں۔

سید زوہیب اسد آج کل کینیڈا کی یونیورسٹی میک گل میں زیر تعلیم ہیں اور انکسٹنٹ انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ میں ڈبل میجر زکر رہے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ انہیں اپنے ملک پاکستان سے بے انتہا محبت ہے اور وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد اپنے ملک کی معیشت کی بہتری کے لیے کام کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ اپنی ان کامیابیوں کو اپنے والدین کی دعاؤں اور اپنے اساتذہ کرام کی محنت کا صلہ قرار دیتے ہیں۔

زوہیب نے بتایا کہ ان کو کرکٹ بہت پسند ہے۔ چاہے وہ کسی بھی ٹیم کا ہو وہ اسے ضرور دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے سکول کی فٹ بال ٹیم کے کپتان اور سکول کے ہیڈ بوائے بھی رہ چکے ہیں۔

زوہیب کا کہنا تھا کہ ہم طالب علموں کو چاہیے کہ ہم صرف ریکارڈ بنانے کے لیے ہی نہیں بلکہ ملک کی ترقی اور اپنا پرچم دنیا میں سر بلند رکھنے کے لیے محنت کریں۔

پاکستان کے روشن مستقبل سے پُر امید ہیں اور ان کے خیال میں اگر محنت اور ایمانداری کو اپنا طریقہ بنالیا جائے تو پاکستان کی ترقی میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی ہے۔ ہم میں سے ہر نوجوان کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے دنیا کو ثابت کر کے دکھانا ہے کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں۔

زوہیب نے اسلام آباد میں Human & Social Biology میں ٹاپ کیا اور ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے جنرل پیپر میں کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے پورے اسلام آباد میں ٹاپ کیا۔ زوہیب کا کہنا ہے ”محنت کامیابی کی علامت ہے۔ اگر انسان نیک نیتی، جذبہ اور سچی لگن سے کوئی کام کرے تو اللہ تعالیٰ اسے محنت کا اجر ضرور دیتا ہے اور کامیابیاں انسان کے قدم چومتی ہیں۔“

زوہیب کے مطابق انسان کو غرور ہرگز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنی کامیابیوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ زوہیب اپنے ملک کے نظام تعلیم سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے مطابق ہر بچے کو تعلیم کے یکساں مواقع ملنے چاہئیں تاکہ ہر بچے کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آسکیں۔ اس کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں کو بھی اہمیت دینی چاہیے۔ زوہیب اسد نے نا صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کا نام فخر سے بلند کر دیا۔

Mc Gill University کے پرنسپل نے زوہیب کے نام ایک آگاہی خط لکھا جس میں انہوں نے زوہیب کو ۲۸ مارچ گریڈ لے کر ”اولیول“ میں ورلڈ ریکارڈ بنانے پر مبارکباد دی اور ان کو یونیورسٹی کا حصہ بننے پر خوشی کا اظہار کیا۔ The Mc Gill Tribune کی ایک رپورٹ میں زوہیب کو خراج تحسین پیش کیا گیا اور سراہا گیا۔ سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی طرف سے سید زوہیب اسد کو خراج تحسین پیش کیا گیا اور ایوارڈ دیا گیا۔ اس موقع پر زوہیب کی دونوں بہنیں اور بھائی سلمان حیدر اور والدین کو بھی پرامن منسٹر ہاؤس میں مدعو کیا گیا تھا۔

زوہیب کا کہنا ہے کہ ان کے والد ڈاکٹر اسد علی نے محنت اور لگن سے کام کیا اور ہمیں اس مقام تک پہنچایا۔ زوہیب کے والدین کا کہنا ہے ”اللہ کا بے حد شکر ہے کہ ہمارے بیٹے کو اس کامیابی سے نوازا اور دنیا میں زوہیب کے نام کو ہماری پہچان بنادیا۔“

زوہیب کے نانا سید شوکت علی شیرازی اور تمام اہل خاندان زوہیب کی اس کامیابی پر بے حد خوش ہیں۔ زوہیب کے والدین زوہیب کے اساتذہ کے مشکور اور اس کی کامیابی کو ان کی محنت اور دعاؤں کا ثمر قرار دیتے ہیں۔ یہ زوہیب اسد جیسے بچے ہمارا روشن مستقبل ہیں۔ یہ جہد مسلسل اور لگن سے کام کرنے والے نوجوان ہیں، جن کے لیے اقبال کا پیغام تھا۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

زوہیب کی والدہ کا کہنا ہے۔

ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدا پر ہو
طلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

زوہیب کہتے ہیں کہ وہ اس پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔

جرمنی کے مرزا بشارت حسین

وگھری ٹاپ کے پاکستانی

عطاء الحق قاسمی اپنے دورہ جرمنی کی روداد میں لکھتے ہیں: برلن میں میری ملاقات ایک ”وگھری ٹاپ“ کے پاکستانی سے بھی ہوئی۔ ان کا نام مرزا بشارت حسین ہے۔ سچی بات پوچھیں تو ان کی شخصیت ایک پورے خاکے کی شقیں ہے، تاہم اس کی ایک جھلک دکھانے کے بعد میں آپ کو وہ حیرت انگیز واقعہ سنانے میں دلچسپی رکھتا ہوں جو ان کی ۱۹ سالہ بیٹی یاسمین کے ساتھ پیش آیا۔ اس سے



حافظ جالندھری

انھیں اپنی ذات، اشعار اور اختیار کا بہت پاس تھا
 ”شاہنامہ اسلام“ اور ”قومی ترانے“ کے خالق مت از شاعر
 کی زندگی کے چند دلچسپ واقعات

جیمیل یوسف

وہ اپنی
 خوبصورت
 شاعری،
 ترنم کے
 ساتھ ساتھ
 بے باکی،
 خود سری
 اور
 صاف گوئی
 کے لیے
 بہت
 مشہور تھے



طالبات میں مرزا صاحب کی بیٹی یاسمین کا نام بھی شامل تھا۔ اسرائیل کے دورے کے دوران انھیں مسجد اقصیٰ بھی لے جایا گیا۔ جب وہاں سے واپس جانے لگے تو یاسمین نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور کہا وہ یہاں سے نہیں جائے گی۔ اس کی ٹیچر نے اسے بہت سمجھایا لیکن جب وہ نہ مانی تو اس کے والد مرزا صاحب کو فون کیا گیا۔ مرزا صاحب نے بھی ہر ممکن طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر دوسری طرف سے ٹیچیوں میں جواب ملا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے ٹیچر سے کہا کہ وہ اسے مسجد اقصیٰ ہی میں چھوڑ جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، وہ بچی ۳۲ دن مسجد میں رہی اور جب واپس برلن پہنچی تو اپنے والد سے کہا کہ اسے کچھ پیسے چاہیے۔ اس نے جتنے پیسے مانگے مرزا صاحب نے اسے دے دیے۔ وہ بازار گئی اور اسے کافے خرید لائی۔ اس دن کے بعد سے آج تک اس نے مغربی طرز زندگی کو خیر باد کہہ دیا ہے اور نہ صرف یہ کہ خالص اسلامی طرز زندگی اختیار کر چکی بلکہ اپنی چار پانچ جرمن سہیلیوں کو مشرف بہ اسلام بھی کر چکی ہے۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا میں نہیں جانتا، یہ روحانی دنیا کا اسرار ہے اور ان مجیدوں سے میں واقف نہیں ہوں۔

پہلے مرزا صاحب کے بارے میں یہ جان لیں کہ اس وقت ان کی عمر ۵۸ سال ہے۔ دو، چار جرمن خواتین سے شادی کر کے انھیں چھوڑ چکے ہیں، جبکہ ان کا کہنا ہے کہ جرمن بیویاں بہت وفادار ہوتی ہیں۔ میں نے مرزا صاحب سے پوچھا ”ان دنوں آپ جس خاتون کے ساتھ رہ رہے ہیں کیا میں سمجھوں کہ یہ آپ کی آخری بیوی ہے؟“ بے ساختہ بولے ”اللہ نہ کرے“ میں نے ابھی جس واقعہ کا حوالہ دیا ہے اس کے بیان سے پہلے یہ پس منظر بتانا ضروری ہے کہ مرزا صاحب ۱۹۷۵ء میں منڈی بہاء الدین سے ترک وطن کر کے جرمنی میں آباد ہو گئے تھے اور یوں اب ان کے طور اطوار مکمل طور پر جرمن ہیں۔ چنانچہ ان کے بقول انہوں نے اپنے بچوں کو صرف کلمہ پڑھایا اور اس کے بعد انھیں آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جو بننا چاہیں بن سکتے ہیں۔ اس آزادانہ فکر کے ماحول میں ان کے بچے پروان چڑھے اور مکمل طور پر جرمن سوسائٹی کا حصہ بن گئے۔ ایک مرتبہ ان کی بچی کے سکول والوں نے ۲۰ طلبہ و طالبات کو اسرائیل بھیجنے کا فیصلہ کیا، جن کے متعلق ان کی رپورٹ تھی کہ وہ یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں، تا کہ اس دورے سے ان کے دلوں سے یہودیوں کی نفرت ختم کی جاسکے۔ ان طلبہ و

صاحب کسی کے رعب اور دبدبے میں ہرگز نہیں آتے تھے اور نہ ہی کسی پر چوٹ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیتے۔ سب بڑے بڑوں کو ڈانٹ پلا دیتے۔ سید ضمیر جعفری اور عزیز ملک نے جو حفیظ کے بہت قریب رہے ہیں، مجھے کئی واقعات سنائے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی کو اپنے سے بڑا نہ سمجھتے۔ کسی کی قصیدہ گوئی اور خوشامد کرنا تو درکنار وہ کسی سے جھک کر ملنا بھی کسر شان سمجھتے۔ چاہے کوئی بہت بڑا سرکاری افسر ہو یا کوئی وزیر، وہ اپنا مقام و مرتبہ اس سے اوپر ہی سمجھتے اور اسی کے مطابق گفتگو کرتے۔ البتہ چھوٹوں سے ان کا رویہ محبت اور شفقت والا ہوتا اور عام آدمی سے برابر کی سطح پر بات کرتے۔

کس میں جرات تھی جو وزرا سے کرسیاں خالی کرواتا

جب خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل تھے تو حیدر آباد میں گل پاکستان مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت خواجہ ناظم الدین صاحب نے کرنی تھی۔ سید ضمیر جعفری راوی ہیں کہ مشاعرہ گاہ میں جانے سے قبل سبھی شاعر دوسرے ہال میں عشائیے کی دعوت میں جمع تھے۔ کھانے کے بعد سبز قبوے کا دور چلا۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ گورنر جنرل تشریف لایا جاتے ہیں۔ شعرائے کرام سے درخواست کی گئی کہ مشاعرہ گاہ میں تشریف لے جا کر اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ جب شعراء جناب حفیظ جالندھری کی قیادت میں مشاعرہ ہال میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جو کرسیاں سٹیج پر شعرائے کرام کے لیے

رکھی گئی ہیں، ان پر وزرائے کرام اور دوسرے سربراہان و معززین براجمان ہیں۔ صدر مشاعرہ کی کرسی کے علاوہ اور کوئی خالی نہیں۔

شعراء تو سٹیج کے قریب پہنچ کر رک گئے مگر حفیظ سیدھے اوپر چلے اور شعراء کی نشستوں پر قابض وزرائے کرام سے ”باوازل بلند فرمایا“ جناب! یہ کرسیاں خالی کر کے سٹیج سے پیچھے تشریف لے جائیں۔“ وہ پہلے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جب حفیظ صاحب نے اپنا مطالبہ دہرایا اور اس اثنا میں کچھ اور شاعر بھی حفیظ صاحب کی اقتدا میں سٹیج پر چلے گئے تو ان حضرات کو اٹھنے ہی پڑی۔ نیچے ہال میں بھی کوئی نشست خالی نہ تھی۔ خیر منتظمین نے دوڑ بھاگ کر کے پہلی قطار کے آگے ایک اور صف لگا لی۔ ابھی یہ اکھاڑ بچھاڑ جاری ہی تھی کہ صدر مشاعرہ جناب خواجہ ناظم الدین شریف لے آئے۔ اس اثنا میں شعرائے کرام اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ سید ضمیر جعفری بتاتے ہیں کہ حفیظ صاحب نے سٹیج پر وزرائے کرام کو عالی جاہ یا سرچشمے الفاظ سے خطاب نہیں کیا اور نہ انھیں ہتے سکراتے ہوئے جھک کر سلام کہا۔ اگر وہ کرسیاں خالی نہ کرواتے تو منتظمین مشاعرہ میں سے کسی کی اتنی جرات نہ تھی جو وزیروں کو جا کر کہتا کہ کرسیاں خالی کر دیں اور پھر اس پر فوری عمل بھی کرواتا۔ منتظمین میں ہمت اور سلیقہ ہوتا تو وہ پہلے ہی کسی کو سٹیج پر نہ بیٹھنے دیتے اور وزراء کے لیے نیچے پہلی صف میں نشستیں خالی رکھتے۔

کس حکیم نے مشاعرے میں آنے کا کہا تھا؟

ستمبر ۱۹۶۸ء میں چٹاگانگ میں ایک کل پاکستان مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ میں ان دنوں چٹاگانگ میں ہی

مسلسل کھسر پھسر کرتے میان بیوی کو مخاطب کر کے بولے:

”جب مشاعرے میں بیٹھنے کی تمیز نہیں تو کس حکیم نے کہا تھا مشاعرے میں آؤ“

حفیظ صاحب سیدھے سٹیج پر پہنچے اور باوازل بلند وزراء سے کرسیاں خالی کرنے کو کہا نہ یہ حوصلہ کسی میں تھا نہ سلیقہ

تقینات تھا اور اس مشاعرے میں موجود سارے ساجین کی پہلی صف میں ایک بڑا انفرانی بیگم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں کیا مسئلہ تھا، وہ میاں بیوی آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ ان کی کھسر پھسر مشاعرے میں خلل ڈال رہی تھی مگر وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو انھیں یہ کہتا کہ براہ کرم خاموشی اختیار کریں اور لوگوں کو مشاعرہ سننے دیں۔ بطور آخری شاعر حفیظ صاحب مائیک پر تشریف لائے اور اپنے مخصوص ترنم میں مشہور غزل کا مطلع سنایا:

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے

حفیظ صاحب ابھی مطلع پڑھ رہے تھے کہ ان میاں بیوی کی کھسر پھسر پھر گئی۔ حفیظ صاحب رک گئے اور ان صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا ”جب“ مشاعرے میں بیٹھنے کی تمیز نہیں تو کیا تمھیں کسی حکیم نے کہا تھا کہ مشاعرے میں آؤ۔“ یہ سن کر اس کی بیگم تو فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ صاحب بھی اُٹھے اور سر جھکائے چپ چاپ رخصت ہو گئے۔

شاعر ہوں، سیکشن آفیسر نہیں

ایک بار حفیظ صاحب کے کسی بھی خواہ نے صدر ایوب کو یہ پٹی پڑھائی کہ اگر انھیں شاہنامہ اسلام کی تکمیل پر کسی طرح راغب کیا جائے، انھیں مناسب سہولتیں مہیا کی جائیں اور وہ شاہنامہ کی چوتھی جلد سے آگے تاریخ اسلام کے بقیہ واقعات بھی نظم کر کے سلسلہ آپ (یعنی صدر ایوب) تک بھی پہنچا دیں تو یوں آپ غیر فانی ہو جائیں گے۔ چنانچہ حفیظ صاحب کو مرکزی وزارت اطلاعات میں جوائنٹ سیکرٹری کا عہدہ پیش کر دیا گیا۔ رہائش کے لیے راولپنڈی صدر میں ایک وسیع وعریض کوٹھی ملی۔ جملہ لوازمات کے ساتھ ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی خدمات سپرد کر دی گئیں، جو ۲۴ گھنٹے حاضر رہتا۔

حفیظ صاحب کو کسی دفتر میں آنا جانا نہ ہوتا۔ شاہ نامہ اسلام لکھنے کے علاوہ کوئی سرکاری مصروفیت نہ تھی۔ حفیظ صاحب ٹھٹھا باٹ سے سرکاری کوٹھی میں براجمان ہوئے اور سرکاری دی ہوئی سہولتوں کے مزے لینے لگے۔ پانچ چھ ماہ کا عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ انھوں نے شاہ نامہ اسلام میں کسی شعر کا اضافہ نہ کیا۔ بس کبھی کبھار کوئی تازہ غزل ہو جاتی جو وہ اپنے قریبی دوستوں سید ضمیر جعفری اور عزیز ملک کو سنا کر خوش ہو لیتے۔ ادھر ادھر کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہاں چلے جاتے۔

ایک دن وزارت اطلاعات کے کسی جانٹ سیکرٹری کو خیال آیا کہ حفیظ صاحب نے اپنے کام کی پیش رفت سے کبھی آگاہ نہیں کیا۔ معلوم کرنا چاہیے کہ کام کہاں تک پہنچا؟ اس شامت کے مارے نے حفیظ صاحب کو فون کر دیا کہ آپ اپنے کام کی ”پراگریس رپورٹ“ بھیجیں۔ حفیظ صاحب نے استفسار کیا کہ پراگریس رپورٹ سے کیا مراد ہے؟ وضاحت ہوئی کہ اب تک جتنے اشعار لکھے ہیں ان کی نقل بھیجیں۔ یہ کام سیکرٹری صاحب کو ”اپروڈل“ (منظوری) کے لیے پیش کرنا ہے۔

یہ سننا تھا کہ حفیظ صاحب سچ پا ہو گئے، کہنے لگے، ”میرے اشعار کو سیکرٹری منظور کرے گا؟ یہ کوئی دفتری ڈرافٹ ہے جو اس کی خدمت میں پیش کیا جائے؟ میں شاعر ہوں کوئی سیکشن آفیسر نہیں کہ آپ میری تحریر منظور یا نام منظور کریں۔“

جوائنٹ سیکرٹری صاحب کہنے لگے ”دیکھیں نا حفیظ

صاحب، آپ حکومت پاکستان کے ملازم ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ آپ کی کارکردگی کا جائزہ لیں۔“

یہ سننا تھا کہ حفیظ صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ کہنے لگے ”آپ کو کس بے وقوف نے بتایا کہ میں حکومت پاکستان کا ملازم ہوں۔ میں نہیں، حکومت پاکستان میری ملازم ہے۔“ یہ کہہ کر حفیظ صاحب نے فون بند کر دیا۔ عزیز ملک مرحوم بتایا کرتے تھے کہ جب یہ گفتگو ہوئی تو وہ حفیظ صاحب کے قریب بیٹھے تھے۔ بعد میں ملک صاحب نے ان سے کہا ”حکومت آپ کو تنخواہ دیتی ہے اور ڈھیر ساری سہولتیں بھی دے رکھی ہیں۔ لہذا وہ کام کے بارے میں بھی پوچھیں گے۔“ حفیظ صاحب نے گرم گرمی میں جواب دیا ”میں کوئی دفتر یا باو ہوں جو فائلیں لکھ لکھ کر پیش کروں؟ مجھے شاعر رکھا گیا ہے۔ آمد ہوگی تو شعر لکھ دوں گا۔“

جنرل فاروقی کے سہرے پر ڈکیاں

حقیقت یہ ہے کہ حفیظ فرمائش پر طبعاً لکھ ہی نہیں سکتے تھے، نہ کسی کا سہرا نہ تنقید۔ وہ خوشامد سے بہت دور تھے۔ کافی عرصے بعد اسی طرح کا ایک اور واقعہ راولپنڈی کلب میں پیش آیا۔ میجر جنرل فاروقی پاک فوج کی میڈیکل کور کے سربراہ تھے۔ انھوں نے اپنی ایک منظور نظر نرس سے شادی کر لی۔ ماتحت افسروں نے دولہا اور دلہن کو مبارک باد پیش کرنے کے لیے راولپنڈی کلب میں تیراکی کے تالاب کنارے ایک تہیتی تقریب کا اہتمام کیا۔ کچھ من چلے تو جوان افسر حفیظ صاحب کے درپے ہو گئے کہ جنرل صاحب کا سہرا پڑھا جائے۔ ان لوگوں نے یوں حفیظ کا

جنرل صاحب کی اشعار پر ناراضی دیکھ کر ان کے کچھ افسروں نے حفیظ صاحب کو اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا

گھیراؤ کر لیا کہ انھیں محفل میں آتے ہی بنی۔ وہاں پھر وہی رقصہ والی بات ہوئی۔ حفیظ نے جو سہرا پڑھا اس میں جنرل صاحب کا مذاق اڑایا گیا۔ مجھے اس سہرے کا ایک مصرع یاد ہے۔

یہ شادی ساٹھے پانچے کی ہے، پختہ کار ہے سہرا

رنگ میں بھنگ پڑ گئی اور دولہا میاں کا مزاج بگڑ گیا۔ نو جوان افسر تو بے حد مت سماجت کر کے حفیظ صاحب کو اپنے جنرل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لائے تھے، اب معاملہ الٹ ہو گیا۔ ایک جرنیل کی برسر محفل جو نیز افسروں اور سرسالی مہمانوں کے سامنے بے عزتی کوئی معمولی بات نہ تھی۔

جنرل کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کچھ افسروں نے حفیظ صاحب کو اٹھایا اور تالاب میں پھینک دیا۔ کچھ لوگ انھیں بچانے کے لیے دوڑے۔ حفیظ نے چند منچوٹے ہی کھائے تھے کہ انھیں نکال لیا گیا۔ وہ پانی میں شرابور تھے اور لباس تر بتر تھا۔ اسی عالم میں کسی صاحب نے ان کا بازو تھاما اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر پہنچایا۔

گوہر ایوب کی شادی اور سہرا لکھنے کی فرمائش

اسی زمانے کا واقعہ ہے، صدر ایوب کے بیٹے گوہر ایوب کی شادی خانہ آبادی تھی۔ سید ضمیر جعفری کا بیان ہے کہ بریگیڈیئر گلزار احمد انھیں لینے آئے اور کہا ”آئیے شاعر پاکستان حفیظ جالندھری کو بھی دیکھتے ہوئے چلیں۔ اگر وہ ابھی تک روانہ نہیں ہوئے، تو انھیں بھی لے لیں۔“ جب یہ دونوں اصحاب حفیظ صاحب کی کوشی پر پہنچے پتا چلا وہ آرام فرما رہے ہیں۔ جعفری صاحب اندر گئے۔ دیکھا تو نیچے قالین پر لیٹے ہیں۔ بولے ”حفیظ صاحب یہ کیا؟ ملک کے ولی عہد کی شادی ہے اور ملک اشعار تقریب میں جانے کے لیے ابھی تیار ہی نہیں ہوئے۔“

حفیظ صاحب نے بے نیازی سے جواب دیا ”میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ سہرے کی فرمائش ہے لیکن میں کہاں ان کا سہرا لکھتا پھروں؟ آپ میری طرف سے معذرت کر دیجیے گا۔ طبیعت ناساز ہے۔“ چنانچہ حفیظ صاحب صدر پاکستان کے بیٹے کی شادی پر نہیں گئے۔

میں تمھارا بابا ہوں

جعفری صاحب مزید بتایا کرتے تھے کہ جنگ عظیم دوم میں جب برطانوی ہند حکومت نے ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی کی ترغیب دینے کے لیے حکمہ ساگ پبلیٹی قائم کیا تو حفیظ صاحب ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ اب حفیظ صاحب اپنے آپ کو باقاعدہ جرنیل تصور کرنے لگے اور جرنیلی آن بان سے گفتگو کرتے۔ کسی بریگیڈیئر سے ملاقات ہوتی تو اسے اپنے سے جونیئر سمجھ کر تو اور غم کہہ کر مخاطب کرتے۔ مسلمانوں میں اس وقت سینئر افسر بریگیڈیئر گلزار احمد ہی تھے۔ وہ تو ویسے بھی خود کو حفیظ صاحب کا نیازمند سمجھتے تھے۔

عزیز ملک ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک تھے اور حفیظ صاحب کے حاشیہ نشین۔ حفیظ صاحب کے اثرات ان میں بھی حلول کر گئے تھے۔ انھوں نے کسی افسر کی ڈانٹ ڈپٹ پر جواباً اٹنی سیدی بات کہہ دی۔ غصے میں آکر افسر نے ملٹری اکاؤنٹس جنرل سے شکایت کی اور کہا کہ اس دفتر میں اب میں رہوں گا یا عزیز ملک۔ چنانچہ عزیز ملک کا تبادلہ راولپنڈی سے کوئٹہ کر دیا گیا۔ عزیز ملک فریاد لے کر حفیظ صاحب کے دربار پہنچے۔ حفیظ صاحب نے ائم اے جی کو فون کیا اور کہا ”فقوی صاحب! مہربانی کر کے عزیز ملک کا تبادلہ منسوخ کر دیں۔ مجھے یہاں اس کی ضرورت ہے۔“

فقوی صاحب شعر و شاعری سے کوئی شغف نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی انھیں حفیظ صاحب کی اہمیت کا کوئی شعور تھا۔ تنگ کر بولے ”تم کون ہوتے ہو مجھے اس طرح حکم دینے والے؟“

حفیظ صاحب نے اپنی آواز اونچی کرتے ہوئے کہا ”میں تمھارا بابا ہوتا ہوں۔“ اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ چند لمحے توقف کے بعد عزیز ملک سے کہا ”ممتاز حسن سے میری بات کراؤ۔“ ممتاز حسن اُن دنوں سیکرٹری خزانہ تھے۔ ان کی مداخلت سے عزیز ملک کو راولپنڈی میں ہی کسی اور ذیلی دفتر میں لگا دیا گیا اور وہ کوئٹہ جانے سے بچ گئے۔

شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ حفیظ کی مشہور نظم ”رقاصہ“ ایک والئی ریاست کی فرمائش بلکہ حکم پر لکھی گئی۔ حفیظ صاحب ان دنوں اس ریاست کے درباری شاعر تھے۔ یہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ والئی ریاست نے حفیظ کو اپنی منظور نظر رقصہ کی شان میں نظم لکھنے کو کہا۔ حفیظ صاحب نے تعریف کرنے کے بجائے اس کی تنقید کر دی۔ عین اس وقت جب وہ محو رقص تھی، حفیظ نے ترنم سے یہ اشعار سنائے۔

ہاں ناچتی جا ، گائے جا
نظروں سے دل برمائے جا
ترپائے جا ، ترپائے جا
او نیم عریاں نازیں!
تیرا تھرکنا خوب ہے
تیری ادا میں دل نشیں
لیکن ٹھہر تو کون ہے؟
او دشمن دنیا و دیں!
تیری نظر چالاک ہے
تیری نظر بے باک ہے
شرح اور عزت والیاں
ہولی ہیں عفت والیاں
کسی قوم کی بیٹی ہے تو
تقدیر کی بیٹی ہے تو

جب وہ رقص ختم ہوا اور محفل پر سکوت طاری ہو گیا، تو

ضیا! میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں

۱۹۸۰ء میں ایک صبح میں عزیز ملک سے کنٹونمنٹ پبلک لائبریری، راولپنڈی پہنچا، جہاں لائبریرین تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ان کے پاس صاحب بیٹھے ہیں۔ پتا چلا کہ وہ ۲۰۰۰ روپے سے راولپنڈی ہی ہیں۔ انھیں جنرل ضیاء الحق نے باقاعدہ جہاز کا نوکر بھیج کر بلایا ہے تاکہ ان سے ملاقات کر سکیں۔ لیکن وہ ایوان صدر کے دروازے سے استقبالیہ والوں نے انھیں کہہ کر لوٹا دیا کہ ابھی صدر صاحب مصروف ہیں، پھر آئے گی۔

حفیظ صاحب بھرے بیٹھے تھے۔ بولے ”اگر آج ملتا تو میں واپس جاتا ہوں۔“ پھر مجھے کہنے لگے، اچھا آپ آگئے۔ مجھے اپنی گاڑی پر ایوان صدر لے چلے۔ چنانچہ ہم تینوں تھوڑی دیر بعد ایوان صدر روانہ ہوئے۔ دروازے پر استقبالیہ پر ایک کنٹرل ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے کہا، ابھی تو ملنا بڑا مشکل ہے۔ کچھ ملکوں کے سفیر آ رہے ہیں۔ شام کو پتا کیجیے۔

حفیظ صاحب نے کنٹرل سے کہا، مجھے مہمانوں کا کتاب لا کر دو، میں اپنی حاضری تو لگاؤں۔ ایک لمحہ لے آیا۔ حفیظ صاحب نے اس میں لکھا:

”ضیاء!..... میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں تمہارے گھر کے چکر لگاتا رہوں اور مجھے ہر بار دروازے سے لوٹا دیا جائے۔ حفیظ“

یہ لکھ کر جسر بند کیا اور ہمیں خطاب کر کے کہنے لگا آپ لوگ مجھے ہوائی اڈے چھوڑ آئیں اور وہ لاہور آج ہی آئے۔ بعد میں مجھے عزیز ملک نے بتایا، حفیظ صاحب نے اپنی گھر ماڈل ناؤن پہنچے، لاہور کے کوہکمانہ طرف سے ایک کار لینے آگئی۔ پتا چلا کہ صدر صاحب کر رہے ہیں۔ انھیں پھر بذریعہ جہاز راولپنڈی لایا گیا۔ اس مرتبہ اڈے پر ایوان صدر کی گاڑی موجود تھی۔ انھیں سیدھا صدر صاحب کے پاس لے گئی۔

رقاصہ سر جھکائے نواب کے قدموں میں جا بیٹھی۔ نواب کو حفیظ کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ اس نے حکم دیا کہ حفیظ کو جیل میں ڈال دیا جائے۔ یوں حفیظ صاحب محفل رقص و سرود سے سیدھے جیل جا پہنچے۔ گویا رنڈی خانے سے بندی خانے میں منتقل ہو گئے۔ تقریباً ایک مہینہ وہاں قید رہے۔ پھر حکم ہوا کہ انھیں جیل سے نکال کر ریاست کی حدود سے باہر پھینک دیا جائے۔ اس طرح حفیظ کی جان بچی۔ اسی واقعہ کے باعث یہ نظم مشہور ہو گئی ورنہ یہ حفیظ کی اچھی نظموں میں سے نہیں۔

محفل ناؤ نوش میں تازہ نظم

جن دنوں حفیظ صاحب صدرا یوب کی خواہش پر شاہ نامہ لکھنے پر مامور تھے، افسران بالا کی ایک محفل ناؤ نوش اور بزم رقص و سرود راولپنڈی میں منعقد ہوئی۔ حفیظ صاحب کو اس تقریب میں بطور خاص مدعو کیا گیا تاکہ جب محفل رنگ پر ہو تو ان سے ”ابھی تو میں جوان ہوں“ ان کے مخصوص دل آویز ترنم میں سنی جائے۔ حفیظ صاحب سے جب نظم کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے کہا ”وہ نظم تو مجھے یاد نہیں، آپ کو ایک تازہ نظم سناتا ہوں۔ وہ نظم یہ تھی۔

عورتیں ہیں، مرد ہیں، یار نہ جھانے میں ہے اب تو ہر مستانی ہر متانہ جھانے میں ہے یہ ثقافت ہر کلب میں ہے شرافت کا مقام ناچ گھر موجود ہے، مے خانہ جھانے میں ہے ناچنے کی شرط یہ ہے مرد و زن دونوں ہوں غیر بس وہی اپنا ہے جو بیگانہ جم خانے میں ہے ناچنے میں مرد و زن پر حال طاری ہو اگر ان کی خاطر خاص خلوت خانہ جھانے میں ہے دین پر پھبتی، خدا پر طعن، ملت پر ہنسی کیسی جیسی جرأت زندانہ جھانے میں ہے ناچتی گاتی ہوئی مٹ جانے والی قوم کا ایک جیتا جاگتا افسانہ جھانے میں ہے حفیظ صاحب تو یہ نظم سنا کر چل دیے اور شرکائے محفل

نپولین کوتا جریوں اچھے نہیں لگتے تھے؟

بابونگری کاروباری بابو

کیا کاروباری بابو کا ہر قسم کی مکاری اور چال بازی پر غور ضروری ہے؟

سرکاری بابوؤں سے کبھی واقف ہیں آئیے..... اس بار آپ کو سرکاری کاروباری بابوؤں سے ملواتے ہیں



حسین احمد شیری

بابونگری

کاروباری بابوؤں سے بھی گہرا تعلق ہے۔ یہ عجیب ماجرا ہے کہ اس ملک میں صنعتیں بیمار لیکن صنعت کار بہت صحت مند ہیں۔ دراصل اس توانائی اور صحت مندی کے پیچھے ٹیکس، بجلی، گیس کی چوری، حکومتی وسائل جیسے نجکاری اور سرکاری زمینوں کے فراڈ، بینکوں کے قرضوں کی ہیرا پھیری اور ناجائز منافع خوری جیسے عوامل شامل ہیں۔ طاقتور کاروباری بابو انہم پولیٹوں پر اپنے منظور نظر دفتری بابوؤں کو تعینات کرواتے ہیں اور پھر طرفین خوب کھیل کھیلتے ہیں۔ پولیٹین نے کہا تھا کہ مجھے تاجر اچھے نہیں لگتے۔ تاجر ایک ایسا شخص ہے جو اپنے ملک کو ایک شلنگ کے عوض بیچ دے گا۔

ایک بڑے صنعت کار سے ہم نے خود سنا تھا کہ وزیر اعظم کے لیے ہم جان بھی دے دیں گے کیونکہ وہ ہمارا بھائی ہے لیکن ٹیکس نہیں دے سکتے کیونکہ پیسہ ہمارا والد ہے۔ ہمیں یہ بھی پتا ہے کہ کئی تجارتی بابو زیادہ برآمدات کا انعام نہیں لیتے کہ اس کے بعد اتنی بڑی رقم کے انکم ٹیکس کا حساب کون دے گا۔ ۱۹۷۳ء میں ہمیں ایک گروپ کے بابا جی سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بتاتے تھے کہ انکم ٹیکس آفیسر کے دفتر میں جاتے ہوئے ہم پرانے کپڑے پہن کر جاتے ہیں، پھر ٹیکس کا ایک آدھ ٹن توڑ کر راستے میں سے مٹی اٹھا کر خود جوتوں پر ڈالتے ہیں اور کمرے میں جانے سے پہلے گھڑی باہر پکڑا جاتے ہیں تاکہ ٹیکس بابو سے یہ کہا جاسکے کہ جناب مجھ میں تو گھڑی خریدنے کی بھی استطاعت نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ پورا بیج یہ ہے کہ مختلف متعلقہ محکموں کی دھونس اور دھاندلی کے پیش نظر صرف اپنی بقاء کے لیے کاروباری بابو کا ہر قسم کی مکاری اور چال بازی پر عبور ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہاں ترقی وہی کرتے ہیں جو سفاکی کی حد تک اپنے مفاد کو آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں وفاقی بجٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے

ماپوس کن قرار دینے والے بزنس لیڈر کے دفتر میں دن ٹیکس اہلکار پہنچ گئے چنانچہ ان کے اگلے بیان میں کے خیر مقدم کے ساتھ اس ضرورت پر زور دیا گیا کہ معاملات واضح نہیں ہیں، وہاں مذاکرات ہونے چاہئیں ماضی قریب میں پاکستان میں ارب پیوں کی کھپ نمودار ہوئی ہے اور قیام پاکستان کے وقت کار کھیل کے بیشتر بڑے مسلمان کھلاڑی یا تو میدان چکے ہیں یا کسی کو نہ کھدے میں پناہ گزین ہیں۔ ہی ایک پرانے کاروباری بابو سے ہم نے اس منظر نامے کی توجہ پر پوچھی تو کہنے لگے ”شیرازی آج کل دھندے کے اصول بالکل بدل گئے ہیں۔ یہاں اس فلسفے پر عمل کیے بغیر بڑی کامیابی حاصل کی جاسکتی۔ سب کچھ لوٹ لو۔ جو راستے میں آئے پہلے پیار اور خوشامد سے رام کرو، مٹھ سماجت کرافش کراؤ، بولی لگاؤ ورنہ سنس نہیں کرو۔ ہماری کے پیش نظر ہمارا ضمیر لوٹ مار کے لیے غارت گری تک جانے سے انکاری ہے۔“

کامیاب کاروباری بابو ہر وقت پیسہ کمانے میں رہتے ہیں۔ ایک سوگ کی محفل میں ہمارے ہاتھ بیٹھے ہوئے ایک صاحب اپنے ساتھی کو بتاتے کہ چینی کے ریٹ میں تو بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ یہ ۲۰ روپے سے اوپر نہیں جائے گا جبکہ میں نے ۲۰ روپے خرید کا سودا کیا ہوا ہے۔ پھر جو چنے پڑھنے سامنے رکھے تھے، انھوں نے نہ جانے کیا سوچے ان کو کھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ان کے گرفتار ہو گئے۔ ویسے یہ بڑے بابو تھے بڑے دلیر۔ کئی چنوں کی کوٹھنی، شملہ پہاڑی بننے لگی تھی لیکن بال پہلے وہی مرتبہ آدھی رات کے بعد اپسراؤں کے ریٹ ۲۰ روپے سے اوپر نہیں جا رہا تھا۔ ہمارے بائیکاٹ ہمارے دوست کے مہمان خانے میں آتے تھے۔ بھی نرخ ہی کچھ اس طرح موضوع بحث تھے۔ اسے دوست نے اُن کے حساس عہدے کے پیش نظر الف ”دیکھو بھائی میں نے ۳۶ روپے سودا کیا لیکن اس اعتبار کا مشورہ دیا تو وہ بولے ”ارے ابھی جب میں ریٹ ۳۸ روپے ہے لیکن میں کاروباری اصول کے پیش نظر ۳۷ روپے میں دے رہا ہوں۔“

ب ”یہ کیسے ہو سکتا ہے..... یہاں تو یہ مردی ہے۔ ایک صاحب کو بریف کیس دے کر کسی ان کی کئی شکایات خود ساختہ بھی ہوتی ہیں۔ ایک کاروباری بابو کو تجارتی بابو نے رات ۱۱ بجے فون کر کے بتایا کہ سرکاری اہلکار اس وقت انھیں تنگ کر رہے ہیں۔ سرکاری بابو نے جواب دیا کہ اس کا علاج تو آپ پاس ہے۔ آپ رات کے ۱۱ بجے بانڈ سے ٹیکس ادا کیے بغیر سامان مت نکالیں۔ ہم نے بہت سے تجارتی بابوؤں کو ترقی کے لیے ہر طرح کے پاپڑ بلیتے دیکھا ہے اور ان کی کامیابیوں کو سفارش کراؤ، بولی لگاؤ ورنہ سنس نہیں کرو۔ ہماری کے پیش نظر ہمارا ضمیر لوٹ مار کے لیے غارت گری تک جانے سے انکاری ہے۔“

کامیاب کاروباری بابو ہر وقت پیسہ کمانے میں رہتے ہیں۔ ایک سوگ کی محفل میں ہمارے ہاتھ بیٹھے ہوئے ایک صاحب اپنے ساتھی کو بتاتے کہ چینی کے ریٹ میں تو بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ یہ ۲۰ روپے سے اوپر نہیں جائے گا جبکہ میں نے ۲۰ روپے خرید کا سودا کیا ہوا ہے۔ پھر جو چنے پڑھنے سامنے رکھے تھے، انھوں نے نہ جانے کیا سوچے ان کو کھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ان کے گرفتار ہو گئے۔ ویسے یہ بڑے بابو تھے بڑے دلیر۔ کئی چنوں کی کوٹھنی، شملہ پہاڑی بننے لگی تھی لیکن بال پہلے وہی مرتبہ آدھی رات کے بعد اپسراؤں کے ریٹ ۲۰ روپے سے اوپر نہیں جا رہا تھا۔ ہمارے بائیکاٹ ہمارے دوست کے مہمان خانے میں آتے تھے۔ بھی نرخ ہی کچھ اس طرح موضوع بحث تھے۔ اسے دوست نے اُن کے حساس عہدے کے پیش نظر الف ”دیکھو بھائی میں نے ۳۶ روپے سودا کیا لیکن اس اعتبار کا مشورہ دیا تو وہ بولے ”ارے ابھی جب میں ریٹ ۳۸ روپے ہے لیکن میں کاروباری اصول کے پیش نظر ۳۷ روپے میں دے رہا ہوں۔“

طاقتور شخصیت کے پاس یہ کہہ کر بھجوا گیا کہ اگر تو وہ لان میں ہاتھ پیچھے باندھے ٹھیل رہے ہوں تو بریف کیس دے دیں اور اگر صوفے میں دھنس کر سگار پی رہے ہوں تو اپنا کام ضرور بتا دیں، پیسوں کا بھانہ کر دیں۔ (موقع واردات پر سگار بیا جا رہا تھا اس لیے پیسے بیچ گئے) اسی طرح ایک حکومتی دفتر میں اپنا کام کرانے کا طریقہ یہ تھا کہ سرکاری قصبے کے ساتھ اپنا کوئی ملٹی مسئلہ جوڑ کر افسر سے دم کرنے کی درخواست کی جاتی تھی، اور دم کرانے کے بعد مکمل افادہ کے مجرہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے۔ ایک اعلیٰ افسر کے بھائی ڈاکٹر تھے۔ مریض سے مرض کی علامات سننے کے بعد جب ڈاکٹر صاحب پوچھتے کہ یہ تکلیف انھیں کب سے ہے تو وہ جواب دیتے کہ جب سے میرا یہ سرکاری کام چھڑا ہوا ہے۔ تفصیل سننے کے بعد ڈاکٹر صاحب حل بتا دیتے کہ آپ کا علاج اتنے لاکھ میں ہو جائے گا۔

لیکن بعض اوقات یہ مار دھاڑ انسانی برداشت سے بڑھ بھی جاتی ہے۔ ہم نے اپنے ایک جاننے والے کاروباری بابو کو بوشن ”سلاگرہ مبارک“ کا فون کیا اور پوچھا کہ سناؤ سلاگرہ کا دن کیسے گزر رہا ہے تو وہ بولے کہ ابھی بیٹے کو سکول چھوڑ کر آیا اور اب برتن دھو رہا ہوں لیکن پاکستان کی سردردی سے یہاں برتن دھونا بہتر ہے۔ نئی کاروباری بابوؤں کا تذکرہ سرکاری شعبے میں چلنے والے تجارتی اور صنعتی اداروں کے حالات بیان کیے بغیر ادھورا ہے۔ ہم ۱۹۹۲ء میں کلکٹر کشم کی نوکری چھوڑ کر اس طرح کی ایک کارپوریشن میں بطور ڈائریکٹر پہنچ گئے..... کیسے پہنچ گئے؟ وجوہات میں سر فہرست ہمارے چھوٹے بھائی قدوس کا اصرار تھا۔

قدوس ۲۴ سال قبل امریکا سے پاکستان منتقل ہونے کے بعد مناسب کاروبار کر رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ہم نے اپنے خاندان کے لیے بہت محنت کر لی ہے اور اب ہم اس رعایت کے مستحق ہیں کہ بقید زندگی اپنی صوابدید پر آزادی سے پڑھنے لکھنے اور گھومنے پھرنے میں

اس سال ہماری کارپوریشن نے ۶۶ کروڑ روپے کا نقصان کیا تھا لیکن اس کے باوجود ۵۵ کروڑ روپے کا بونس اور بہت سی خصوصی اضافی مالی ترقیاں بھی عطا کی گئیں۔ جس ڈرائیور کے ساتھ گاڑی نہیں تھی وہ بھی ۱۲ گھنٹے اور نانم لیتا تھا اور اس طرح وہ روزانہ ۲۰ گھنٹے ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔

گزاریں۔ لیکن وائے قسمت۔ ڈیڑھ سال بعد قدوس فوت ہو گیا۔ پھر مزید ۱۲ سال بعد ہم نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر ہائیکورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ پچھلے سال ہائیکورٹ کے ایک مقدمے کی بحث کی تیاری کے سلسلے میں ہم کراچی کے ہوٹل میں رات ۱۲ بجے تک کاغذات کی چھان پھک کرتے رہے۔ نیند کافی دیر تک آنکھوں کے درمیان کھٹکھٹانے میں ناکام ہو کر کسی ناراض سچے کی طرح بہت دور جا چکی تھی اور گردن کے سر کا بوجھ مزید نہ اٹھانے کے پیغام کے بعد، بے چارہ سرکسی کی پشت پر گرا پڑا تھا کہ ہمیں محسوس ہوا کہ کسی نے ہمارا کندھا پھتیا کر دھکی لہجے میں کہا ”افسوس بھائی جان..... آپ کو زندگی کے سفر کے لیے صرف صحرا ہی ملے.....“

معاف کیجیے یہ ایک ایسے میں دوسری ٹریجڈی کہاں سے آگئی۔ بہر کیف اس سرکاری کارپوریشن کی مناسب مثال اس مغویہ جیسی ہے جس کا اغوا کنندہ اپنے ظلم اور زیادتیوں کے ساتھ ساتھ اس کے لواحقین سے اس کے طعام و قیام اور دیگر مصارف کے بل بھی وصول کرتا ہے۔ اس ایک فقرے میں ان اداروں کے قومیاے جانے، ان کے چلانے اور دوبارہ بنکاری کے سارے عمل کی مکمل تصویر ہے۔ قومیاے کی پالیسی کی پہلی قسط میں صوبہ سرحد میں نوشہرہ کی ایک ایسی ٹیکسری کو قومیا گیا تھا جو صرف ایک شیڈ (Shed) پر مشتمل تھی۔ ہم نے ایک متعلقہ صاحب سے وجہ پوچھی تو بولے کہ ملک کے اس حصے میں قومیاے کے لیے کوئی دوسرا یونٹ اس وقت نظر نہیں آیا تو اس پالیسی میں صوبہ سرحد کا حصہ ڈالنے کے لیے یہ کام کیا گیا۔ میڈیکل بل اور دوائیوں کی مقدار کے پیش نظر ایسا

حصہ جاریش روپیس کا حاضر سروس ڈی آئی جی تھا، جس کے ساتھ بدتمیزی کرنے کے بعد اسے دفتر میں بند کر دیا گیا تھا لیکن اس کی درج کرائی گئی ایف آر پر ایک سال سے تو کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

انہی دنوں ہمارے وفاقی سیکرٹری کی تحقیقات کے لیے لاہور آئے لیکن اسی طرح کی نعرے بازی سے ڈر کر ہوٹل سے سی واپس اسلام آباد چلے گئے۔

انہی دنوں ہمارے وفاقی سیکرٹری کی تحقیقات کے لیے لاہور آئے لیکن اسی طرح کی نعرے بازی سے ڈر کر ہوٹل سے سی واپس اسلام آباد چلے گئے۔

انہی دنوں ہمارے وفاقی سیکرٹری کی تحقیقات کے لیے لاہور آئے لیکن اسی طرح کی نعرے بازی سے ڈر کر ہوٹل سے سی واپس اسلام آباد چلے گئے۔

ہم ”غیر ملکی سرمایہ کاری کو اس سے اور بھی بڑا دھچکا لگے گا کہ ایک ٹھیکیدار کو قانونی معاہدہ ہونے کے باوجود غنڈہ گردی کے ذریعے فیکٹری میں اپنا کام کرنے سے روکا جا رہا ہے۔“

لیڈر ”آپ کے پاس جب بھی آتے ہیں آپ اصول، اصول کی باتیں کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے صرف سرکاری دفاتر میں نوکری کی ہے، کسی کارپوریشن میں نہیں رہے۔“

اسی اثناء میں ہمارے ملحقہ کمرے سے اونچی آواز میں نازیبا گفتگو، فلک شکاف قہقہوں، لڑنے جھگڑنے، کرسیاں میز گرنے اور برتن ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں..... استفسار پر معلوم ہوا کہ مقامی یونین کے عہدیدار ہلڈ گاہ کر رہے ہیں۔ ان کا مکالمہ بھی سن لیں۔ ہم ”یہ کیا ہنگامہ ہے؟ دفتر میں ایسا طرز عمل انتہائی نامناسب ہے۔“

لیڈر ”جناب کوئی قتل تو نہیں کر دیا۔ مہمان آئے ہوئے تھے اور ہم ڈرا دل پشوری کے لیے ایک دوسرے پر چائے گرا رہے تھے۔“

ہم ”دفتر بند ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی ہے، آپ کو اجازت ہے کہ اپنے مہمانوں کو گھر لے جائیں۔“

لیڈر ”گھر نہیں لے جاسکتے۔“

ہم ”وجہ؟“

لیڈر ”گھر انٹر کنڈیشنڈ نہیں ہے۔“

اس کارپوریشن میں ہم نے مفت تعلیم بالغاں کا سکول بھی کھولا جس میں صرف ایک ڈرائیور نے داخلہ لیا۔ ہم یونین کے صدر کو شاگرد ڈھونڈ کر لانے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ جب ہمارا اصرار حد سے بڑھ گیا تو ایک دن تھپلے کا اعلان کرنے کے بعد انھوں نے فرمایا کہ آپ کی فرمائش سن سن کر میرے تو کان پک گئے ہیں..... بس ایک مرتبہ ہی جواب سن لیں..... اگر یہ..... (نازیبا القاب) پڑھ گئے تو میری یونین کیسے چلے گی؟

قائد کی یاد کا نیا حوالہ

سوال ۳۳ جواب

کل یہی جواب تاریخ کہلائیں گے

قائد اعظم کی کون سی خوبی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے

لک کے معروف اخبارات کے ایڈیٹروں کی بانی پاکستان کے حوالے سے حجت عمر کی باتیں

اظہار بن مظہر





شخص نہیں ہے نہ ہی زندوں میں یا جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اُن میں کوئی ایسا نہیں ہے جو رول ماڈل کہلا سکے۔ اُن کی بہن فاطمہ جناح خواتین کے لیے رول ماڈل ہیں کیونکہ خواتین کی تعداد بھی نصف یا نصف سے زیادہ ہے۔

۲۔ قائد اعظم ایک سچے انسان تھے۔ انھوں نے ہمیشہ سچ بولا اور کبھی سچ سے انحراف نہیں کیا۔ اُن کی بہترین جو خوبی تھی وہ اُن کا سچ بولنا تھا اسی لیے شروع شروع میں جب وہ اردو اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ وہ انگریزی میں تقریر کر رہے ہیں اور لوگ اُن کی تقریر اس طرح آرام سے سنتے جیسے وہ لفظ بہ لفظ سمجھ رہے ہوں۔ وہ جو بولتے تھے وہ سچ بولتے تھے اور ہر کوئی اُس کو سچ سمجھتا تھا اور وہ سچ کہتے تھے اور وہ سچ نکلتا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر حضرت قائد اعظم نہ ہوتے تو پاکستان کبھی بھی معرض وجود میں نہیں آسکتا تھا کیونکہ ہمارے مخالفین جو ہیں وہ بہت زیادہ تعداد میں تھے اور بہت زیادہ شاطر اور چالاک تھے۔ اُن کا جواب صرف اور صرف قائد اعظم ہی دے سکتے تھے۔

مجیب الرحمن شامی (مدیر اعلیٰ پاکستان)

۱۔ قائد کے حوالے سے پہلا تاثر احساس تشنگی کا داغ میں ابھرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اُن کی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان حاصل کیا۔

۲۔ آج ہم اپنے وطن میں آزادی سے رہ رہے ہیں تو یہ قائد اعظم محمد علی جناح کی جدوجہد اور ہمت و استحکام کی ہی وجہ سے ہے۔ آزادی سے بڑی نعمت کوئی اور نہیں۔ دل تشنگی سے لبریز ہو جاتا ہے۔

۳۔ قائد اعظم جیسا لیڈر ان کے بعد کوئی اور نہیں آیا۔ انھوں نے اپنا سب کچھ مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ صرف

قائد اعظم کی یاد کے لیے اس ماہ ہم نے تاریخ کی کسی کتاب سے مدد لینے کے بجائے آج کے نمایاں اخبارات کے مدیروں سے ملاقات کا اہتمام کیا اور اُن سے ۳ سوال پوچھے یہ رہے اُن کے جوابات۔ کل یہی جواب تاریخ کہلائیں گے

محمد

سے بھی خاص تعلق ہے۔ نظامی صاحب اُن کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔ میرے خیال میں یہ پہلا دنیا کا ملک تھا جس کے ۲۲ حصوں میں ایک ہزار سے زیادہ میل کا فاصلہ تھا۔ ایک ایسٹ پاکستان بنا اور دوسرا ویسٹ پاکستان بنا۔ پھر اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں تھا اُسکے رہنا تو یہ دو پاکستان بن گئے۔ وہ نام بے شک بنگلہ دیش ہے مگر وہ پاکستان ہی ہے کیونکہ جس طرح ہم نے ہندوؤں کی بلا دستی کو قبول نہیں کیا اس طرح بنگلہ دیش نے بھی قبول نہیں کیا۔ اب حضرت قائد اعظم کی طرف آتے ہیں۔ قائد نے پاکستان کو اسلامی، جمہوری، فلاحی مملکت قرار دیا تھا۔ اُن کا یہ فرمان تھا کہ کسی نے پوچھا اُن سے کہ آپ کا مسلک کیا ہوگا یعنی پاکستان کا۔ جس طرح یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کو حضرت قائد اعظم ایک سیکولر اور ماڈرن ریاست بنانا چاہتے تھے وہ تو اسلامی، جمہوری اور فلاحی میں بھی آجاتا ہے لیکن جہاں تک تعلق سے سیکولر ہونے کا اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ حضرت قائد اعظم پر ایک تہمت ہے۔ قائد نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ میرا مسلک وہی ہے جو میرے حضور پاک کا تھا اور میں پاکستان کو اُس کا پاکستان دیکھنا چاہتا ہوں وہ حضور پاک کی غلامی کے قائل تھے اور ایک سے زائد بار انھوں نے پاکستان کو (پاکستان بننے سے پہلے اور بعد میں بھی) ایک اسلامی جمہوری مملکت قرار دیا تھا۔

۲۔ قائد اعظم کو رول ماڈل بنانے کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت سوائے قائد کے کوئی بھی ایسا

علی جناح ایک ایسی ہستی کا نام ہے جس کی شخصیت کا سرحد ۶۲ رسال کے بعد بھی قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ کسی خاص مقصد کے لیے منتخب کرتا ہے۔ یہ لوگ مخلوق خدا کی فلاح و ترقی کے لیے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں اور اپنے کام کی تکمیل کے بعد واپس بلا لیے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک خاص انعام تھے۔ انھوں نے پر امن جدوجہد سے وہ کر دکھایا جس کی انگریز اور ہندو توقع نہیں کر رہے تھے۔ قائد اعظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہی آزادی انھیں دلائی بلکہ انھیں ایک محفوظ اور کامیاب زندگی کے لیے ایک منفرد ملک کا تحفہ دیا۔ وہ جسمانی طور پر انتہائی کمزور اور نحیف تھے مگر اپنے ارادے میں پہاڑ کی طرح مضبوط اور ثابت قدم تھے۔

مجید نظامی (مدیر اعلیٰ نوائے وقت)

۱۔ حضرت قائد اعظم اور نوائے وقت کا ایک خاص تعلق ہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان کے دن نوائے وقت بطور ۱۵ روزہ منصوبہ پر ابھڑا۔ اس کے مدیر مجید نظامی صاحب طالب علم تھے اور ایم ایس ایف پنجاب کے بانی صدر بھی تھے۔ ۱۹۴۳ء میں قائد کے حکم پر نوائے وقت کو ”روزنامہ“ بنا دیا گیا۔ اس لحاظ سے نوائے وقت اور حضرت قائد اعظم کا ایک خاص تعلق ہے۔ اسی طرح حضرت علامہ

اگر قائد اعظم نہ ہوتے تو پاکستان

کبھی معرض وجود میں نہ آتا

مجیب الرحمن شامی



مجید نظامی

قائد اعظم جیسا لیڈر پاکستان کو

دوبارہ نصیب نہیں ہو سکا



سید ذوالکرام

خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال جیسے لوگ موجود تھے۔ ان کے اندر Standout کرنا اور لیڈر شپ کا رول لینا بہت کمالات کی بات تھی اور اُن کے اس رول کو مسلمانوں نے دل و جان سے قبول بھی کیا۔ عوام نے قائد کو مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں قبول کیا اور عوام نے آپ کو قائد اعظم مانا۔ یہ سب قائد نے جدوجہد سے حاصل کیا وہ بھی جدوجہد سے کھڑے نہیں۔ اس جدوجہد کی بدولت قائد کامیابی پر کامیابی پاتے گئے اور آگے سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان انگریز کی مدد سے بنا اور اگر یہ مان لیا جائے اس جھوٹی کہانی میں اگر کچھ سچ بھی ہو پھر بھی قائد اعظم نے ہی یہ پاکستان بنوایا ہے۔ ورنہ پاکستان کو نہ تو انگریز بنا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اور بنا سکتا تھا۔ یہ مسلسل جمہوری جدوجہد سے پُر امن طریقہ سے بنایا گیا ہے۔

سرفراز سید (جوائنٹ ایڈیٹر اوصاف)

۱۔ قائد اعظم اس دنیا کے آدمی نہیں تھے۔ وہ اپنے مقصد میں سخت اور بے باک تھے۔ ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ قائد کا ذکر آتے ہی خیال آتا ہے کہ وہ نفیس اور کھرے انسان تھے۔ وہ نفیس اور عمدہ لباس زیب تن کرتے تھے۔ نفاست اُن کی ایک بڑی خوبی تھی۔ اپنے ہدف کو پانے کے لیے انھوں نے پوری جدوجہد کی۔ اُن میں نہ لالچ تھی نہ کرپشن۔ اُن کے سخت موقف اور کھرے پن ہی کی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی اولاد اور رشتہ داروں کو کوئی عہدہ یا مراعات نہیں دیں۔ پاکستان نہیں آنے دیا۔

۲۔ نوجوان نسل کے لیے قائد اعظم بالکل درست رول ماڈل ہیں۔ قائد ایک سچے انسان تھے۔ وہ ایک شخص اور دیانت دار آدمی تھے جو رول ماڈل ہونے کے لیے

ہی کم لوگوں کو کر دکھانے کا موقع ملا۔ یہ مقام دنیا کے کم ہی لیڈروں کو نصیب ہوا ہے۔ انھوں نے ایک نیشنل سٹیٹ بنائی۔ انھوں نے وہ کام کر دکھایا جس کو ہر سال پہلے تک ناممکن سمجھا جا رہا تھا۔ انھوں نے اپنے حوصلہ اور ہمت سے وہ کر دکھایا اس کو بھی معجزہ کہتے ہیں۔ انھوں نے ایک صاف ستھری زندگی گزاری جس میں کوئی داغ نہیں، بہت انفس کہ اُن کے طرز زندگی اور عمل کو فائدہ پہنچایا گیا۔

۲۔ سٹیٹ والپرت نوجوان نسل کے رول ماڈل کے حوالے سے میری نظر میں اگر پاکستانی قوم کا کوئی رول ماڈل ہے تو وہ صرف اور صرف قائد اعظم ہے۔ نئی نسل کو قائد اعظم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ میں قائد کے بارے میں سٹیٹ والپرت کی کتاب ”Jinnah of Pakistan“ کو پڑھ کر بہت زیادہ متاثر ہوا۔ میں نوجوان نسل کو بھی یہ تجویز دیتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو پڑھیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے نوجوانوں کو قائد کے بارے میں جاننے کا بہت موقع ملے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہر نوجوان اس کتاب کو ضرور پڑھے۔

۳۔ قائد اعظم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ انصاف اور قانون کے دائرے میں رہے اور اس دائرے میں رہ کر انھوں نے جمہوری جدوجہد کی۔ قائد نے شائستگی کو بھی نہیں چھوڑا اور اپنے ذرائع روزگار کے بارے میں بہت محتاط رہے ہیں کہ اُن میں کوئی آلائش نہ آئے۔ یہ ہیں وہ نمایاں چیزیں جن کو اپنے سامنے رکھ کر ہم قائد کو اپنا رول ماڈل سمجھتے ہیں۔

قائد اعظم کے زمانہ میں لیڈر شپ اتنی زیادہ تھی، مسلمانوں کے اتنے اتنے بڑے رہنما یعنی محمد علی جوہر، ظفر علی



سرفراز سید

بنیادی خوبی ہے۔ قائد میں منافقت نہیں تھی۔ سیاسی طور پر وہ ایک بہترین رول ماڈل ہیں۔ اگرچہ سیاسی حوالے سے حضور اکرمؐ، صحابہ کرامؓ ہمارے رول ماڈل ہیں لیکن عہد جدید میں جو قوتیں ہمارے ارد گرد منڈلا رہی ہیں قائد اعظم ان کے حوالے سے ایک بہتر سیاسی رول ماڈل ہیں۔ انفس یہ ہے کہ نئی نسل کو قائد اعظم کے بارے میں پتا ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں سیاستدانوں نے کوشش کر کے قائد کا ایجنڈا کم کیا۔ اُن کے خلاف لوگوں کو ابھارا گیا۔ غلط قسم کی باتیں اچھالیں۔ حالانکہ اُن کے ساتھ بہت زیادتیاں کی گئیں۔ قائد نے سٹیٹ بینک کا افتتاح کیا تو اُن کے خلاف نعرے لگائے گئے۔ قائد اعظم آخری وقت جب سرک کے کنارے ۲ گھنٹے بے بسی کی حالت میں ایسویٹس میں پڑے رہے۔ ہر طرف کھیاں تھیں۔ سخت گرمی کا عالم تھا۔ فاطمہ جناح اور سسر اُن کو دوپٹے اور گتے سے ہوا دیتی رہی تھیں حقیقت یہ ہے کہ قائد سے وفا نہیں کی گئی۔

۳۔ قائد اعظم جھکتے نہیں تھے۔ جھکنا اُن کو پسند نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جسے کوئی لالچ، دولت، پیشکش جھکا نہ سکی۔ یہ صفت میں نے کسی اور سیاستدان میں نہیں دیکھی۔ ایک واقعہ ہے کہ وہ باغ میں گئے۔ سب لوگوں نے پھول توڑے مگر قائد نے پھول نہیں توڑا اور کہا کہ میں پھول نہیں توڑوں گا کیونکہ اس کے لیے جھکنا پڑتا ہے۔



ضیاء شاہد

ضیاء شاہد (مدیر اعلیٰ خبریں)

۱۔ قائد اعظم کا نام لیتے ہی پہلا تاثر جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسی شخصیت جو اصول و نظریات کے اعتبار سے ایک انتہائی مستحکم اور انتہائی بااعتماد حیثیت کی حامل تھی۔ قائد کی اصول پرستی اور اُن کا اپنے اصولوں پر اعتماد، یقین اور ایمان اس حد تک کہ وہ ہمیں گوشت پوست کا انسان نظر نہیں آتے۔ قدرت ایسے ہی کسی شخص کو ایسی عظیم حیثیت نہیں دیتی۔ اُس میں کچھ نہ کچھ خداداد خوبیاں ہوتی ہیں۔ جیسے قائد اعظم کی زندگی کا کوئی سا واقعہ لے لیں میں نے تو اُن کی زندگی پر ایک کتاب مرتب کی ہے ”قائد اعظم زندگی کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات“ اُس کا عنوان ہے۔ میں نے اُن کی روزمرہ زندگی سے چھوٹے چھوٹے واقعات جمع کیے ہیں۔ میں پی ٹی وی پر روزانہ ۵ منٹ دورانیہ کے پروگرام میں قائد کی زندگی کا ایک واقعہ سناتا رہا اور جب ایک سال میں ۳۶۵ واقعات جمع ہو گئے تو اُن کو ایڈٹ کر کے میں نے وہ کتاب مرتب کی۔

قائد اعظم کے ایک ملازم اچھا سا سرٹیفکٹ بنوانے آئے تاکہ جس کو دکھا کر ملازمت حاصل کر سکیں۔ قائد نے اُس کو ایک سرٹیفکٹ ٹائپ کرا کر دستخط کر کے دیا جس میں لکھا تھا یہ شخص میرے پاس رہا ہے۔ بڑا محنتی آدمی ہے لیکن جھگڑالو بہت ہے اور اپنی جھگڑالو طبیعت کی وجہ سے

قائد کے ذہن میں کمی نیکولر پاکستان کا تصور تک نہ تھا ہماری حالت بھاٹکے ہوئے مسافر جیسی کیوں ہے؟

جس قوم کا رہنا اتنا عظیم ہو وہ پھر بھی با م عروج پر نہ پہنچے
کیا بد نصیبی کی بات نہیں ہے؟

کاشف: ہزاراد

مرتبہ قائد نے تصویر بنوائی۔ یہ آدمی تصویر تھی۔ قائد نے کہا کہ یہ تصویر دوبارہ بنوائیں یہ ٹھیک نہیں بنی۔ کیونکہ میں نے ایک بوٹ کے تھے نہیں باندھے ہوئے۔ فوٹو گرافر نے کہا سر! بوٹ کے تھے کھلے ہوں یا باندھے ہوئے تصویر پر اس کا فرق نہیں پڑے گا کیونکہ یہ آدمی تصویر ہے۔ اس پر قائد نے فرمایا کہ تھے نہ باندھنے کی وجہ سے میرے چہرے کے تاثرات ٹھیک نہیں آئے اس لیے دوبارہ تصویر بنائیں۔ اس واقعہ سے اُن کی شخصیت میں موجود (Perfection) کھل کر سامنے آتا ہے۔ آج کل کے لوگ ہر چیز کو اتنی باریکی اور سنجیدگی سے نہیں لیتے۔

۲۔ نوجوانوں کے لیے قائد بطور رول ماڈل بہترین ہیں۔ مستقل مزاجی اور محنت جیسی خوبیوں سے نوجوان مستقبل کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ قائد نے بطور وکیل اپنا کیریئر شروع کیا اور مشکل ترین حالات کا بڑی ہمت اور حوصلہ سے مقابلہ کیا اور ایک کامیاب وکیل اور رہنما بن گئے۔ نوجوان نسل کو قائد کو کیریئر کے حوالے سے اپنا رول ماڈل بنانا چاہیے۔ قائد کی طرح اپنا عزم اور ارادہ بلند رکھیں۔ کامیابی یقینی ہے۔ قائد کی زندگی سے سبق ملتا ہے کہ کامیابی کا آغاز ناکامی سے ہوتا ہے۔ اس لیے ناکامی کے خوف سے سفارش، رشوت اور شارٹ کٹ کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔

۳۔ قائد کی تمام خوبیوں میں اُن کا سچا اور کھرا ہمن اہم ترین خوبی ہے۔ یہ پسندیدہ ہے۔ ہمارے ہاں سچ اور ایمانداری کا حلف اٹھانے کے باوجود سب لوگ جھوٹ اور مکر و فریب کا سہارا لیتے ہیں۔ اس لیے ہم ناکام ہیں۔ اللہ کی مدد ہونے کے باوجود ہم ذلیل اور رسوا ہیں۔ جبکہ مغربی دنیا اس کے برعکس ہے اور کامیاب ہے۔

گزارا سکتا ہے۔ وہ نہ تو جھکنے نہ ہی کھنکے والے تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ کہ وہ جانتے تھے کہ عوام کو ساتھ لے کر کیسے آگے بڑھنا ہے۔ نوجوانوں کے لیے تو قائد کی زندگی سے سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی، کامیابی ہے انھوں نے جو کچھ زندگی میں چاہا وہ حاصل کر لیا۔ وہ سبھی کسی کام میں ناکام نہیں ہوئے۔

۳۔ قائد اعظم میں منافقت نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی اور اُن کی یہ خوبی مجھے سب سے زیادہ عزیز اور پسند ہے۔ وہ بالکل Straight forward یعنی بے باک قسم کے بندے تھے۔ جو سوچتے تھے وہی کہتے تھے اور وہی کرتے بھی تھے۔ اُن کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا۔ ہم (May be) "شاید" کے لفظ سے شروع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن قائد کی زندگی میں یہ لفظ نہیں تھا۔ اُن کی بات میں Clarity ہوتی تھی۔ اگر مگر نہیں ہوتا تھا۔ وہ دو ٹوک بات کرتے تھے۔ وہ انسان کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ اپنے روزمرہ معمولات میں اسلام کی پرکیش کرتے تھے۔ وہ عملی مسلمان تھے۔ دکھاوے کے نہیں تھے۔ مولوی حضرات کے بہت سے کام خلاف اسلام ہوتے ہیں مگر وہ اسلام، اسلام کا شور بہت کرتے ہیں۔ قائد حقوق العباد کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہم میں بدتمستی سے دکھاوے کا اسلام ہے۔

بلال غوری (جوائنٹ ایڈیٹر انصاف)

۱۔ قائد اعظم کا نام سنتے ہی میرے سامنے ایسی شخصیت آتی ہے جو بطور وکیل، مدبر اور قائد ایک کامیاب اور کامران آدمی تھے۔ وہ ایک جاذب نظر شخصیت تھے۔ اس خصوصیت سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں۔ ایک

قائد اعظم نے پاکستان بنا کر

ایک دیوار کھڑی کر دی ہے



بلال غوری

عالم کی طویل سیاسی تاریخ میں پاکستان کے وجود میں آنے کے حوالے سے بالخصوص ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء اس لیے

ہمیشہ خاص اہمیت اور حیثیت کا حامل رہے گا کہ اس روز براعظم ایشیا میں آزادی اظہار، آئین و قانون کی بالادستی کی پاسداری اور جمہوریت پر یقین محکم اور عوام کے جمہوری حقوق کی بھرپور سر بلندی کی علمبردار ایک بے مثال عظیم کامیاب اور انتہائی باکمال شخصیت محمد علی جناح صفحہ ہستی پر نمودار ہوئی تھی، جس نے برطانوی سامراج سے آزادی اور ہندوستان کی تقسیم کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دیا اس نے برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں کو اتحاد و یکجہتی کی زبانی کلامی تلقین ہی نہیں کی بلکہ انہیں ذات پات، اونچ نیچ اور علاقائی و لسانی تعصبات اور مسلک اور عقائد کے اختلافات و تفرقات سے نکال کر حقیقت میں ایک متحد مسلمان قوم میں ڈھال دیا جس کا نصب العین حصول آزادی اور حصول پاکستان ٹھہرا۔ ہزار مشکلات، برصغیر کی ہندو اکثریت اور انگریزوں کی سازشوں سے ہراساں ہوئے بغیر قائد اعظم نے اپنے یقین محکم اور عمل پیہم کے بل پر بے مثال کامیابی سے مسلمانوں کے اتحاد کو یقینی بنایا اور عمومی اعتبار سے مختصر ترین مدت کی جدوجہد کو عظیم الشان کامیابی سے ہمکنار کر کے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ آزاد وطن حاصل کر کے دکھا دیا جو پاکستان کی شکل میں دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی مسلمان مملکت کہلانے اور تسلیم کیے جانے کا حق و اقرار پایا۔

مسلمانان برصغیر نے قائد اعظم کی رہنمائی میں یہ مملکت عظیم تو حاصل کر لی، لیکن افسوس صد افسوس قیام پاکستان کے بعد قائد اعظم کی صحت اس قابل نہ رہی کہ وہ تادیر اس قوم کی بھرپور عملی رہنمائی کر سکتے۔

☆☆

ایک فطین (Genious) اور غیر معمولی انسان، اُن کو "جناح آف پاکستان" کے مصنف شیلڈ والپرٹ نے

جو خراج تحسین (tribute) پیش کیا ہے وہ اتنا جامع حقیقی ہے کہ اُس سے بہتر الفاظ میں قائد کی شخصیت عظمت بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے:

”اگر ہم صرف زمانہ جدید کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیں تو ہمیں ایسے اولوالعزم انسانوں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے جن کے عظیم الشان کارناموں سے اقوام عالم کی کہانی روشن و مزین ہے تاہم ایسے انسانوں کے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جنہوں نے واقعات عالم کا موڑ دیا۔ پھر ایسی ہمتیں تو بہت تھوڑی ہیں جنہوں نے اپنے عزم یا الجزم سے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ اگر ایک قدم بڑھا کر ایسے افراد کی جستجو کریں جنہوں نے



مضبوط قوت ارادی اور اہل فیصلہ کے بل پر ایک قوم پر پاکستان کے تحفظ میں ہے۔ مسلم ہو یا غیر مسلم اُس ریاست قائم کر کے دنیا سے اپنی قیادت کا لوہا منوانے کے لیے راجہ لعل شہزاد کوٹلیوالہ نے اپنی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی ہمیں ایک اور صرف ایک نام ملتا ہے۔ یہ اعزاز صرف پاکستان قائد اعظم کے حصہ میں آیا جنہوں نے بیک وقت یہ تینوں کارنامے انجام دے کر تاریخ میں منفرد و یکساں حاصل کیا۔“

جس قوم کا رہنما اتنا عظیم انسان ہو اور وہ قوم عروج پر نہ پہنچے تو یہ اُس قوم کی بد نصیبی ہی کہلائے گی۔

☆☆

آزادی کے بعد ہم نے نہ صرف اپنے قائد کے بتائے ہوئے سنہری اصولوں کو فراموش کر دیا بلکہ اُن

نے ہوئے اصولوں کو تکیہ مشق بنانے سے بھی باز نہ کیا۔ اُن کے فرمودات کی من مانی رعایت کرنی شروع کر دی اور تشریح بھی ایسی کرنا حاصل صرف پاکستان کی بنیادوں کو ہلکا کرنا ہے۔ ہم یہاں مختصراً قائد کے فرمودات کی روشنی میں مکملی صورت حال کا ایک جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

پاکستان کی بنیاد و دو قومی نظریہ

تحریک پاکستان میں جس جذبہ حریت کو ایک سے زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی وہ دو قومی نظریہ تھا، جس میں اس بات کا واضح اعلان تھا کہ بننے والی مملکت کی بنیاد کلمہ طیبہ پر رکھی جائے گی جو اس کے بنیوں کی زندگی کا دستور اور ترقی کا منشور ہوگا۔

دو قومی نظریہ، جس کو نظریہ پاکستان بھی کہا جاتا ہے پاکستان کی بنیاد ہے۔ اگر قوم نظریہ پاکستان سے مخلص ہو تو وہ وطن عزیز کے تحفظ اور خوشحالی کی ضمانت ثابت ہے۔ اگر ہم نظریہ پاکستان کو حرز جاں بنالیں تو ملک کی اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی ترقی قابل فخر روایات کی بنیاد ہو سکتی ہے۔ ہمیں اپنی قوم کے بچوں، بوڑھوں، نوجوانوں اور خواتین میں یہ شعور بیدار کرنا ہوگا کہ ہماری بقا مضبوط قوت ارادی اور اہل فیصلہ کے بل پر ایک قوم پر پاکستان کے تحفظ میں ہے۔ مسلم ہو یا غیر مسلم اُس ریاست قائم کر کے دنیا سے اپنی قیادت کا لوہا منوانے کے لیے راجہ لعل شہزاد کوٹلیوالہ نے اپنی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی ہمیں ایک اور صرف ایک نام ملتا ہے۔ یہ اعزاز صرف پاکستان قائد اعظم کے حصہ میں آیا جنہوں نے بیک وقت یہ تینوں کارنامے انجام دے کر تاریخ میں منفرد و یکساں حاصل کیا۔“

جس قوم کا رہنما اتنا عظیم انسان ہو اور وہ قوم عروج پر نہ پہنچے تو یہ اُس قوم کی بد نصیبی ہی کہلائے گی۔

☆☆

آزادی کے بعد ہم نے نہ صرف اپنے قائد کے بتائے ہوئے سنہری اصولوں کو فراموش کر دیا بلکہ اُن

جو نادان دوست یہ دلیل دے کر اہل وطن کو گمراہ کرتے ہیں ذرا کبھی کسی ہندو سے بھی کہہ کر دیکھیں کہ پاکستان بننے کے بعد تم ہندو نہیں رہے اُس کا جواب ان کی طبیعت صاف کر دے گا

کہ ہندوستان کی تقسیم ہو جانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہاں برصغیر میں ۲ بڑی قابل ذکر قومیں آباد ہیں۔ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں دونوں ملکوں میں علیحدہ علیحدہ قومیں وجود میں آ جائیں گی۔ بھارت میں بھارتی قوم اور پاکستان میں پاکستانی قوم۔

پاکستانی قوم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو اس ملک کے باشندے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان مسلمان نہیں رہا اور ہندو ہندو نہیں رہا۔ جو نادان دوست یہ دلیل دے کر اہل وطن کو گمراہ کرتے ہیں ذرا کبھی کسی ہندو سے بھی کہہ کر دیکھیں کہ پاکستان بننے کے بعد تم ہندو نہیں رہے۔ اُس کا جواب ان کی طبیعت صاف کر دے گا۔

اسلام ہمارا دین ہے

قیام پاکستان کے ساتھ ہی ایک طبقہ کی جانب سے نظام حکومت اور مستقبل کے آئینی خاکے کے حوالے سے

آج اس تقریر کو بنیاد بنا کر پاکستان کی بنیادوں پر حطلے کیے جا رہے ہیں۔ قائد اعظم نے تقریر میں واضح کیا کہ اب پاکستان وجود میں آ گیا ہے۔ اگر کوئی ہندو ہے تو وہ پرانی باتیں بھول کر ایک نئے دور کا آغاز کرے جس کے مطابق وہ ایک اسلامی مملکت کا باشندہ ہے جہاں بطور ایک غیر مسلم اُس کے باقاعدہ حقوق مقرر ہیں۔ اُس کے جان و مال کا مکمل تحفظ اور اس مملکت کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح ایک پاکستانی مسلمان کے اوپر بھی ذمہ داریاں عائد ہو رہی ہیں وہ غلامی کے دور سے نکل کر اسلامی مملکت کا شہری بن رہا ہے۔ اُس کو اپنے ہر قول و فعل سے قبل یہ چیز ذہن میں رکھنی چاہیے کہ میں ایک اسلامی مملکت کا مسلمان شہری ہونے کے ناطے اپنے ہر قسم کے اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں۔

شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہا گیا کہ اس جدید دور میں شریعت کو نئی مملکت کے آئین کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں عید میلاد النبی ﷺ کے سلسلے میں منعقد ہونے والی ایک تقریب سے خطاب میں قائد اعظمؒ نے اس پراپیگنڈہ کا مسکت جواب دیا۔ آپ نے فرمایا:

”پیغمبر اسلام جناب رسالت ﷺ ایک عظیم معلم، بے مثل سٹیٹس مین، ایک ارفع محققین اور حکمران تھے۔ بیشک جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام محض چند عبادات و عقائد اور رسومات کا مجموعہ نہیں، تو بعض لوگوں کو گران گزرتا ہے۔ (لیکن یہ حقیقت ہے) کیونکہ اسلام اپنے

قائد اعظمؒ کے ذہن میں کسی سیکولر پاکستان کا تصور تک نہ تھا



ماننے والوں کے جملہ معمولات میں خواہ وہ سیاسی اور معاشی ہی کیوں نہ ہوں، راہنمائی کرتا ہے۔ اسلام انسانوں میں تفریق نہیں کرتا، برابری۔ آزادی اور بھائی چارہ دین فطرت کے بنیادی اصول ہیں اور اسلام کے یہ اصول آج بھی اتنے ہی معزز و معتبر ہیں جتنے کہ ۱۴۰۰ برس پہلے تھے۔“

نئی نظریاتی ریاست کے سربراہ کے ان خیالات کی صدائے بازگشت پوری دنیا میں سنی گئی۔ مذہب کے نام پر ریاست کی تشکیل ہی ایک اچھے سے کم نہ تھی اس پر متزاد یہ کہ اسے اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کا عندیہ دیا جا رہا تھا۔ تمام دنیا کی شیطانی قوتوں کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے پاکستان میں موجود اپنے گماشتوں کے ذریعے

زبان پر کبھی نہیں آیا لیکن اسلام کا نام ہزاروں زبان سے ادا ہوا۔ قائد اعظمؒ نے قیام پاکستان ۱۰ ابرہہ اور قیام پاکستان کے بعد ۱۴ ابرہہ میں اسلام پاکستان کی بنیاد اسلامی اصولوں پر ہوگی، قرآن ہمارا قانون اور اسوۂ حسنہ ﷺ ہمارے لیے بہترین حیات ہے۔ قائد اعظمؒ صرف بیانات تک ہی نہیں بلکہ انھوں نے علامہ محمد اسد مرحوم کو بلا کر کنسرکشن ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ پاکستان کے قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنا عمر بھر پاکستان کو اسلامی جمہوری اور فلاحی ریاست اعلانات کرتا رہا اسے سیکولر کہنا بہتان نہیں تو اسے

جمہوریت:

یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان کی کامیابی مسلح جہاد یا کسی فوجی بغاوت نہیں بلکہ استدلال کی قوت اور فکری طاقت کی مرہون منت تھی اور قائد اعظمؒ نے قوم کو اتحاد و اتفاق اور عزم و استقامت کے ذریعے انگریزوں کی مشرک سازشوں، ریشہ و انہیوں اور مخالفانہ سرگرمیوں کا صرف مقابلہ کیا بلکہ اپنے موقف کو منور کا ایک الگ دست کے قیام کو ممکن بنایا۔ پاکستان کا قیام اس امر کا ثبوت تھا کہ آزادی محض مسلح جدوجہد اور جان و مال کی قربانیوں کے ذریعے نہیں بلکہ رائے عامہ کی طاقت اور فکری قوت کے ذریعے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جمہوری

سیکولر ازم:

قائد اعظمؒ کے ذہن میں کسی سیکولر پاکستان تک نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیکولر ازم کا لفظ قائد

جمہوریت کے ساتھ مذاق میں لگن ہیں۔

قائد تو اتنے محتاط تھے کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو ایک موقع پر کسی نے شہنشاہ پاکستان کا نعرہ لگا دیا۔ قائد اعظمؒ نے اسے منع کیا اور کہا، پاکستان شہنشاہیت نہیں بلکہ ایک جمہوریت ہوگا۔

رشوت اور بدعنوانی:

قائد اعظمؒ نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا تھا ”سب سے بڑی لعنتوں میں سے ایک جس سے ہندوستان بری طرح متاثر ہوا ہے، وہ رشوت اور بدعنوانی ہے۔ یہ حقیقت ایک زہر ہے ہمیں اپنی ہاتھ کے ساتھ اسے چل دینا چاہیے اور دوسری چیز جسے میں انتہائی برا سمجھتا ہوں وہ اقرباء پروری کی برائی ہے اسے بھی بے رحمی سے چل دینا چاہیے۔“

بدقسمتی سے وطن عزیز نے رشوت، بدعنوانی اور اقرباء پروری میں اتنی ترقی کی ہے کہ ہم دنیا میں اس معاملے میں ایک بدنام ملک کی حیثیت سے مشہور ہو چکے ہیں۔ کھلم کھلا لوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے۔ سپریم کورٹ کے احکامات کی عدم تعمیل ہو رہی ہے۔ خزانہ خالی ہو رہا ہے ملک کے ڈیپالٹ ہونے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے، لیکن لوٹ مار کا سلسلہ رکنے کا نام نہیں لیتا اور صورت حال یہ ہے کہ ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے۔

پاک فوج کا مقام:

قائد اعظمؒ نے ایک جمہوری جدوجہد کے ذریعے پاکستان حاصل کیا تھا اور وہ اٹھتے بیٹھتے جمہوریت کا اعلان کرتے تھے، ان کا آخری دم تک یہی موقف تھا کہ آرمی کا

پاکستان میں جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر رکھنی چاہئیں

قائد کی دُور رس شخصیت کے ساتھ مفادات کی شریک حکمرانوں نے اس مسئلہ کا حل نہ نکالا اور پھر نے نقصان بھگتنا۔

☆☆

حرفِ آخر:

گچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے قائد کے فکر کی پاسداری نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری منزل سے ہٹکے ہوئے مسافر کی سی ہے اور آج ہم مسائل میں گھرے ہوئے ہیں کہ جن کا حل ہماری ہمت والا ہے۔ آج بھی ہم قائد اعظم کے ارشادات کی میں صحیح سمت میں اپنے سفر کا آغاز کردیں تو یہ ملک کے دہانے سے باہر نکل سکتا ہے۔ جو ہر سعیدی نے درست کہا ہے:

یہ کوہ کوہ، خود سری۔ یہ کاہ کاہ، پر ہی
یہ سرد سرد، حوصلے۔ یہ گرم گرم، گمر ہی!
یہ دشت دشت، وحشیتیں۔ یہ شہر شہر، بے دلی
یہ داغ داغ آرزو۔ یہ زخم زخم، زندگی
دھواں دھواں، دماغ ہے
کے فصل درود داغ ہے

مگر یہ سب، دل حزیں۔ تمام زندگی نہیں!
ہماری آتش بقاء۔ دلی تو ہے، کبھی نہیں
کرے گا چھاؤں، آسمان۔ رہے گی، پاک سرزمین
چھپی ہوئی، حیات نو۔ ہمیں میں ہے، ہمیں نہیں
رہے گی تا ابد، جواں۔ ہمارے باغ ملک و دیں
نہ ہوگی خاک و خوں میں گم۔ مجاہدوں کی سرزمین
چھنے گا، یاس کا ڈھواں۔ جلے گی ”مفعول یقین“
یہ وادیاں، یہ بستیاں۔ ہمارے دم سے ہیں حسیں
یہ جسم ہیں تو، جاں ہیں ہم
انہیں کے پاسباں ہیں ہم

بے پناہ وسائل کے باوجود کنٹرول کرنے میں کامیاب نہیں ہوا، اُن لوگوں کو پیار و محبت سے تو ساتھ رکھا جاسکتا ہے لیکن ہندو کی نالی کے ذریعے ڈرایا نہیں جاسکتا کیونکہ ہتھیار تو اُن کے پیچھے پیچھے کے پاس ہوتا ہے۔ آپ نے قبائلی علاقوں کو کنٹرول کرنے کے لیے انگریزوں کی بنائی ہوئی پالیسی مسترد کردی اور کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام فوج کو قبائلی علاقوں سے ہٹایا۔ ۱۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو قبائلی جگہ سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

”آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی وفاداری کو منظر رکھتے ہوئے ہم نے وزیرستان سے اپنی فوجیں ہٹائی ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم آپ پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں اور آپ حضرات کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔“

آج ہمارے لاکھوں فوجی وزیرستان اور دیگر قبائلی علاقوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں۔ شیلی وزیرستان پر حملہ کر کے اپنی اور پورے ملک کی برادری کا سامان کرنے کا ارادہ ہے۔ اربوں روپیہ اس جنگ میں جھوٹا جاکچا اور ابھی نجانے مزید کتنا ڈبونا ہے۔

قومی زبان:

قائد اعظمؒ کی زندگی میں ہی قومی زبان کا مسئلہ سامنے آگیا تھا کہ اُردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان قرار دیا جاتا تو علیحدگی کا مسئلہ کبھی پیدا ہی نہ ہوتا۔

یہ علاقہ

پنجابیوں، سندھیوں
بلوچیوں، پٹھانوں
یا بنگالیوں کا نہیں
بلکہ آپ سب
کا ہے



2012 کی بہترین

طبیعی ایجادات

جوتا گھڑی، موبائل فون..... اور اسی قسم کی دیگر بہت سی اشیاء ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے، ہم دھیان ہی نہیں دیتے کہ معمولی سی ایجاد بھی جنم لینے میں کتنی برس لیتی ہے۔ محقق برسوں شبانہ روز محنت کرتے ہیں تب ایک ایجاد ہمارے سامنے آتی ہے۔ دنیائے طب میں تو ایجادات مزید وقت لیتی ہیں کیونکہ انہیں ہر حال میں انسانوں کے لیے محفوظ اور مؤثر ہونا چاہئے۔ ذیل میں ایسی بے مثال طبی ایجادات کا تذکرہ پیش ہے جو سال رواں میں وجود میں آئیں یا تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ ان ایجادات کی خوبی یہ ہے کہ یہ انسانی علاج کے جاں گسل مراحل کو آسان بنادیں گی

عاصم محمود

ذیابیطس کے کئی مریضوں کو باقاعدگی سے اپنا جسم چھیننا پڑتا ہے تاکہ خون میں گلوکوز یا شکر کی سطح دیکھ سکیں۔ یہ عمل خاصا تکلیف دہ ہے کیونکہ بدن میں جگہ جگہ چھید ہو جاتے ہیں۔ مریضوں کو ذیابیطس کی اس مشکل کو مد نظر رکھ کر کینیڈا کی ویسٹرن اونٹاریو کے محقق جن زیانگ نے ایک کرشماتی لینز ایجاد کیا ہے۔ جب خون میں شکر کی سطح بڑھ جائے، تو وہ سرخ ہو کر مریض کو اس امر کی اطلاع دیتا ہے۔

یہ کنٹیکٹ لینز دراصل ننھے ننھے ”نیمو (Nano) ذرات“ رکھتا ہے۔ یہ نیمو ذرات آنسوؤں کے محلول (Tear Fluid) میں مسلسل شکر کی سطح کو چیک کرتے ہیں۔ جب بھی سطح بڑھے، تو وہ اپنا رنگ تبدیل کر کے سرخ ہو جاتے ہیں۔ اس عمل کے دوران انسان کی بصارت بالکل متاثر نہیں ہوتی۔ چنانچہ خون میں سطح شکر کی پڑتال کرنے کے سلسلہ میں یہ بڑا اہل اور موثر جدید آلہ ہے۔ یہ واضح رہے کہ آنسوؤں کے محلول میں خون کی نسبت شکر کی سطح ۳۰ درجہ بعد بڑھتی ہے۔ تاہم بیشتر مریض جلد چھیدنے کے دور محلوں کے درمیان چند گھنٹوں کا وقفہ رکھتے ہیں لہذا یہ بے ضرر کنٹیکٹ لینز انھیں جلد چھیدنے کے تکلیف دہ عمل سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

نئی قسم کی ویکسین

انسانی جسم میں ویکسین سرخ کے ذریعے داخل کی جاتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بدن انسان میں جو ”مامون“ (Immun) یا ہمیں بیماریوں سے محفوظ رکھنے والے خلیے ہیں، وہ تندرست و توانا ہو جائیں اور بیماری کا بخوبی مقابلہ کریں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ویکسین بہت کم مامون خلیوں تک پہنچ پاتی ہے۔ یہی مسئلہ مد نظر رکھ کر آسٹریلیوی یونیورسٹی آف کوئنزلینڈ کے محقق، پروفیسر مارک نے ایسی چھپی تیاری کی ہے جس پر ننھے ننھے نوکیلے اُبھار ہیں۔ جب ان اُبھاروں پر ویکسین لگائی جائے، تو وہ اسے جلد کی بالائی سطح پر موجود مامون خلیوں تک براہ راست پہنچا دیتے ہیں۔ (انسانی جسم میں اسی جگہ سب سے زیادہ مامون خلیے ملتے ہیں۔ یوں نہ صرف ویکسین فوراً مامون خلیوں تک پہنچتی ہے بلکہ ٹیکا لگانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اس چھپی کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں خشک ویکسین گنتی ہے جسے ریفریجریٹر میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ مزید برآں وہ زیادہ عرصہ چلتی ہے۔ چنانچہ اسے غریب ممالک میں بکثرت استعمال کرنا ممکن ہے جہاں شہروں میں ریفریجریٹر کم ملتے ہیں۔ نیز کسی وبا کے دوران یہ چھپیاں ہزاروں لاکھوں مریضوں کی جانیں بچا سکتی ہیں۔



نسوں کی شناخت ہوئی آسان

ایک کلینک یا ہسپتال میں تجربہ کار نرسیں یا ڈاکٹر بھی عموماً مریض کے بدن میں متعلقہ نس ڈھونڈتے ہوئے خاصے پریشان ہوتے ہیں خون لینے یا ٹیکا لگانے کے لیے۔ ایک تحقیق سے انکشاف ہوا کہ ۵۰ فیصد تک پہلی کوشش ناکامی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ امریکی ماہرین نے ”نس شناخت کنندہ“ (Vein Viewer) ایجاد کیا۔ اس کے ذریعے جلد کی اربلی میٹر گہرائی



تک کسی بھی نس کو تلاش کرنا ممکن ہے۔ یہ آلہ انسانی بدن پر سبز رنگ کی ”نزد-زیریں“ سرخ (Near-Infrared) روشنی چھوڑتا ہے۔ یہ روشنی جلد کو بالکل نقصان نہیں پہنچاتی اور نہ ہی حرارت پیدا کرتی ہے۔ یوں اس انوکھے آلے نے نسوں کی تلاش کا کھن کام آسان بنادیا۔ یہ آلہ امریکا اور سنگا پور کے ہسپتالوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے خصوصاً بچوں میں ٹیکا لگنے کا خوف کم ہو گیا اور وہ اس کی سختی سبزوشتی پسند کرتے ہیں۔

نوزائیدہ بچے بچانے کا نیا طریقہ

جیسے ہی بچہ جنم لے، نرس یا دایہ آنول نال کاٹ دیتی ہے، لیکن آسٹریلیا میں وینر سٹرفار نیوبورن سے منسلک سائنسدان ڈاکٹر ویم تارنو نے دریافت کیا ہے کہ اگر دو تین منٹ انتظار کر لیا جائے تو بچہ کمی خون (Anaemia) کے مرض سے بچ سکتا ہے۔

دراصل جب بچہ جنم لیتا ہے، تو اس کے جسم کا بیشتر خون پیچھڑوں کی نالیوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ یوں دیگر اعضائے جسم میں کمی خون کا خلل جنم لے کر مختلف خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ لیکن نرس یا دایہ بچے کی پیدائش کے بعد اُسے دو تین منٹ



آنول سے نیچے تھامے رکھے، تو ماں کے جسم سے اُسے مزید خون مل جاتا ہے۔ یوں کمی خون پیدا نہیں ہوتی۔ مزید برآں اس عمل کے ذریعے بچے کے بدن میں فولاد کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ ہو جاتا ہے۔

مرہم پٹی کی جدید قسم

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ زخم پر روزانہ نئی مرہم پٹی ہونی چاہیے تاکہ پتہ چلتا رہے کہ وہ ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی نئی مرہم پٹی ہوتی ہے تو نہ صرف عمل صحت یابی رکتا ہے، بلکہ زخم سے نئے جراثیم بھی چبٹ سکتے ہیں۔ یہی مسئلہ حل کرنے کی خاطر میونخ، جرمنی میں فراؤ ہوفر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ فار موڈرن سولڈ سٹیٹ میڈیکل لوجی کے ماہرین نے نئی قسم کی مرہم پٹی ایجاد کی ہے۔

اس مرہم پٹی کا کرشمہ یہ ہے کہ وہ چھوئے بغیر معالج یا مریض کو بتا دیتی ہے کہ اُسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ دراصل یہ نئی مرہم پٹی اپنا رنگ تبدیل کر کے اس امر کی اطلاع دیتی ہے۔ اس جادوئی مرہم پٹی کا راز ایسی ڈائی (Dye) میں پوشیدہ ہے جو جلد کی بدلتی پی ایچ (PH) سطح نوٹ کر کے اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ دراصل صحت مند اور مندرجہ شدہ زخم کی پی ایچ قدر (ویلیو) ۵ سے نیچے ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ قدر ۶.۵ اور ۸.۵ کے مابین ہو، تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ زخم ٹھیک نہیں ہوا۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ نئی ڈرینگ ہونی چاہیے۔

ایک تیر سے دو شکار

چند سال قبل امریکی ماہرین طب نے انبریل (Enbrel) نامی دوا ایجاد کی تھی۔ یہ ”امراض خود منبج“ (Autoimmune disorders) دور کرنے میں کام آتی ہے۔ (یعنی وہ امراض جن میں انسانی بدن از خود حرکت کرنے لگتا ہے)۔ اب پتا چلا ہے کہ یہ اہم دماغی مرض، الزائمر میں بھی مفید ہے۔ اس مرض میں مبتلا مریض بتدریج اپنی یادداشت کھو بیٹھتا ہے۔

یہ دوا ایک خاص پروٹین، ٹی این ایف (ٹیو مینکرو پوسیس فیکٹر) کو نشانہ بناتی ہے۔ یہ پروٹین الزائمر کے مریضوں کے دماغ میں غیر معمولی طور پر زیادہ پایا جاتا ہے۔ جب دوا بذریعہ انجکشن گردن میں داخل کی جائے، تو یہ بہت جلد پروٹین کی سطح معمول پر لے آتی ہے۔ یوں مریض کی یادداشت بہتر ہوتی اور وہ ارتکاز کی قدرت بھی حاصل کر لیتا ہے۔

جسم انسانی کے پرزہ جات

انسان کا کوئی عضو خراب ہو جائے، تو پھر اسے ہمیشہ کے لیے اس سے ہاتھ دھوئے پڑتے ہیں۔ خصوصاً آنکھ، پتہ، کان وغیرہ خراب ہو جائے تو انسان آئندہ زندگی گزارتے ہوئے بڑی تکلیف برداشت کرتا ہے لیکن اب رفتہ رفتہ صورت حال بدل رہی ہے۔ یورپی اور امریکی ماہرین طب و سائنسدان ہر سال قدم بہ قدم ششٹی و مصنوعی اعضا بنانے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب تک مشینی بازو، ٹانگیں، آنکھیں، کان وغیرہ ایجاد ہو چکے۔ اب اگلا مرحلہ ایسے مصنوعی اعضا بنانے کا ہے جو انسانی اعضاء جیسے نہیں تو کم از کم ان سے ملتے جلتے ضرور ہوں۔

دماغ: امریکی یونیورسٹی آف ساؤتھرن کیلی فورنیا نے بذریعہ نیونیکینالوجی ایسا نسخہ مارتی سرکٹ بنایا ہے جو بالکل نیورون کی طرح کام کرتا ہے۔ واضح رہے، ہمارا دماغ انہی نیورونوں کا مجموعہ ہے۔

یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے کیونکہ دماغ کا ایک بھی نیورون خراب ہو جائے، تو پھر اس کی مرمت نہیں ہو سکتی۔ اگر ماہرین طب مصنوعی نیورون ایجاد کر لیں، تو یوں پیشتر دماغی امراض کا علاج آسان ہو جائے گا۔

تاہم ماہرین نے ابھی کئی ٹکھن مراحل طے کرنے ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ۲۰ برقی سرکٹوں کو باہم کیونکر ملایا جائے کہ وہ باہمی ربط ضبط سے کام کرنے لگیں، جیسے ۲۰ دماغی نیورون اپنی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں۔ پھر دماغ میں نیورونوں کے مابین مسلسل نئے جوڑ بننے رہتے ہیں۔ ماہرین کو اس مشکل سے بھی عہدہ برآہ ہونا ہے۔

پتہ: امریکی سائنس دان ایسا مصنوعی پتہ بنانے کے قریب ہیں جو ذیابیطس قسم اول کا شکار لوگوں میں نظام انسولین منظم کرے گا۔ انسولین پمپ اور گلوکوز سینسروں پر مشتمل یہ مصنوعی عضو جسم میں انسولین کی درست مقدار خارج کرے گا اور خون کے مسلسل ٹیسٹوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یوں مستقبل میں ذیابیطس کے قسم اول کے لاکھوں مریضوں کو روزانہ انسولین لینے اور خون کے ٹیسٹ کرانے سے نجات مل جائے گی۔

آنکھ: آسٹریلیوی سائنسدان اگلے سال تک مصنوعی آنکھ ایجاد کر لیں گے۔ یہ مصنوعی آنکھ ایک مائیکرو چپ اور برقی عینک پر مشتمل ہے۔ مائیکرو چپ پردہ چشم (Retina) پر نصب ہوگی۔ پھر بینائی سے محروم فرد برقی عینک لگائے گا۔ یہ برقی عینک جو مناظر دیکھے گی، انتہائی طاقتور بیڈیائی سکینوں کی صورت مائیکرو چپ کو بھجوائے گی۔ چپ سکینوں کو برقی تحریکی لہروں (Impulses) میں بدلے گی۔

پردہ چشم فطری انداز میں ان برقی تحریکی لہروں بذریعہ بصری عصب (Optic Nerve) دماغ تک پہنچائے گا۔ دماغ پھر انسان کو اس قابل بنادے گا کہ وہ منظر خاصی حد تک دیکھ سکے۔ ماہرین کے مطابق یہ مصنوعی آنکھ بوڑھے مردوزن کے لیے خصوصاً مفید ثابت ہوگی جن کی بینائی عمر کے باعث کمزور ہو جاتی ہے۔

جادوئی آئینہ

امریکی یونیورسٹیوں ایم آئی ٹی اور ہارورڈ کے ماہرین مل کر ایسا کرشماتی آئینہ ایجاد کر رہے ہیں جو برش کرتے انسان میں بغیر کسی رفتار، دل کی دھڑکن، سانس لینے کی شرح نوٹ کرے گا۔ یہ عام آئینہ کی طرح ہی ہوگا، مگر ایک ڈیجیٹل باکس کی طرح درج بالا انسانی جسم کے اشارے عیاں کرے گا۔ اس آئینے میں ایک طاقتور مائیکرو نصاب ہے۔ وہ چہرے پر خون کی نالیوں میں بہاؤ کے معمولی انحراف کو بھی نوٹ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی انحراف جان کر وہ بتائے گا کہ اس وقت ہماری رفتار بغیر، حرکت قلب اور رفتار تنفس کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ آئینے میں ظاہر ہونے والا یہ ڈیٹا بذریعہ انٹرنیٹ خاندانی ڈاکٹر کو بھیجا جائے گا۔ وہ پھر روزانہ اور ماہانہ کا حساب رکھ کر اس امر پر نظر رکھے گا کہ فرد کسی مرض میں مبتلا تو نہیں ہو رہا؟

دماغ ٹھنڈا کرنے والا کوثر

سویڈن کے طبی ادارے، کارولنسکا انسٹی ٹیوٹ کے محققوں نے بعد از تجربات دریافت کیا ہے کہ اگر ہارٹ ایک کے فوراً بعد مریض کو تھیراپیوٹک ہائپوٹھرمیا (Therapeutic Hypothermia) فراہم کیا جائے (یعنی دانستہ اس کا دماغ و بدن ٹھنڈا کر دیں) تو وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ سکتا ہے لیکن یہی عمل بعد از وقت اپنایا جائے، تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

یہی دریافت مد نظر رکھ کر ادارے کے محققین نے ”رائوچل“ نامی ایک کولر ایجاد کیا ہے۔ یہ کولر ناک کے ذریعے مادہ تبرید براہ راست بدن اور دماغ تک پہنچاتا ہے۔ اگر ہارٹ ایک کے بعد ۱۰ منٹ کے اندر اندر مریض کو سی پی آر اور رائوچل کا مادہ تبدیل جائے، تو وہ ۹۰ فیصد تک خطرہ کم کرتا ہے اور متاثرہ شخص کے دماغ کو بھی نقصان نہیں پہنچتا۔ رائوچل بجلی کے بغیر بھی کام کرتا ہے۔

چھاتی کے سرطان کا بہتر معاینہ

دنیا میں ہر سال ہزار ہا خواتین چھاتی کے سرطان (کینسر) کا نشانہ بنتی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اب تک کوئی ایسا سکنز نہیں تھا جو ابتدائی میں سرطانی کھٹی کو شناخت کر سکے۔ چنانچہ جب سرطانی خلیے خاتون کے جسم میں جڑ پکڑ لیتے ہیں تو اس وقت کا علم ہوتا مگر اب یہ تکلیف ریف ہونے والی ہے۔ برطانوی سائنسدانوں نے ”ملٹی سٹیک اسٹریٹجک“ (Multistatic Array processing for radiowave image acquisition) نامی ایک مشین تیار کی ہے۔ یہ مشین ریڈیائی لہروں کے ذریعے چھاتی کی گہری بافتوں میں چھپی کھٹی کو بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ گویا اب خواتین کو چھاتی کا باقاعدہ معاینہ کرانے کی ضرورت نہیں، بس سال میں درج بالا مشین سے اسکریننگ کرانا کافی ہے۔

بال بچانے والی ٹوپی

اگر کوئی سرطان کا علاج بذریعہ کیموتھراپی کروائے تو عموماً سر کے بال جھڑ جاتے ہیں۔ یوں وہ خاصا عجیب نظر آتا ہے۔ اب امریکی ماہرین نے دوران کیموتھراپی سر کے بال محفوظ کرنے والی خصوصی ٹوپی تیار کی ہے۔ یہ سر ٹھنڈا رکھ کر ۸۰۰ فیصد بال گرنے نہیں دیتی۔ ڈیگنیکپ (Dignicap) سٹم نامی یہ سیلیکون ٹوپی ۲۸ کواکوں پر مشتمل ہے۔ ان میں موجود مادہ تبرید (Coolant) مسلسل سر کے ارد گرد چکر لگاتا اور اسے سرد رکھتا ہے۔ جب مریض یہ ٹوپی پہنتے تو سر میں خون کی نالیاں بھج جاتی ہیں۔ یوں ان میں خون کا بہاؤ کم ہوتا اور کیموتھراپی کے اثرات سرطان میں مبتلا مردوزن مریضوں کے خوبصورت بال دوران علاج محفوظ رہتے ہیں۔

موبائل اسکینر

دور جدید میں الٹراساؤنڈ بڑے کام کا طبی آلہ ہے۔ اس کے ذریعے کئی بیماریوں کا بروقت پتا چل جاتا اور بذریعہ علاج انہیں ختم کرنا آسان ہوتا ہے۔ الٹراساؤنڈ کی زبردست افادیت دیکھ کر ہی جرمن سائنس دانوں نے موبائل فون جتنا الٹراساؤنڈ اسکینر ”وی اسکین“ ایجاد کر لیا۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اسے کہیں بھی لے جانا ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکا میں کئی ڈاکٹر اسے ایکوکارڈیوگرافی، لپ، آؤٹ پوشڈ کلینک، کورونری کیئر یونٹ، ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ اور ہسپتال کے دیگر شعبہ جات میں لیے کھومتے پھرتے ہیں۔ ایک ہسپتالی ڈاکٹر جوز زامورانو کا کہنا ہے ”میری بھی شعبے میں زیر علاج مریض کو کبھی الٹراساؤنڈ کی ضرورت پڑے تو میں فوراً اپنا وی اسکین نکال لیتا ہوں۔ اس کی وجہ سے اب مریضوں کا علاج آسان ہو گیا۔“



خراٹے ختم کرنے والا تکیہ



جو لوگ نیند کی ایک بیماری آپسزیکو سلیپ اپنویا (Obstructive Sleep apnoea) میں مبتلا ہوں، وہ بڑے زوردار خراٹے لیتے ہیں۔ اس طبی غلغلے میں نہ صرف جسم میں خون کا دباؤ کم ہوتا بلکہ خون میں آکسیجن کی مقدار بھی گھٹ جاتی ہے۔ خون کا دباؤ اور آکسیجن کی مقدار جتنی کم ہوگی، فرد اتنے ہی با آواز بلند خراٹے لے گا۔ یہ خراٹے دوسروں کی بھی نیند حرام کر دیتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ٹوکیو کی واسیدہ یونیورسٹی کے محققوں نے قطبی رچھہ نما ایک آلٹو کھاشی تکیہ ایجاد کیا ہے۔ اس تکیہ میں حس آلات (Sensors) نصب ہیں جو خراٹوں کی آواز، خون کا دباؤ اور آکسیجن کی سطح نوٹ کرتے ہیں۔ جب بھی خراٹے بلند ہوں اور خون کا دباؤ کم ہو جائے، تو تکیے کا مشینی بازو حرکت میں آتا اور ہولے سے چہرے یا سر پر ٹھوکا دیتا ہے۔ ٹھوکے کے باعث فرد کو نوٹ بدلتا ہے، یوں اس کی سانس معمول پر آ جاتی ہے۔

باتیں دانش کی

رفیدہ کلیم فاروقی

کہا حضرت علی المرتضیٰ نے (مارچ ۵۹۸ء - جنوری ۶۶۱ء)

- 1 جو حق بات کہنے سے خاموش رہتا ہے، گونگا شیطان ہے۔
- 2 شرافت اور رذالت کا پتا آزمائش کے وقت چلتا ہے۔
- 3 میں نے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے اور عقدوں کے حل ہونے سے پہچانا ہے۔
- 4 جو شخص کھانے کے سبب بیمار ہوتا ہے اس کے لیے یہ بات سخت باعث شرم ہے۔
- 5 دوسروں کے ان عیوب کی تشہیر نہ کرو جن پر اللہ پردہ ڈال رہا ہو۔
- 6 کمینے انسان کو جب بڑا تبدیل جاتا ہے تو وہ سرکشی کی راہ پر چل پڑتا ہے۔
- 7 جو ان مرد وہ ہے جو اپنے مال سے اپنی عزت کی حفاظت کرے اور کمینہ وہ ہے جو اپنی عزت کی قیمت پر مال حاصل کرے۔

آپ کا نام ابوالحسن تھا۔ والد کا نام ابو طالب جو کہ حضور ﷺ کے حقیقی چچا تھا۔ والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد تھا۔ آپ حضور ﷺ کے چچے بھائی تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۲ ربیع ۳۰ عام اقلیل میں خانہ کعبہ میں ہوئی۔ پہلے مرد مسلمان تھے۔ آپ کے والد اور والدہ دونوں قریش کی ایک ختم و منتر شاخ بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت عثمان کی شہادت کے باوجود بنو ہاشم پر اصرار آپ کو مسجد نبوی میں لائے۔ آپ معبر رسول ﷺ پر رونق افروز ہوئے۔ لوگ بیعت کرنے لگے۔ جنھوں نے انکار کیا ان کو مجبور نہ کیا گیا۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، عشرہ مبشرہؓ میں سے چند اصحابؓ، انہیں اور دیگر لوگ شامل تھے۔ اہل مکہ نے بھی بیعت سے انکار کر دیا۔ کچھ غیر جانبدار رہے اور کچھ آپ کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ تھے۔ آپ کے خلاف نہ تھے ہی حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مسئلہ درپیش تھا۔ یہی مسئلہ جنگ جمل کا باعث بنا۔ حضرت عمرؓ کا رعب و دبدبہ لوگوں پر لرزہ طاری کر دیتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے علم و بردباری اور نرم مزاجی سے لوگ نرم ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ نے دوبارہ عہد فاروقی کی روش اختیار کی تو انصاف کو ترجیح دی، غیر ضروری مراعات سے احتراز کیا۔ لیکن بقول ڈاکٹر طلحہ حسین بلجوعہ آپ کے دور خلافت میں لوگوں کی اداسی بدستور قائم رہی۔ باقی مدینہ کی گلیوں میں دندناتے پھرتے رہے اور غور و انتشار کا ایک نیا سلسلہ چل نکلا۔

آپ نے نہایت بلند موصلاً، بزرگ، باک، خدا ترس، عالم و فاضل، امین، اسلام کے سچے جان نثار، حضورؐ سے محبت کرنے والے، اور حد درجہ مہربان و نرم گیر تھے۔ فہم قرآن میں یکتا اور منصف مزاج تھے۔ اسلامی فقہ اور قانون میں مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ریاضی اور دیگر علوم میں درک حاصل تھا۔ آپ ۳۶ء ۴۰ء تک مسند خلافت پر متمکن رہے۔ حضور ﷺ نے آپ کو اپنی نوار عطا فرمائی تھی وہ انصاف کہا جاتا تھا۔ یہ گھوڑی کے توبہ کا بیڑی میں موجود ہے۔ آپ کو ۲۱ رمضان ۴۰ء میں ابن ہشام نے گود کی مسجد میں اس وقت شہید کیا جب آپ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ آپ کا دفتر نجف اشرف (عراق) میں ہے۔

ہائپرٹینشن کا خاتمہ

ماہرین طب جان چکے ہیں کہ ہمارا "شارکی نظام اعصاب" (Sympathetic Nervous system) ہمارے بیشتر اندرونی اعضا کو کنٹرول کرتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جو مردوزن بلند فشارخون (ہائی بلڈ پریشر یا ہائپرٹینشن) کے مریض ہوں، ان میں گردوں کے نزدیک واقع شارکی اعصاب زود حساس ہو جاتے ہیں۔ یہ خرابی پھر ہائی بلڈ پریشر میں اضافہ کرتی ہے۔ ۲/۳ سال قبل اس خرابی سے چھٹکارا پانے کی خاطر آسٹریلیوی ماہرین طب نے ایک نئی قسم کا طریق آپریشن دریافت کیا۔ اس آپریشن میں بذریعہ جانگھ گردوں کے نزدیک واقع ایک شریان تک کیٹھو داخل ہوتا ہے۔ اسی شریان کے نزدیک شارکی اعصاب واقع ہیں۔ بذریعہ کیٹھو پھر انھیں "سلا" دیا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ محفوظ آپریشن بہت جلد انجام پاتا ہے اور بدن میں کٹاؤ بھی بڑا نہیں لگتا۔ مزید برآں اس کی وجہ سے فوراً بلند فشارخون میں کمی آ جاتی ہے۔ اب تک ۱۰ ہزار مردوزن یہ آپریشن کرا چکے اور ۹۰ فیصد تک کو کامیابی نصیب ہوئی۔

چل کر بے سکونی ختم کیجیے

مغرب میں ادراکی رویہ (Cognitive behavioural) علاج کے ذریعے بے سکونی یا تشویش ختم کرنے کی سعی ہوتی ہے۔ یہ طریق علاج سب پر کارگر ثابت نہیں ہوا۔ تاہم ماہرین طب نے یہ ضرور دریافت کر لیا کہ بعد از علاج اگر چہل قدمی یا تھوڑی بہت ورزش کی جائے، تو اس سے نتائج پر مثبت اثر پڑتا ہے۔

دراصل معمولی ورزش کرنے سے بھی ہمارا بدن ایک نیورونسمیٹر گلوٹامائٹ خارج کرتا ہے۔ یہ مادہ سکھلائی کے عمل میں ہماری مدد کرتا ہے۔ چنانچہ علاج کے بعد معتدل ورزش کی جائے، تو مریضوں کو رویے سیکھنے میں آسانی رہتی ہے۔ اس طرح علاج بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

کام ہوا آسان

۱۵ سال قبل ہپتالوں میں مصروف کارڈیالوجسٹوں کو کسی طبی مسئلہ سے پالا پڑتا، تو وہ گھنٹوں لائبریری میں رہتے اور حل کی تلاش میں سرکھپاتے لیکن اب انٹرنیٹ نے

ان کا کام بہت آسان بنا دیا۔ آج ڈاکٹر چلتے پھرتے اپنے سمارٹ فون یا پبلک ٹاپ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ۱۰ منٹ میں دقیق طبی مسئلہ کا حل بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

سرطانی خلیے منتوں میں ختم

آج خدا خواستہ کوئی انسان سرطان کا نشانہ بن جائے، تو اُسے کیموتھراپی اور ریڈیو تھراپی کے جاں گسل مراحل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن سویڈش سائنس دانوں کی سعی و مہربانی سے علاج کی مدت بہت گھٹ سکتی ہے۔ کارولنسکا انسٹی ٹیوٹ نامی سویڈش طبی ادارے سے وابستہ ماہرین نے بریفرینیل ریڈیو فریکوئنسی امپلیشن نامی طریق علاج ایجاد کیا ہے۔ اس طریقہ میں "آبال کر" سرطان کے تمام خلیوں کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے ایک الیکٹروڈ سرطانی گلی کے قلب میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اُسے ۹۰ درجے پینٹی گریڈ تک گرم کیا جاتا ہے تاکہ تمام سرطانی خلیے ختم ہو جائیں۔ خاص بات یہ ہے کہ گلی کے ارد گرد موجود بافتوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔

کہا کنفیوشس نے (۴۷۹-۵۵۱ قبل مسیح)

- 1 دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔
- 2 اگر تم کسی چھوٹی چیز پر نظر لگائے بیٹھے ہو تو بڑی چیزیں کبھی نہیں ملے گی۔
- 3 ایک اندھا دوسرے اندھے کی قیادت کرے گا تو دونوں غار میں گرے گی۔
- 4 اگر تم ایسی باتیں سنو جو تمہیں ناگوار محسوس ہوں تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کر کہہیں یہ باتیں صحیح تو نہیں؟
- 5 تاریکی کو کوسنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ ایک ننھا سا دیا ہی روشن کر دیا جائے۔
- 6 جس طرح مچھلی دانے کو دیکھتی ہے دام (کانٹے) پر اس کی نظر نہیں جاتی اسی طرح نادان نفع کو دیکھتا ہے، ضرر (نقصان) تک اس کی نگاہ نہیں پہنچتی۔
- 7 سب سے بڑی فتح مندی کرنے اور گر کر اٹھنے کی طاقت حاصل کرنے میں ہے۔

چینی مفکر مصنف، سیاستدان، فلسفی کنفیوشس قدیم چین کی ریاست "لو" (Lu) میں ژو (Zu) کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام کوک ہی (جسے شیانگ بھی کہتے ہیں) تھا، جو لو (Lu) کی فوج میں افسر تھا۔ کنفیوشس ۳۳ سال کی عمر میں یتیم ہو گیا۔ اس کی ماں نے اسے انتہائی غربت اور کسبہ کی حالت میں پالا۔ اس نے گڈریے، کلرک اور نشتی گیری کا کام کیا۔ ۳۱ سال کی عمر میں اس نے ماں کی وفات پر ۳۳ سال تک اس زمانے کی رسم کے مطابق سوگ منایا۔

اس کی زندگی میں بہت نشیب و فراز آئے۔ جنگوں اور تباہی اور بربادی کا مشاہدہ کیا۔ حکومتوں کو بٹنے، بگڑتے دیکھا، حکمرانوں کا عروج و زوال دیکھا۔ اس نے اپنی عقل و دانش کی بنا پر شہرت حاصل کی اور ۵۰ھ قبل مسیح میں ایک چھوٹے قصبے کا گورنر بنا دیا گیا۔ جلد ہی وہ وزیر خزانہ کے عہدے تک ترقی کر گیا۔ وہ اپنے زمانے کے حکمرانوں کے دل میں اپنا احترام پیدا کرنے میں کافی کامیاب رہا۔ سب اس کی پیش بینی، عملی سیاسی قابلیت اور انسان کے کردار کو سمجھنے کی صلاحیت کے قائل تھے۔ اس نے اپنے ملک کو مضبوط بنانے میں زبردست کردار ادا کیا۔ مگر وہ اپنی آئینہ دل اصلاحات کو سن و من نافذ نہ کر سکا۔ اس دوران میں ملک میں بہت سے طاقتور لوگ اس کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ ۴۹۷ قبل مسیح میں ویکانٹ جی ہوا کے رویے سے تنگ آکر اس نے جلاوطنی اختیار کر لی اور ویکانٹ کی زندگی میں وطن واپس نہیں آیا۔

اس نے سماجی رشتوں کی پاسداری، اخلاق و کردار کی پاکیزگی اور انصاف و اخلاص کا سبق دیا۔ بہت ہی گامیائیں تحریریں جن میں ۵۰۰ کا سکس بھی شامل ہیں اس نے منسوب کی جاتی ہیں۔ اس کے اقوال پر مشتمل "ہیٹلش" اس کی وفات کے کئی سال بعد مظاہر عام پر آئی۔ بہت سی چینی روایات اور اعتقادات کی بنیاد اس کے پیش کردہ اصولوں پر ہیں۔ وہ خاندان سے وفاداری، بزرگوں کے احترام، بیویوں کا شوہر اور بچوں کے بزرگوں کے لیے احترام پر زور دیتا ہے۔ اس نے خاندان کی حکومت کی بنیاد قرار دیا۔

کلسی سے

ماہ رفتہ میں رونسا ہونے والے
اہم واقعات اور ان سے
وابستہ شخصیات کا اجمالی تذکرہ
جو ملک کا وقتار بڑھنے کا
باعث ہیں

کم زلہیب

اُن کے لیے خاص جنسیں پاکستان اور
پاکستان کی عزت بے حد عزیز ہے

تحریم حنا صدیقی

۳۱ گمنام پاکستانی ہیروز

جن کے واقعات پڑھ کر انسان کا سرخسر سے بلند ہو جاتا اور اپنے پاکستانی ہونے پر ناز محسوس ہوتا ہے
اور دل ایسا ہی کوئی کارنامہ انجام دینے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے

1

قوم کے ایک بچے کی خاطر حالتِ روزہ میں جان قربان کر دی

ریلوے سٹیشن پر ریلوے پولیس کا ٹینیل سہیل محمود ڈیوٹی دے رہا تھا۔ بچے کو نیچے گرتے اس نے بھی دیکھا تھا۔ اس بچے کو بچانے کے لیے سہیل محمود کے پاس صرف چند سینکڑے تھے۔ سہیل محمود نے اپنی جان پر فرض کو فوقیت دی اور بجلی کی تیزی کے ساتھ اس معصوم بچے کو بچانے کے لیے آگے بڑھا۔ ٹرین بالکل سر پر پہنچ چکی تھی کا ٹینیل سہیل محمود نے پلیٹ فارم کے کنارے پر لٹ کر بچے کو جیسے ہی بازو سے تھما، ٹرین بالکل قریب آگئی۔ سہیل نے ایک جھٹکے سے

صبح ساڑھے نو بجے کا وقت تھا، سپر ایکسپریس ٹرین لاٹھی ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ ٹرین نے جیسے ہی سپیڈ بکڑی اچانک ایک ۶ سالہ بچہ پلیٹ فارم پر کھینچ لیا۔ اس بچے کو گر گیا۔ اپنے سامنے سے ٹرین کو آتے دیکھ کر اس بچے کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے، وہ کانپتے جسم کے ساتھ رونے لگا۔ ارد گرد کھڑے لوگوں کی چیخیں نکلی گئیں۔ ٹرین کی سپیڈ دیکھتے ہوئے کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ نیچے اتر کر اس بچے کی جان بچا سکے۔ اس

سپاہی مقبول حسین

2

پاکستان مردہ با نہیں کہا اور زبان کٹوالی

۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو دہلی کے راستے بھارتی حکام نے قیدیوں کا ایک گروپ پاکستانی حکام کے حوالے کیا۔ اس گروپ میں مختلف نوعیت کے قیدی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گھڑیوں کی شکل میں کچھ سامان تھا جو شاید ان کے کپڑے وغیرہ تھے۔ لیکن اس گروپ میں ۶۵،۶۰ سال کا ایک ایسا پاکستانی بھی شامل تھا۔ جس کے ہاتھوں میں کوئی گھڑی نہ تھی۔

جسم پر ہڈیوں اور ان ہڈیوں کے ساتھ چھنی ہوئی اس کی کھال کے علاوہ گوشت کا کوئی نام نہیں تھا۔ اور جسم اس طرح مڑا ہوا تھا جیسے پتنگ کی اوپر والی کان مڑی ہوئی ہے۔ خود درجہ بندیوں کی طرح سر کے بے ترتیب بال جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ طویل عرصے تک ان بالوں نے تیل یا کھجور کی شکل تک نہیں دیھی ہوگی۔ دکھ کی بات کہ پاکستان میں داخل ہونے والے اس قیدی کی زبان بھی کٹی ہوئی تھی لیکن ان سارے مصائب کے باوجود اس قیدی میں ایک چیز بڑی مختلف تھی اور وہ تھیں اس کی آنکھیں، جن میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

پاکستانی حکام کی طرف سے ابتدائی کارروائی کے بعد ان سارے قیدیوں کو فارغ کر دیا گیا۔ سارے قیدی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ لیکن یہ بوڑھا قیدی اپنے گھر جانے کے بجائے ایک عجیب منزل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کانپتے اور ناتواں ہاتھوں سے وہ ٹوٹے ہوئے الفاظ لکھ لکھ کر اپنی منزل کا پتا پوچھتا رہا اور ہر کوئی اسے ایک غریب سائل سمجھ کر اس کی رہنمائی کرتا رہا اور یوں ۲۰۰۵ء میں یہ بوڑھا شخص پاکستان آری کی آزاد کشمیر رجسٹر تک پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک عجیب دعویٰ کر دیا۔ اس دعویٰ کے پیش نظر اس شخص کو رجسٹر کا مائٹر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ مائٹر کے سامنے پیش ہوتے ہی نہ جانے اس بوڑھے ناتواں شخص میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ

تکم اپریل ۱۹۷۲ء کو صوبائی کے گاؤں ضروری میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۴ برس کی ہڈی محمود، ۱۵ برس کی ایمان اور ایک برس کا بیٹا سفیان ہے۔ شہید کا نشیبل کی اہلیہ کا کہنا ہے ”شہادت والے صبح جب سہیل محمود ڈیپٹی کے لیے گھر سے روانہ ہوئے انھوں نے چاروں بچوں کو خصوصی طور پر پیار کیا تھا۔ جھوٹے بیٹے سفیان سے انھیں بہت زیادہ محبت تھی۔ اس کا کافی دیر تک بوسے دے کر پیار کرتے رہے۔ دوپہر کے وقت جب وہ خود چل کر گھر نہ آئے اور ان کی ہمارے گھر پہنچی تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین پر گئی۔ بہر حال سہیل محمود کے کارنامے پر ان کی پوری ناز ہے۔ انھوں نے ایک بچے کی جان بچاتے ہوئے شہادت پائی ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرے بڑے ہو کر لوگوں کو بتائیں گے کہ وہ شہید باپ کی ہیں۔“

شہید کا نشیبل کے اہل خانہ نے بتایا ”سہیل محمود ۱۹ نومبر ۲۰۰۱ء کو سہیل محمود بحیثیت کا نشیبل ریلوے پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ ریلوے پولیس میں اس کا ۱۱ برس کا ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ اس کے ساتھی اور افسران اس کی ہمیشہ تعریف کرتے تھے۔ وہ صوم و صلوة کا پابند تھا۔ ۲۵ اگست ۲۰۰۲ء کو سہیل محمود کی شادی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ۱۳ بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔ ۲۹ مارچ ۲۰۱۱ء کو اس کا تبادلہ ریلوے پولیس لاندھی تھانہ میں ہو گیا۔ اس دوران ۱۷ اگست ۲۰۱۲ء کو اس کی شہادت کا واقعہ رونما ہو گیا۔

آئی جی ریلوے پولیس سید ابن حسین نے شہید کا نشیبل سہیل محمود کی جرات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ”ریلوے پولیس کے تمام جوان اور افسران شہید کا نشیبل سہیل محمود کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ شہدا اور ان کے پسماندگان کا ہم بہت خیال رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل شہید ہونے والے اے ایس آئی پرویز اقبال اور کا نشیبل اور ایس احمد کو قائد اعظم گولڈ میڈل دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سب میں شہید ہونے والے کا نشیبل عمران شہید کے لواحقین کے لیے بھی امداد کا جو چھ ہوا ہم کریں گے۔

اس بچے کو اٹھا کر پلیٹ فارم کی طرف پھینک دیا لیکن اس دوران وہ خود ٹرین کے پائیدان سے ٹکرایا اور پھسل کر پلیٹ فارم کے نیچے گر گیا، یوں بچے کو تو کا نشیبل سہیل محمود نے بچا لیا اور خود ٹرین کے پتھوں کے نیچے آ گیا، جب ٹرین کے نیچے سے اسے نکالا گیا تو وہ نیم بے ہوش کی حالت میں تھا اس دوران لوگوں نے پانی منگوا لیا، جب اسے پانی پلانے لگے تو سہیل محمود نے آنکھیں کھول دیں، اس نے کہا ”میں پانی نہیں پیوں گا، میں روزے سے ہوں، میرا روزہ مت توڑو“ اتنا کہہ کر کا نشیبل سہیل محمود ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے لوگوں کے مجمع کے سامنے آخری بار کلمہ طیبہ پڑھا اور اس کی روح فقس عصری سے پرواز کر گئی۔

شہید کا نشیبل سہیل محمود کی اس قربانی کو دیکھ کر وہاں موجود ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جس بچے کی اس نے جان بچانے کے لیے اپنی جان قربان کی تھی وہ بھی اپنے محسن کو بیرانی سے دیکھتا رہا۔



کا نشیبل سہیل محمود شہید کے اہل خانہ

انتیاز احمد بھٹی پاک فضائیہ کا ایک گمنام ہیرو

3

”جھپٹے، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے میں جو لطف اس روز آیا وہ پھر زندگی بھر نہ آیا۔ وہ ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح تھی۔ ۶ ستمبر کو بزدل دشمن نے بین الاقوامی سرحدوں کو عبور کر کے لاہور پر حملہ کر دیا تھا، اب امید تھی کہ وہ فضائی حملے بھی کرے گا۔ ہم اس کے استقبال کے لیے نہ صرف تیار بلکہ بے قرار تھے۔ ۷ ستمبر کی صبح ہم فضا میں بلند ہوئے۔ ایم ایم عالم آگے آگے تھے اور میں اُن کے پیچھے پیچھے۔ میں نے ایک جہاز کو نشانے پر لیا مگر وہ بھاگ نکلا۔ ایک تو پاکستان ایئر فورس کی تربیت دوسرے جوانی کا نشہ اور تیسرے بھٹی خاندان کا خون میری رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ یہ خاندان دوستی اور دشمنی دونوں نبھانا جانتا ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا پیچھا کروں گا اور برے کے گھر تک پیچھا کروں گا اور اسے گرا کر ہی دم لوں گا مگر ایم ایم عالم جو قیادت کر رہے تھے، انہوں نے مجھے ریڈیو پر پیغام دیا کہ اسے جانے دو اور باقی تین سے نبٹ لیتے ہیں۔ میں سکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم کو کور فرام کر رہا تھا۔ عالم نے جیتے کی پھرتی کے ساتھ ایک جہاز کو گرا دیا۔ جہاز کا جلتا ہوا ملبہ دیکھ کر ہمیں وہی خوشی ہوئی جو بچوں کو آتش بازی کا دیکھ کر ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایم ایم عالم نے ہندوستانی جہازوں کی پہلی کلزنی کے ہی سبب جہاز گرا لیے تھے، ایسا نہیں تھا۔ ابھی ہم پہلی کلزنی کو گھیر رہے تھے، گرا اور بھاگ رہے تھے کہ اتنے میں عالم کی نظر ایک دوسری کلزنی پر پڑی جو سر جو دھا پر حملے کے لیے بڑی آری تھی، انہیں دیکھ کر عالم کے جذبات کا عالم ہی کچھ اور ہو گیا۔ اس نے مجھے ریڈیو پر پیغام دیا جو جوان تیار رہو کوئی بچ کر نہ جائے۔ میرے خون کی بھی گردش بہت تیز ہو گئی مگر میں ایئر فورس کی تربیت کے مطابق اپنے لیڈر کی ہدایت کا پابند تھا۔

ایک یادگار پر اس کا نام بھی کندہ کر دیا گیا۔ ادھر بھارتی فوج خوبصورت اور کڑیل جسم کے مالک سپاہی مقبول حسین کی زبان کھلوانے کے لیے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑنے لگی۔ اسے ۴x۳ فٹ کی ایک پنجرہ نما کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا۔ جہاں وہ نہ بیٹھ سکتا تھا نہ لیٹ سکتا تھا۔ دشمن انسان سوز مظالم کے باوجود اس سے کچھ انکوائنہ نہ کیا تھا۔ سپاہی مقبول حسین کوئی راز نہیں بتاتا تو وہ اپنی تسکین کے لیے مقبول حسین کو تشدد کا نشانہ بنا کر کہتے ”کہو پاکستان مردہ باد“ اور سپاہی مقبول حسین اپنی ساری توانائی اٹھاتی کر کے نعرہ مارتا ”پاکستان زندہ باد“ جو بھارتی فوجیوں کو جلا کر رکھ دیتا۔ وہ چلانے لگتے اور سپاہی مقبول کو پاگل پاگل کہنا شروع کر دیتے اور کہتے کہ یہ پاکستانی فوجی پاگل اپنی جان کا دشمن ہے اور سپاہی مقبول حسین کہتا:

”ہاں میں پاگل ہوں، ہاں میں پاگل ہوں

اپنے ملک کے ایک ایک ذرے کے لیے

ہاں میں پاگل ہوں

اپنے ملک کے کوئے کوئے کے دفاع کے لیے

ہاں میں پاگل ہوں

اپنے ملک کی عزت و وقار کے لیے

سپاہی مقبول حسین کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ دشمنوں کے ذہنوں پر ہتھوڑوں کی طرح لگتے۔ آخر انہوں نے اس زبان سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے سپاہی مقبول حسین کی زبان کاٹ دی اور اسے پھر ۴x۳ فٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں ڈال کر مقفل کر دیا۔ سپاہی مقبول حسین نے ۱۹۶۵ء سے ۲۰۰۵ء تک اپنی زندگی کے بہترین ۴۰ سال اس کوٹھڑی میں گزار دیے۔ اب وہ کئی زبان سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ تو نہیں لگا سکتا تھا لیکن اپنے جسم پر لباس کے نام پر پہنے چھتھروں کی مدد سے ۴x۳ فٹ کوٹھڑی کی دیوار کے ایک حصے کو صاف کرتا اور اپنے جسم سے رستے ہوئے خون کی مدد سے وہاں پاکستان زندہ باد لکھ دیتا۔ یوں سپاہی مقبول حسین اپنی زندگی کے بہترین دن اپنے وطن کی محبت کے پاگل پن میں گزارتا رہا۔



”سپاہی مقبول حسین نمبر ۳۳۵۱۳۹ ڈیوٹی پر آگیا اور اپنے کمانڈر کے حکم کا منتظر ہے۔“

وائرلیس سیٹ اٹھائے اپنے افسران کے لیے پیغام کے فرائض کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں اٹھائی گن سے دشمن مقابلہ بھی کر رہا تھا مقابلے میں بے زخمی ہو گیا۔ سپاہی اسے کر واپس لانے لگے تو سپاہی مقبول حسین نے انکار کر دیا کہ وہ بچائے اس کے کہ میں زخمی حالت میں آپ بوجھ ہوں، میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے آپ کے محفوظ راستہ مہیا کرتا ہوں۔ ساتھیوں کا اصرار دیکھ کر حسین نے ایک چال چلی اور خود کو چھوٹی کھائی میں اپنے ساتھیوں کی نظر سے اوجھل کر لیا۔ دوست کے بعد واپس لوٹ گئے تو اس نے ایک مرتبہ پھر دشمن فوجیوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اسی دوران دشمن کے گولے نے سپاہی مقبول حسین کو شدید زخمی کر دیا۔ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور دشمن نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے بادل چھٹے تو دونوں ملکوں کے درمیان قیدیوں فہرستوں کا تبادلہ ہوا تو بھارت نے کہیں بھی سپاہی حسین کا ذکر نہ کیا۔ اس لیے ہماری فوج نے بھی مقبول حسین کو شہید تصور کر لیا۔ بہادر شہیدوں کی

اس نے ایک نوجوان فوجی کی طرح کمانڈر کو سیلوٹ کیا اور ایک کاغذ پر نوٹے ہوئے الفاظ میں لکھا:

”سپاہی مقبول حسین نمبر ۳۳۵۱۳۹ ڈیوٹی پر آگیا اور اپنے کمانڈر کے حکم کا منتظر ہے۔“

کمانڈر کو کئی زبان کے اس لاغر، ناتواں اور بدحواس شخص کے اس دعوے نے چکرا کر رکھ دیا۔ کمانڈر کبھی اس تحریر کو دیکھتا اور کبھی بوڑھے شخص کو جس نے ابھی کچھ دیر پہلے ایک نوجوان فوجی کی طرح بھرپور سیلوٹ کیا تھا۔ کمانڈر کے حکم پر قیدی کے لکھے ہوئے نام اور نمبر کی مدد سے جب فوجی ریکارڈ کی پرانی فائلوں کی گرد جھاڑی گئی اور اس شخص کے رشتے داروں کو ڈھونڈ کر لایا گیا تو ایک دل ہلا دینے والی داستان سامنے آئی اور یہ داستان جاننے کے بعد بادل پھولوں، فیتوں اور شاز والے اس لاغر شخص کو سیلوٹ مار رہے تھے۔ اس شخص کا نام سپاہی مقبول حسین تھا۔ ۶۵ء کی جنگ میں سپاہی مقبول حسین کیپٹن شیر کی قیادت میں دشمن کے علاقے میں اسلحہ کا ایک ڈپو تباہ کر کے واپس آ رہا تھا کہ دشمن سے جھڑپ ہو گئی۔ سپاہی مقبول حسین جو اپنی پشت پر

بیرون ممالک
جانے والوں کا المیہ

پُرکشش ملازمت کا وعدہ جب دھوکا نکلے

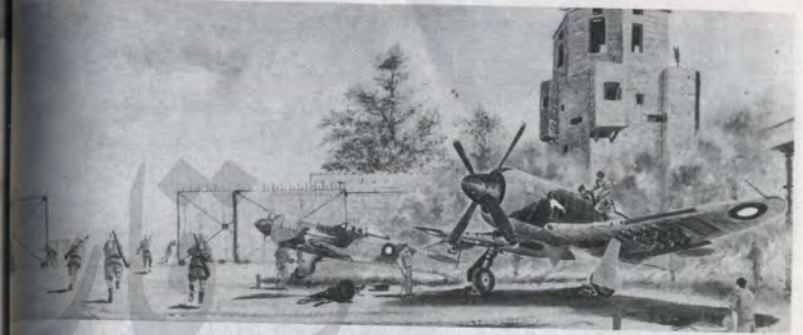
Fake

ہزاروں امیگراد ہر سال لالچی ایجنٹوں کے فریب میں آ کر اپنی ساری جمع پونجی لٹا بیٹھتے ہیں

شیراز حسین علوی

ملائیشیا آیا تھا۔ ایجنٹ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اُسے ملائیشیا میں الیکٹرونکس کمپنی میں اچھی ملازمت مل جائے گی۔ صفی اللہ کہتا ہے ”مجھے یقین تھا کہ ملائیشیا میں خوب کمائی کر کے میں اچھی خاصی رقم اپنے خاندان کو بھجوا سکوں گا۔“ لیکن کوالالمپور پہنچتے ہی اس کے سارے سہانے سنے کرچی کرچی ہو گئے۔ ملائیشیا میں اس نے ایک دن بھی الیکٹرونکس کمپنی میں

سالہ صفی اللہ کوالالمپور میں بڑی محتاط زندگی گزار رہا ہے۔ یہ بنگلہ دیشی نوجوان خصوصاً کوشش کرتا ہے کہ برصغیر سے تعلق رکھنے والے کسی فرد سے نہ ملے۔ اُسے ڈر ہے کہ پھر کوئی بھی انتظامیہ کو مطلع کر سکتا ہے کہ وہ ملائیشیا میں ناجائز طور پر رہ رہا ہے۔ تم ظریفی یہ ہے کہ وہ قانونی طریقے سے



دلوں سے وہ سراسیمگی دور ہی نہیں کافور، ہوگئی جو ۱۹۶۵ء کے غیر متوقع زمینی حملے سے پیدا ہوگئی تھی۔ فضائیہ اور ایم ایم عالم نے چند گھنٹوں میں قوم کو یہ دیا کہ ہم ہیں ناں! آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہمارے شاہین خوش قسمت ہیں کہ انہیں قوم بھی وہی خندقوں میں لیٹ کر اور ہاتھوں سے کانوں کو بند کر کے فضائی جنگ کا سرکوں اور چھتوں پر کھڑے ہو کر یوں لڑ کر تھی جیسے نوجوان پتنگوں کے بیچ کا نظارہ کرتے ہیں بات سے بات نکلتی رہی اور اسی دوران میں نے ایم بات یہ نوٹ کی کہ ایئر کموڈور (ر) امتیاز احمد چمبر جوڑیاں سیکٹر کی فضاؤں میں دشمن کے ۱۳ جہاز چکے تھے۔ اس محاذ پر کچھ پاکستانی چھیڑ چھاڑ کے میں بھارت نے زمینی ہی نہیں فضائی حملہ بھی کر دیا تھا۔ صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمارے جہاز گئے دشمن میں کامیاب ہوئے تھے۔

۷ ستمبر کی جو تاریخی کامیابی ایم ایم عالم اور پاکستان کے حصے میں آئی تھی اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ صرف پاکستانی قوم بلکہ پاکستانی افواج کا مورال بڑھ گیا اور ہر کسی کو یقین ہو گیا کہ دشمن ہم سے نہیں بھی کیوں نہ ہو فتح ہماری ہے۔ بات تعداد کی نہیں اور یقین کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب..... بیان کرنے میں تو بہت وقت لگتا ہے، بس یوں سمجھیے کہ آن کی آن میں عالم فضاؤں میں جھپٹنا رہا اور اس نے چند منٹوں میں دشمن کے چار جنگی جہازوں کو مار گرایا۔ اس طرح ایک ہی پرواز میں پاکستان کے اس شاہین نے دشمن کے ۵/۵ خونخوار پرندوں کو دبوچا، انہیں نشانے پر لیا اور نیست و نابود کر دیا۔“ ۱۹۶۵ء کی یادیں تازہ کر رہے تھے امتیاز احمد بھٹی جو اس وقت فلائٹ لیفٹیننٹ تھے اور ایم ایم عالم سکواڈرن لیڈر تھے۔

امتیاز احمد بھٹی ایئر کموڈور کی حیثیت سے برسوں پہلے پاکستان ایئر فورس سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی کہانی اپنی زبانی سنانے پر تیار نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنیں گے۔ شاہینوں کے شہر میں ابھی تک رہائش پذیر ایئر کموڈور (ر) امتیاز احمد بھٹی سے عرض کیا کہ وہ اپنی نہیں پاکستان ایئر فورس کی کہانی سنا سکیں، اپنی نہیں اپنے ساتھیوں کی داستان عزم و یقین بیان کریں۔ قوم کی طرف سے یہ ایک قرض ہے جو ان کے ذمے واجب الادا ہے۔ جو ان جذبوں اور وطن کے لیے سرفروشی کے لازوال واقعات کا قرض انہیں پاکستان کی نسل کو لوٹانا ہے اور انہیں بھی عزم و یقین کی دولت سے مالا مال کرنا ہے۔ یہ تیر کارگر ثابت ہوا اور پھر ”وہ کہیں اور سا کرے کوئی“ والا منظر تھا، ہم جتنے گوش تھے۔

۷ ستمبر ۲۰۱۵ء پاکستان کی فضاؤں میں دشمن کے جہازوں کے عبرت ناک انجام سے پاکستانی قوم کے

کام نہیں کیا۔ دراصل اُسے ملازمت دینے کا جھانسنہ دے کر ایجنٹوں نے لوٹ لیا تھا اور اس فریب میں آنے والا صفی اللہ تنہا نہیں بلکہ ایشیا اور افریقہ کے بھی کئی ممالک میں ہزار ہا معصوم، بے خبر اور سہانے مستقبل کا خواب دیکھنے والے ہزاروں نوجوان ہر سال اس کا نشانہ بنتے ہیں۔

پاکستان میں بھی اخبارات دیکھیے، تو بیرون ملک ملازمت دینے کا وعدہ کرنے والے کئی اشتہارات نظر آتے ہیں لیکن ان میں بعض سراسر فراڈ ہوتے ہیں۔ ان کمپنیوں کے مالک ایجنٹ دراصل اس بین الاقوامی مافیا کا حصہ ہیں جس میں عالمی کمپنیوں کے لالچی مالکان اور حریص سرکاری افسر شامل ہیں۔ یہ لوگ ملازمتوں کے پرمٹ اور ویزے جاری کر کے سالانہ اربوں روپے کماتے ہیں۔

پھلتا پھولتا غیر قانونی کاروبار

عبدالعزیز بن اسماعیل کوالا لیپور کے ایک مشہور وکیل ہیں۔ انھوں نے خصوصاً ملائیشیا میں پھنسے ایسے غیر قانونی مہاجرین کی مدد کر کے نیک نامی کمائی جو ریکورنگ ایجنٹوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئے تھے۔ وہ بتاتے ہیں ”ملائیشیا میں ایسی کمپنیوں کے لیے بھی بیرون ممالک سے افرادی قوت منگوائی جاتی ہے جو وجود ہی نہیں رکھتیں۔ ان کے نہ کارخانے ہوتے ہیں اور نہ ہی باغات وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ ملازم کیوں منگوائی ہیں؟

دھوکے باز ایجنٹوں کے ہاتھوں
لُٹنے والے بڑے دکھ و کرب
سے گزرتے ہیں۔ بعض
حساس لوگ تو اس صدمے
سے جان بھی ہار جاتے ہیں

وجہ یہ ہے کہ ان جعلی کمپنیوں کے مالکان بنگلہ دیش، بھارت، پاکستان، سری لنکا اور دیگر ایشیائی ممالک میں فریبی ایجنٹوں سے ورک پرمٹ (کام کا اجازت نامہ) اور ویزے دینے پر منہ مانگی رقم وصول کرتے ہیں۔ چنانچہ ملائیشیا ہی نہیں سنگا پور، تائیوان، انڈونیشیا، جنوبی کوریا اور فلپائن جیسی ممالک میں بھی جعلی کمپنیاں کھول کر بیرون ممالک سے افرادی قوت کو منگوانا کاروبار بن چکا۔ اس دھندے میں کرپٹ سرکاری افسر، ایجنٹوں و کمپنی مالکان کے شریک کار ہوتے ہیں۔

ملائیشیا میں بالعموم اصول و قانون کی پابندی کرنے والے بستے ہیں، لیکن وہاں بھی حریص افسروں کی کمی نہیں۔ جولائی ۲۰۰۸ء میں انسداد رشوت ستانی کے محکمے نے ڈائریکٹر امیگریشن کو گرفتار کر لیا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ جعلی کمپنیوں اور ایجنٹوں سے بھاری رشوت لے رہا تھا تاکہ ان کا دھندا جاری رہے۔

اس واقعہ سے ملائشین حکومت کی قانون پسندی اور نیک نامی کو دھچکا لگا۔ چنانچہ حکومت نے ”ریلا“ (RELA) نامی ایک سپر امپلری فورس تشکیل دی جو جعلی کمپنیوں، فریبی ایجنٹوں اور غیر قانونی مہاجرین کی تلاش میں چھاپے مارتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ مالکان کمپنی اور ایجنٹ مشکل ہی سے قانون کی گرفت میں آتے ہیں اور پکڑے بھی جائیں تو اچھے وکیل کر کے رہا ہو جاتے ہیں۔ مگر پُرکشش ملازمت کی چاہ میں آنے والے نوجوان اور غیر قانونی مہاجرین در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوتے اور بے انتہا ذہنی و جسمانی دباؤ برداشت کرتے ہیں۔

اب صفی اللہ ہی کو دیکھیے۔ کوالا لیپور میں ملازمت دلوانے کے لیے ایجنٹ نے اس سے ۴۰۰۰ روڈالر (۳۰۰۰ روڈالر) ۶۴ ہزار روپے) طلب کیے۔ صفی اللہ نے دوستوں سے قرض لیا اور بیوی کا زیور بیچ ڈالا۔ ایجنٹ کا کہنا تھا کہ مدت ملازمت ۲ سال ہوگی جبکہ وہ ماہانہ ۴۰۰ روڈالر (۳۶ ہزار ۴۰۰ روپے) کمائے گا۔

لیکن اسے الیکٹرونک کمپنی میں ملازمت ملی اور نہ ہی

ڈھاکہ میں قائم ایک تربیتی مرکز جہاں
بیرون ممالک میں اچھی ملازمتوں کے
متلاشی نوجوان مختلف ہنر سیکھتے ہیں

دنیا میں اپنے وطن سے بڑھ کر کوئی اور عہدہ و آرام دہ جگہ نہیں۔ لیکن کوئی نوجوان باہر جانا چاہتا ہے، تو وہ ایجنٹ نمائندوں سے خبردار رہے

حسب دل خواہ تنخواہ۔ وہ بتاتا ہے ”مجھ سے متفرق کمپنیوں میں کام کر لیا گیا۔ کبھی صابن اور مٹی فرنیچر کے کارخانے میں۔ مجھے ہر ماہ ۱۵۰ روپے (۱۳۶۵۰ روپے) ملتے لیکن ۵۰ روپے کارکردگی میں کٹ جاتے۔ لہذا ۱۰۰ روپے میں اپنے خرچے ہی بشکل پورے ہوتے، اہل خانہ کو رقم بھجوانا تو دور کی بات ہے۔

ظلم کی ریت

۲ سال قبل صفی اللہ اور ۲۹ دیگر ساتھی پریشان اور بدحال ہو کر ایک انہونی کرگزریں۔ وہ کمپنی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ یہ ایک دلیرانہ فیصلہ تھا کیونکہ ملائیشیا پہنچنے ہی کمپنی نے سبھی کے پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ اب ان کا سرکاری اجنبی، ریلا کے کارندوں سے ناکرا ہوتا، تو گرفتاری و قیدی بنی تھی۔ مگر وہ اسی لیے فرار ہوئے کہ مختلف کمپنیوں میں کام کر کے رقم بچائیں اور اپنے اپنے خاندانوں کو بھیج سکیں۔ ان بنگلہ دیشی، بھارتی اور پاکستانی نوجوانوں نے پھر غلیظ ملازمتیں بھی کیں اور پیسے بچانے کی خاطر سڑکوں و پارکوں میں بھی سوئے۔

انسانی حقوق کی حفاظت کرنے والے وکیل اور ملائشین پارلیمنٹ کے رکن، چارلس سانتیاگو کا کہنا ہے ”کارکنوں کے پاسپورٹ اپنے قبضے میں کر لینا ظلم ہے۔ یوں انہیں موقع ملتا ہے کہ کارکنوں کا اتصال کر سکیں۔ کارکن شکایت کرتے ہیں کہ مالکان ان

سے ۱۳ روپے ماہانہ گھنٹے کام کراتے ہیں۔ میرے نزدیک تو بیرون ممالک سے افرادی قوت منوانے کا سارا نظام کرپٹ اور ظالمانہ ہے۔

منڈلاتا خطرہ

ایک دن اس کمپنی میں سرکاری عملے نے چھاپہ مارا جہاں صفی اللہ کام کرتا تھا۔ وہ بروقت پھیلے دروازے سے فرار ہو گیا ورنہ نیل اس کا مقدر بٹنی۔ گرفت میں آنے سے بال بال بچ کر وہ کوالا لپور میں بنگلہ دیش کے سفارت خانے جا پہنچا۔ وہاں انکشاف ہوا کہ سیکڑوں بنگلہ دیشی نوجوان ریکروٹمنٹ ایجنٹوں اور کمپنی مالکان کی حرص کا نشانہ بن کر ابتر حال میں ہیں۔ ہر ایک کے پاس ظلم و ستم کی ایک نئی اور لرزہ خیز داستان سنانے کو موجود تھی۔

دن میں پریشان حال نوجوانوں کی قطار لگ جاتی تاکہ وہ سفارت خانے کے کسی افسر کو اپنی حالت زار بتا کر مدد لے سکیں لیکن سفارت خانہ کیونکر مدد کرتا کہ ان کے پاس کاغذات ہی نہیں تھے۔ بیشتر کے پاسپورٹ و کاغذات کمپنیوں نے قبضے میں لے رکھے تھے۔ چنانچہ بنگلہ دیشی چاہتے ہوئے بھی ملائیشیا سے نہیں جا سکتے تھے۔

سنگاپور میں پھنسا نوجوان

اُدھر سنگاپور میں ۳۸ سالہ اسد بدر ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہے۔ وہ بھی اس جزیرے میں پھنسا ہوا



دل گرفتہ اسد اپنا خصوصی پاس دکھاتے ہوئے جس پر تیسویں مہر لگی ہوئی ہیں



ملائیشیا میں بنگلہ دیشی سفارت خانے کے ذریعہ تہمت متاثرہ نوجوانوں کے لیے ایسی کمی پناہ گاہیں قائم ہیں

ہوا۔ اُسے پھر سانس کا رشتہ قائم رکھنے کی خاطر مختلف معمولی ملازمتیں بھی کرنی پڑیں۔ آخر دسمبر ۲۰۱۰ء میں اسے واپس وطن جانے کی اجازت ملی۔ یوں ناکام و نامراد ہو کر واپس چلا آیا۔

ملازمتیں جن کا کوئی وجود نہیں

سنگاپور میں قانون کی رو سے کمپنی مالکان غیر ملکی ملازمین کو بتائے بغیر ملازمت کا معاہدہ ختم کر سکتے ہیں۔ حریص اور مکار لوگوں نے پھر اس غیر انسانی قانون سے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے جعلی کمپنیاں بنائیں، اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ہزار ہا غیر ملکیوں کو سنگاپور بلایا، ایجنٹوں سے کمیشن وصول کیا اور پھر رن فوکر ہو گئے۔ یوں غیر ملکی ملازمین خلا میں ٹامک ٹائیاں مارتے رہ گئے۔

ایک سنگاپوری وکیل، جان گی بتاتا ہے ”کمپنیاں ایسی ملازمتوں کے لیے بیرون ممالک سے لوگ منگوا رہی ہیں جن کا کوئی وجود نہیں۔ یہ مسئلہ طویل عرصے سے چلا آ رہا ہے۔“

ہے، تاہم وجہ کاغذات نہ ہونا نہیں۔ دراصل اس کا تنخواہ کے مسئلے پر کمپنی سے اختلاف ہو گیا۔ چنانچہ اس نے کمپنی کے خلاف متعلقہ محکمے میں شکایت درج کرا دی۔ جب معاملے کی جھان بین ہوئی، تو انکشاف ہوا کہ کمپنی کا مالک غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ لہذا کمپنی سیل کر دی گئی۔ تاہم اسد بدر کو سنگاپور حکومت نے روک لیا تاکہ وہ کمپنی کے خلاف گواہی دے سکے۔

صفی اللہ کے مانند اسد بھی ایجنٹ کو لاکھوں روپے دے کر سنگاپور آیا تھا۔ ایجنٹ نے اسے بتایا تھا کہ وہ تعمیراتی کمپنی میں کام کرے گا لیکن یہ وعدہ جھوٹا ثابت

کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں اُگتے

حاید چودھری

محاورہ کچھ یوں تھا ”کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں اُگ سکتے۔“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرایا ”ہم نے ترقی سے پہلے ترقی کے بارے میں ریفرج کی تھی۔ ہم نے اندازہ لگایا تھا آپ جب تک ہاتھی کا بچہ نہیں پالتے آپ اس وقت تک ہاتھی دانت حاصل نہیں کرتے چنانچہ ہم نے انفراسٹرکچر تیار کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے پورے ملک کو سڑکوں کے ساتھ ملایا، ریلوے لائنیں بچھائیں، ہوائی اڈے اور بندرگاہیں بنائیں، تعلیم اور صحت عامہ کی، دنیا کی سب سے بڑی ورک فورس بنائی اور اس کے نتیجے میں ہمارے ہاتھی کے منہ میں دانت نکل آئے اور پوری دنیا ہم سے محبت کرنے لگی۔“

مجھے اس کی بات اچھی لگی۔ یہ سچ ہے ترقی کا انفراسٹرکچر ضروری ہوتا ہے اور جس ملک کے پاس

اپنے محاوروں اور کہاوتوں میں بھی دنیا سے بہت آگے ہے۔ چینی محاورے اپنے اندر معانی، دانش و خیالات کی اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ بیسیوں کتابیں مل کر کسی ایک چینی محاورہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ میں نے بچپن میں جو پہلا چینی محاورہ پڑھا تھا اس نے آنے والے دنوں میں میری زندگی کا سارا مسائل تبدیل کر دیا۔ میں زندگی میں جب بھی تلخ ہونے لگتا ہوں تو میں یہ محاورہ نکال کر پڑھتا اور فوراً ریلیکس ہو جاتا ہوں۔ وہ محاورہ تھا ”جسے مسکرانا نہیں آتا اسے دکان نہیں کھولنی چاہیے۔“ دوسرا تاریخی محاورہ اس دورے کے دوران ملا۔ میں نے اپنے ایک میزبان سے چین کی ترقی کی وجہ پوچھی، اس نے مسکرا کر ایک چینی محاورہ سنایا۔ وہ

چین

پانچ لاکھ روپے) دیے تھے تاکہ وہ اُسے سنگاپور میں اچھی ملازمت دلوا سکے۔ لیکن سنگاپور پہنچ کر جلد ہی اُسے یہ جان لیوا احساس ہو گیا کہ کمپنی میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ اس کا معاہدہ ملازمت ۴ ماہ بعد انجام کو پہنچا اور اُسے خوار ہو کر واپس آنا پڑا۔

عبدالوہاب کو کچھ علم نہ تھا کہ وہ والدین اور بیوی بچوں کو کیا بتائے گا۔ لیکن اس کا اُترا چہرہ اور حالت زار دیکھ کر اہل خانہ سب کچھ سمجھ گئے۔ واپس آ کر عبدالوہاب کی طبیعت مزید خراب ہو گئی۔ وہ راتوں کو جاگنے لگا اور اُسے دل کی تکلیف چٹ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صرف ۲۶ دن بعد وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔

سنگاپور جانے سے قبل عبدالوہاب ایک اچھی سرکاری ملازمت کر رہا تھا۔ اس کا گھرانا اچھا کھاتا پیتا تھا لیکن عبدالوہاب کی موت کے بعد اس کی بیوی، سرین کو ایک دفتر میں کلرک کرنا پڑی۔ اب وہ اپنا اور اپنے ۲ بچوں کا پیٹ بمشکل پال رہی ہے۔

خاتمہ کلام

پاکستان میں بھی ایسے ایجنٹوں کی کمی نہیں جو غیر ملکی جعلی کمپنیوں کے کارندے بن کر سادہ لوح پاکستانیوں کو لوٹتے ہیں۔ چنانچہ اول تو دنیا میں اپنے وطن سے بڑھ کر کوئی اور عمدہ و آرام دہ جگہ نہیں۔ لیکن کوئی نوجوان باہر جانا چاہتا ہے، تو وہ ٹھگ قسم کے ایجنٹوں سے خبردار رہے، ورنہ لاکھوں روپے سے محروم ہو سکتا ہے۔



عبدالوہاب کی بدقسمت بیوی اور ۲ ننھے بچے

سنگاپور کے ٹھگہ افروزی قوت کا کہنا ہے کہ وہ جعلی کمپنیوں کی روک تھام کے لیے کڑے قوانین بنا رہا ہے۔ اب فراڈیے مالکان کو جیل جانا پڑے گا لیکن دھوکے بازی کا شکار غیر ملکیوں کے دکھ درد کا حکومت کوئی مداوا نہیں کر سکی۔ ٹھگہ افروزی قوت کا کہنا ہے کہ غیر ملکی بیرون ممالک میں ایجنٹوں کو رقم دیتے ہیں، لہذا وہ اس کی رسائی سے باہر ہیں۔ دھوکے باز ایجنٹوں کے ہاتھوں لٹنے والے بڑے دکھ و کرب سے گزرتے ہیں۔ بعض حساس لوگ تو اس صدمے سے جان بھی ہار جاتے ہیں۔

عبدالوہاب کی داستان الم

جنوری ۲۰۱۱ء میں ۳۸ سالہ عبدالوہاب نے سنگاپور سے جہاز پکڑا اور واپس بنگلہ دیش چلا آیا۔ اس کی جیب میں ۴۳۰ ڈالر (۳۸ ہزار روپے) موجود تھے۔ ۴ ماہ سنگاپور میں گزار کر وہ اتنی ہی رقم بچا سکا تھا۔ ڈھاکہ میں اس نے ایجنٹ کو ۶ ہزار ڈالر (ساڑھے

۲۰۰۸ میں ایشیا میں ترسیل زر

(بحوالہ ورلڈ بینک - بین ڈالر میں)

بھارت	51.6%
چین	48.5%
فلپائن	18.6%
بنگلہ دیش	9.0%
پاکستان	7.0%
انڈونیشیا	6.8%

چینی لوگ کہتے ہیں

اگر ایک سال کی منصوبہ بندی
کرنا چاہتے ہو تو مکئی بوؤ
اگر ۱۰ سال کی منصوبہ بندی
کرنا چاہتے ہو تو درخت لگاؤ
لیکن اگر تم صدیوں کے لیے
منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو
تو پھر تم لوگوں کی تربیت کرو
اور انھیں تعلیم دو

۱۲ سال کی منصوبہ دیکھیں جنھوں نے ہماری
آنکھیں کھول دیں۔ ہم جن ماؤنڈ اور گئے۔ یہ ۳۶۸ میٹر
اونچی ۸۸ منزلہ عمارت ہے

جس پر دنیا کا تیسرا بلند

ترین ٹی وی ٹاور قائم

ہے۔ یہ ٹاور دنیا کی

بلند ترین عمارتوں

میں شمار ہوتا ہے۔

اس کی لفٹ انتہائی

سبک رفتار ہے۔

ہمارے میزبانوں

نے ہمیں حیران

کرنے کے لیے

لفٹ کے فرش پر

ایک سکہ کھڑا کر

دیا۔ ہم ۸۸ روپے

منزل سے نیچے

آئے لیکن یہ سکہ

اسی طرح الٹا

رہا۔ آپ اس

بات سے اس

لفٹ کے توازن کا

اندازہ لگا لیجیے۔

دوسرا منصوبہ

”شنگھائی کا“

”جنگ

ڈالر کی اشیاء خریدتا ہے۔ امریکا دوسرا بڑا خریدار ہے۔
چین سے سالانہ ۲۱۲ بلین ڈالر کی اشیاء لیتا ہے جبکہ جاپان
اس فہرست میں تیسرے نمبر پر آتا ہے وہ ہر سال چین سے
۱۸۵ بلین ڈالر کی اشیاء درآمد کرتا ہے۔ ان ممالک کے
بعد یہ فہرست طویل ہوتی چلی جاتا ہے۔ عالمی ماہرین کا
خیال ہے کہ آپ دنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں وہاں
”میڈ ان چائنا“ ملے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے وہ چین جو کل تک دنیا کا
پسماندہ ترین ملک تھا اس نے یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا۔
چین نے یہ مقام حقیقتاً محنت اور انفراسٹرکچر سے حاصل
کیا۔ اس نے ہائی دانت کے حصول کے لیے ہاتھی پالے
شروع کیے۔ اس وقت چین میں ۱۴۷۲ ہوائی اڈے ہیں
ان میں سے ۷۵ فیصد ہوائی اڈوں پر بین الاقوامی
پروازیں اترتی ہیں۔ شنگھائی نے اس سال دنیا کی سب
سے بڑی کارگو پورٹ ہونے کا مقام حاصل کر لیا ہے۔
اس پورٹ سے پچھلے سال ۴۴۳ بلین ٹن سامان دنیا کے
بازاروں میں گیا۔ اس وقت دنیا میں سب سے بڑی درک
فورس چین میں ہے۔ چین میں ۴۸ کروڑ ہنرمند ہیں۔ یہ
تمام ہنرمند اپنے اپنے کاموں کے ماہر ہیں۔ چین شہر
انفراسٹرکچر کو وسعت دینے کا کام ابھی تک جاری ہے۔
چین پچانگ دریا پر ۳۳ بڑے ڈیم بنا رہا ہے ان ڈیموں پر
۲۲ بلین ڈالر خرچ ہوں گے۔ یہ ڈیم چین کو ۱۸ ہزار
۲ سو میکا واٹ بجلی دیں گے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا
بائیڈل پاور پلانٹ ہوگا۔ چین ۵۹ بلین ڈالر کی مائٹ
سے ۱۳۰۰ کلومیٹر لمبی نہریں بھی کھود رہا ہے۔ چین ۱۸
بلین ڈالر سے ۴ ہزار کلومیٹر لمبی کیس پائپ بھی بچھا رہا
ہے۔ چین ۳۳ بلین ڈالر سے ۴۳۸۰ کلومیٹر لمبے اور
۲۰ کلومیٹر چوڑے جنگلات لگا رہا ہے۔ چینی اس منصوبہ
کو ”گرین گرین وال پراجیکٹ“ کہتے ہیں۔ یہ دنیا کا
سب سے بڑا جنگلی ذخیرہ ہوگا۔ چینوں کا خیال ہے جب
یہ منصوبہ مکمل ہوگا تو چاند سے صرف ۲ چتریں نظر آئیں
گی۔ ایک گرینٹ وال اور دوسرا گرینٹ گرین وال۔

انفراسٹرکچر نہیں ہوتا وہ ملک کبھی ترقی نہیں کرتا اور چین اس
کی سب سے بڑی اور تازہ ترین مثال ہے۔ اس وقت دنیا
کا سب سے بڑا انفراسٹرکچر چین میں ہے۔

شنگھائی چین کا دوسرا بڑا اور چین کا معاشی اور صنعتی

دارالحکومت ہے۔ ہم لوگ ۲۹ مارچ کو شنگھائی پہنچے۔

شنگھائی کی آبادی اس وقت ایک کروڑ ۷۴ لاکھ ہے۔ یہ

ایک انتہائی خوبصورت، جاندار اور زندہ شہر ہے۔ آپ

جو بھی اس شہر میں داخل ہوتے ہیں آپ کو زندگی کا احساس

ہوتا ہے۔ ۳۰ جولائی کو شنگھائی کے میئر شین ہوگے گوانگ

نے ہمارے وفد کو کونج دیا تھا۔ اس کونج کے دوران مسلم لیگ

کے جوائنٹ سیکرٹری امتیاز احمد رانجھا نے ان سے بڑا

دلچسپ سوال پوچھا۔ انھوں نے پوچھا ”شنگھائی میں کتنی

غیر ملکی کمپنیاں کام کر رہی ہیں؟“ میئر کے جواب نے

پورے وفد کو حیران کر دیا۔ انھوں نے بتایا ”اس وقت

شنگھائی میں ۳۰ ہزار ملٹی نیشنل کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔“

میئر کا یہ جواب چین کی اقتصادی اور صنعتی ترقی کا

ثبوت تھا۔ شنگھائی حقیقتاً ایک بڑا صنعتی اور تجارتی شہر ہے۔

آپ اس کے کرشل وایوم کا اندازہ اس میں کام کرنے

والی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے لگا سکتے ہیں۔ اس وقت

شنگھائی میں ۴۶ ہزار ۹ سو اشتہاری کمپنیاں کام کر رہی

ہیں۔ پورے ملک میں ۷۹ ہزار ۴ سو اشتہاری کمپنیاں

ہیں۔ ان کمپنیوں میں ۳۲۹ بین الاقوامی کمپنیاں ہیں۔

ان ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے آپ شنگھائی اور چین کے

تجارتی ساز کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چین اس وقت دنیا کی

دوسری بڑی اقتصادی قوت ہے۔ چین کا جی ڈی پی

۸۸ بلین اور ۱۵۸ بلین ڈالر ہے جبکہ اس کے مالیاتی

ذخائر ۸۱۹ بلین ڈالر ہیں۔ چین کا گروتھ ریٹ

۱۹ اعشاریہ ۵ فیصد ہے۔ یہ دنیا میں اس وقت سب سے

زیادہ گروتھ ریٹ ہے۔ چین کی ذاتی بچتوں کا سائز ایک

ٹرلیون اور ۷ بلین ڈالر ہے۔ اس وقت پوری دنیا چینی

مصنوعات استعمال کر رہی ہے۔ یورپ چینی مصنوعات کا

سب سے بڑا خریدار ہے۔ وہ ہر سال چین سے ۲۱۸ بلین

شان ڈیپ سی پورٹ“ تھی۔ یہ منصوبہ ۱۰ برس پہلے شروع
ہوا۔ شنگھائی کی حکومت نے گہرے پانیوں کی بندرگاہ
بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے ان لوگوں نے سمندر کے
اندروں ۳۳ کلومیٹر لمبا پل اور اس پل پر ۲ روہیہ سڑکیں بنا
دیں۔ یہ سڑک پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد منصوبہ
ہے۔ آپ جب اس سڑک پر سفر کرتے ہیں تو
آپ خود کو گہرے سمندر میں پاتے ہیں۔
اس سڑک کے آخر میں ۳۰ گودیوں
کی ایک نئی بندرگاہ بنائی جا رہی ہے،
جس سے سالانہ ۸ ہزار ۵ سو کنٹینر
لائے اور لے جائے جائیں گے۔
ہم لوگ جب اس جگہ پہنچے تو ہمیں
اپنا گوادر بہت یاد آیا۔ مسلم لیگ

کے مزدور ونگ کے صدر فقیر حسین بخاری نے اس موقع پر بڑا خوبصورت تبصرہ کیا۔ انھوں نے کہا ”ایک یہ لوگ ہیں جو سمندر کو خشک کر کے بندرگاہ بنا رہے ہیں اور ایک ہم لوگ جو قدرت کی دی ہوئی بندرگاہیں تک استعمال نہیں کر رہے۔“ مجھے محسوس ہوا اس معاملے میں چین ہم سے بہت آگے ہے۔ شاید یہ چین کی اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ اس وقت دنیا کے تمام سرمایہ کار اپنے اپنے سرمائے کے ساتھ چین کا رخ کر رہے ہیں۔ صرف ۲۰۰۵ء میں انٹرنیشنل سرمایہ کاروں نے چین میں ۶۰ بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی۔ چین کی یہ فتوحات حقیقتاً اس کے ویژن اور اس کے انفراسٹرکچر کا نتیجہ ہے۔

بات ہو رہی تھی چینی محاوروں اور کہاوتوں کی تو مجھے چین کی ایک اور کہاوت یاد آگئی۔ چین میں کہا جاتا ہے ”انسان کو پھول اس وقت توڑنے چاہئیں جس وقت وہ توڑے جانے کے قابل ہوں۔“ چین نے اپنے عمل سے یہ محاورہ سچ ثابت کر دیا۔ اس معیشت اور اقتصادیات کے

میزبانوں نے ہمیں حیران کرنے کے لیے لفٹ کے فرش پر ایک سکہ کھڑا کر دیا ہم ۸۸ روپیہ منزل سے نیچے آئے لیکن یہ سکہ اسی طرح کھڑا رہا۔ آپ اس بات سے لفٹ کے توازن کا اندازہ لگا لیجیے

پھول کاشت کیے، انھیں جوان کیا اور آج پوری قوم پھول چن رہی ہے۔ محاوروں سے یاد آیا، پنجاب کے کیشن اور وکس کے صوبائی وزیر رانا ظہیر الدین ہمارے ساتھ تھے۔ وہ ایک دلچسپ شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ جو بھی شخص ان کی لمپنی میں بیٹھ جاتا ہے ان کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ دوران سفر رانا صاحب نے والد مرحوم کے وہ قول سنائے۔ یہ قول بھی سونے میں تولنے کے قابل ہیں۔ رانا صاحب نے بتایا۔ ان کے والد کہا کرتے تھے کہ دنیا میں کچھ لوگ دولت مند ہوتے ہیں اور کچھ امیر۔ ہم ان سے پوچھا کرتے تھے ان دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے تو وہ کہتے تھے کہ دولت مند وہ ہوتا ہے جس کے پاس دولت ہو جبکہ امیر وہ ہوتا ہے جو اس دولت کو مثبت کاموں میں خرچ کرے۔ لہذا اللہ تعالیٰ سے دولت مند کے بجائے امیر ہونے کی دعا کیا کرو۔ وہ فرم کرتے تھے انسان کو اس طرح رہنا چاہیے کہ اس سے دوستوں کو ہمیشہ آس رہے اور دشمنوں کو خوف۔ میں رانا صاحب کے والد کے اقوال سے متاثر ہوا۔ چینی لوگ کرتے ہیں ”اگر ایک سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے تو ملکی بوڑھے، اگر ۱۰ سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے درخت لگاؤ لیکن اگر تم صدیوں کے لیے منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو پھر تم لوگوں کی تربیت کرو، انھیں تعلیم دو۔“ رانا صاحب کے والد کے اقوال تیسری کنیکری میں فال کرتے ہیں لہذا میں نے پاکستان پہنچتے ہی یہ دونوں فقرے انڈازری میں لکھ لیے۔

”اپنا فرض بجالاتے رہو اور خدا پر بھروسہ رکھو۔“ کی کوئی طاقت پاکستان کو ختم نہیں کر سکتی۔ یہ قائم رہے کے لیے بنا ہے۔ ہمارے اقدامات اور کارنامے ثابت کر رہے ہیں کہ ہم سچائی پر ہیں اور میں اس یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی ہمدردیاں، بالخصوص اسلامی ممالک کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم بھی اس کے ممنون ہیں جس نے امداد، تعاون اور دوستی کا ہماری طرف بڑھایا۔“

کامیابی کی اس سے بہتر تعریف ممکن نہیں ہے وہ بننے ہیں جس کی اہلیت دے کر پیدا کیا گیا ہے

کیا صرف پیسا کمانا ہی

کامیابی

کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے، ہم اسے بہترین انداز میں استعمال کریں۔ کامیابی عمل کرنے میں ہے، حاصل کرنے میں نہیں..... کوشش کرنے میں ہے، فتح میں نہیں۔“ (وائٹ ڈیوس)

قیصر جاوید

زندگی کی سب سے اہم دریافت

اس وقت میری عمر ۳۹ سال تھی جب مجھے پہلی بار یہ سمجھ آئی کہ کامیاب ہونے کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کیا کیا تھا؟ کیا میں کسی فارچون ۵۰۰ (Fortune 500) کی کسی ای سی او (CEO) بن گیا تھا؟ کیا میں پہلی ٹریڈ ہوئی ٹی مرسیڈیز ڈرائیو کرتے ہوئے گھر گیا تھا؟ کیا میری لائزنی نکلی تھی؟ کیا مجھے ٹیلی ویژن شو ”امیروں اور مشہوروں“ کا لائف سٹائل ”میں مدعو کیا گیا تھا؟ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک سادہ لیکن گہری دریافت کی تھی۔ میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ

زندگی کس طرح عمل کرتی ہے اور یہ کہ کون کون سی چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ برسوں حقیقت سے بے خبر رہنے کے بعد میں نے جان لیا تھا کہ زندگی میں کامیاب ہونے کا مطلب کیا ہے اور یہ کہ کامیابی کیسے حاصل کی جاتی ہے۔ اس دریافت کے ساتھ ہی دو ایسی چیزیں مجھے حاصل ہوئیں جن کا ہمیشہ آرزو مند رہا تھا۔

اندرونی سکون کا احساس اور اپنی قدرو قیمت کا احساس۔ سب سے بڑھ کر میں نے زندگی سے ہمیشہ سے بڑھ کر لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ وہ عظیم دریافت کون سی تھی؟ کیا وہ کامیاب ہونے کا کوئی فارمولا تھا؟ مجھے اس بات کا یقین

کامیاب لوگ سیکھنے کی مضبوط خواہش کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ زندگی، دنیا اور خود اپنے بارے میں جاننے کے شدید آرزو مند ہوتے ہیں۔ وہ جاننے اور سیکھنے کے عمل کو ایک فریضہ نہیں بلکہ تفریح سمجھتے ہیں۔ وہ نئی باتیں سیکھ کر اور اپنے آپ کو بہتر بنا کر تسلسل اپنی زندگیوں کو باثروت بناتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دریافت کرتے ہیں، ہمیشہ ترقی کرتے ہیں۔

ہے کہ ہاں وہ کامیاب ہونے کا فارمولا ہی تھا۔ تاہم وہ شخص کسی عمدہ اور صاف پیکٹ میں بند نہیں ملے گا۔ ٹی وی پر اس کے اشتہار بھی دکھائے جاتے۔ یہ کوئی نیا فارمولا نہیں ہے۔ یہ کوئی راز، کوئی عجیب نہیں ہے۔ یہ کوئی جادو بھی نہیں ہے اس لیے یہ فروخت نہیں ہوتا۔ یہ نہایت پرانا، نہایت سادہ اور نہایت معصوم لیکن یہ کارگر ہے۔

میں کئی برس تک فلسفہ، تاریخ اور نفسیات کے مطالعے کے بعد اس حقیقت کو سمجھا ہوں کہ زندگی اور کامیابی کو چند ایسے اصولوں میں سمجھا جا سکتا ہے جو کہ ہزاروں سال سے موجود ہیں۔ ”اچھی زندگی“ کی جستجو میں کئی سال مختلف راستوں پر گامزن رہنے کے بعد میں وہیں پہنچ گیا، جہاں سے روانہ ہوا تھا۔ میں ان تک پہنچا، جیسے اب میں پرانے بچے پرانی صدائیں کہتا ہوں۔ جیسا کہ اینڈورڈ ایٹلی اپنے ڈرامے ”دی زو سٹوری“ (The Zoo Story) میں کہتا ہے، ”بعض اوقات تجھ کو سارا درست فاصلہ طے کرنے کے لیے اصل راستے سے کافی دور جانا پڑتا ہے۔“

میں دیانت داری سے کہتا ہوں کہ اگر تم ان پرانے اصولوں پر مستقل عمل کرو گے تو تم نہ صرف کامیابی کے حقیقی معانی سے واقف ہو جاؤ گے بلکہ کامیابی حاصل بھی کر لو گے۔ ایک سویڈش ضرب المثل ہے کہ ہم بڑھ بڑھ جلد ہوتے ہیں جب کہ ذہین دیر سے ہوتے ہیں۔ شاید ایسا نہ ہو۔ میری کتاب تمہیں میری نسبت جلد ذہین ہونے میں مدد دے گی۔ اگر تم عمر میں بڑے ہو گئے۔ تب بھی

۱۔ پیسہ بُرائی نہیں ہے

کیا یہ بائبل میں لکھا ہے کہ پیسا تمام برائیوں کی جڑ ہے؟ نہیں۔ بائبل میں تو یہ لکھا ہے کہ پیسے کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ دونوں بیانات میں واضح فرق ہے۔ پیسے میں کوئی بُرائی نہیں ہے، خواہ پیسا بہت زیادہ مقدار میں کیوں نہ ہو۔ کلیدی بات یہ ہے کہ ہم اسے کس طرح نکالتے اور اس سے کیا کرتے ہیں۔ اگر پیسا دیانت داری سے کمایا اور اچھی طرح خرچ کیا جائے تو یہ اچھائی کا پرچم بن جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا پیسا ایک خوش خرید سکتا ہے؟ جو شخص کہتا ہے کہ پیسا خوشی نہیں خرید سکتا، اس کے پاس زیادہ پیسا نہیں ہوگا۔ درحقیقت پیسا غربت کی نسبت زیادہ خوش خرید سکتا ہے۔ میرا خیال ہے پرل ہیلیٹ نے اس بات کو بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔ ”بہنی! میں غریب رہا ہوں اور میں امیر بھی رہا ہوں۔ میں تحصیل حاصل ہوں کہ امیر ہونا بہتر ہے۔“ شاید پیسا بیشتر معاملات میں بہتر ہوتا ہے۔ امیر ہونا تو غیر قانونی ہے، اور نہ غیر اخلاقی۔ تاہم یہ سچ ہے کہ پیسا سب کچھ نہیں ہے۔

کامیابی اور پیسا

ایسا لگتا ہے کہ ہم یہ طے نہیں کر سکتے کہ پیسا اچھا۔ جب کسی شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کامیاب شخص ہے تو اس سے عموماً یہی مراد ہوتی ہے کہ وہ دولت مند ہے۔ چنانچہ دولت کو لازماً اچھا ہونا چاہیے۔ دولت مند لوگ قابل قدر مقاصد کے لیے ہر سال روپے خرچ کرتے ہیں۔ چنانچہ دولت اچھی ہے۔ ہم نے یہ نہیں سنا کہ پیسا تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ تناظر میں پیسا برا ہے۔ جو لوگ امیر نہیں ہیں، لوگوں پر تنقید کرتے ہیں، جو امیر ہیں۔ اس کے علاوہ خود بھی امیر ہو جانا بے حد پسند کرتے ہیں۔ وہی ہے کہ پیسا اچھا ہے یا برا؟

پیسہ نا اچھا ہے، نہ برا۔ تاہم چونکہ ہم ایک معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پیسے کو کامیابی کے برابر قرار دیا جاتا ہے۔ ضرورت اس حوالے سے چند خیالی باتوں کی وضاحت کی جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اسے درست تناظر میں دیکھا جائے۔ میں پیسے کے حوالے سے ۲ نکات چاہوں گا۔

۲۔ کامیابی کے لیے صرف پیسا ہی ضروری نہیں ہے

ہم جس دنیا میں جی رہے ہیں، اس میں ہمیشہ سے دولت مند لوگ موجود ہیں۔ ان امیر لوگوں میں بے شمار لوگ کروڑ پتی ہیں اور بہت سے کروڑ پتی لوگ ارب پتی ہیں۔ مونیخ نے بیسویں صدی کی نوئیں دہائی کو ”امیر کی دہائی“ قرار دیا تھا۔ اس دور میں دولت کے لیے ہجرت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ”لاچ اچھا ہے۔“ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ جس شخص نے یہ بیان دیا تھا، چند ماہ بعد وہ کسی جرم میں عدالت کے کٹہرے میں بیٹھا تھا۔ ایسا تب ہوتا ہے جب ہم پیسے کے حوالے سے غلط فہم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح زندگی مسخ ہو کر رہ

جاتی ہے۔

تاہم صرف وہ لوگ جیل نہیں جاتے جو روپے کی ہوس میں اپنے آپ کو گنوا دیتے ہیں۔ میں نے حال ہی میں ایک کتاب پڑھی ہے، جس کا موضوع ایسے لوگ ہیں جو بظاہر کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے پاس پیسا ہے، جائیداد، طاقت اور سماجی مقام و مرتبہ ہے، تاہم وہ لوگ مایوس ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ کامیاب لوگ ہیں تو مایوس کیوں ہیں؟ وہ خوش کیوں نہیں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خوش ہونا اور کامیاب ہونا، دو یکساں باتیں نہیں ہیں۔ یہ لوگ ایسے ہیں جن کے پاس بظاہر سب کچھ ہوتا ہے لیکن وہ بنیادی اہمیت کی چیزوں کو نظروں سے اوجھل کر چلے ہوتے ہیں۔ وہ نشی بن گئے ہیں۔ وہ پیسے اور اس سے حاصل ہونیوالی چیزوں کے غلام بن چکے ہیں۔ اس دوران انھوں نے نہ صرف دوسروں کو نقصان پہنچایا بلکہ اپنی زندگی بھی تباہ کر لی ہیں۔ کامیابی پیسا کمانے سے سو کچھ اور بھی ہے۔ پیسے کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ پیسے کے علاوہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو زندگی کو زیادہ دلچسپ، زیادہ باعفی اور زیادہ ثمر آور بنا دیتی ہیں۔

کامیاب ہونے کے کیا معانی ہیں؟

عظیم فلسفی تھامس کارلائل نے ایک بار لکھا تھا، ”آؤ ہم سب وہ ہیں، جس کی اہمیت کے ساتھ ہمیں تحقیق کیا گیا ہے۔“ میں کامیابی کی اس سے بہتر تعریف نہیں سوچ سکتا۔ زندگی ہمیں ہر روز چیلنج دیتی ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر استعمال کریں۔ ہم تب کامیاب ہوتے ہیں جب اپنے اندر موجود صلاحیتوں کو اعلیٰ ترین سطح پر استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ہم تب کامیاب ہوتے ہیں جب اپنے پاس موجود بہترین چیز دیتے ہیں۔

اس باب کے آغاز میں درج قول میں کہا گیا ہے کہ کامیابی ”حاصل کرنے“ میں نہیں بلکہ ”کام کرنے“ میں ہے۔ میں اس نکتے پر زیادہ زور نہیں دے سکتا۔ زندگی

میں نے اپنے کلاس روم میں یہ اقتباس کے ساتھ درج ذیل اقتباس چسپاں کیا ہوا ہے
 ”خوشخبری یہ ہے کہ تمھاری عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو اور
 تمھارے حالات جیسے بھی ہوں، تمھاری زندگی کا بہترین
 موسم آنے والا ہے، بشرطیکہ تم ایسا چاہو۔ اس کی وجہ یہ ہے
 کہ تم اپنی ۹۹ فیصد صلاحیتیں استعمال ہی نہیں کرتے۔
 حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے انھیں دریافت ہی نہیں کیا۔ یہ
 صرف خوشخبری نہیں بلکہ قابل یقین خبر ہے۔“ (ٹم ہینسل)

سب سے فائدہ مند نصیحت

”اگر مجھے کہا جائے کہ پوری نوع انسان کے لیے سب سے زیادہ فائدہ بخش
 واحد نصیحت کروں تو وہ یہ ہوگی ”مشکلات کو زندگی کا ناگزیر حصہ سمجھو اور جب
 مشکلات سامنے آئیں تو اپنا سر بلند رکھتے ہوئے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھو
 اور کہو کہ میں تم سے بڑا ثابت ہو کر دکھاؤں گا۔ تم مجھے شکست نہیں دے سکتی۔“
 (این لینڈرز)

پیارا دوست ہے۔ جب ہم ۲۰ سال پہلے نفسیات پڑھایا
 کرتے تھے تو ہم اپنے شاگردوں کو مستطالقیں کیا کرتے
 تھے کہ اپنے اندر بھانعو..... اپنے اندر موجود خرابیاں تلاش
 کرو اور یہ جانو کہ تمھارے اندر کتنی صلاحیتیں چھپی ہوئی
 ہیں۔ ہم انھیں زیادہ عمل کر سکیں تاکہ ان کی بات یہ تھی کہ وہ ۱۸، ۱۸ سال کے تھے لیکن انھوں نے
 اس سے پہلے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔

ایک سال بعد میں نے یونیورسٹی آف سان فرانسسکو
 میں اپنے شاگردوں کو یہی باتیں کہنا شروع کیں۔ ان میں
 سے اکثر اپنی عمروں کی تیسری یا چوتھی دہائیوں میں تھے۔
 بعضوں کی عمریں اس سے بھی زیادہ تھیں۔ ذرا اندازہ تو
 لگائیے کیا ہوا ہوگا؟ انھیں بھی کسی نے ان کی اپنی
 صلاحیتوں کے حوالے سے کبھی نہیں پڑھایا تھا۔ ایک شام کا
 ذکر ہے اس موضوع پر زور دار بحث کے انجام پذیر ہونے
 کے بعد ایک ۳۷ سالہ خاتون نے کہا ”آپ درست کہتے
 ہیں، ہمیں اپنی صلاحیتوں کا پتا نہیں ہے۔“ ہم نو جوان ہیں
 یا بوڑھے، خواہ ہم انڈر میٹرک ہیں یا پی ایچ ڈی، ہم ہمیشہ
 صلاحیتوں کے متعلق جان سکتے اور کامیاب شخص بن سکتے
 ہیں۔ اگر ہم اندر دیکھیں گے تو ہم حقیقی کامیابی کے درکار
 تمام ضروری وسائل پائیں گے کیونکہ جان لیجیے ”ہم میں جو
 کچھ بننے کی صلاحیت ہے، وہ بننا زندگی کا واحد مقصد
 ہے۔“ (این لینڈرز) (ہال ارین کی کتاب سے ماخوذ)

میں رکاوٹ ہو۔ معاشرے کی حیثیت سے ہماری مضبوطی،
 ہماری تخلیقی اور ہماری ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم
 اپنے لوگوں کی صلاحیتوں اور امکانات کو استعمال میں
 لائیں۔“
 میں نے اس اقتباس کو بڑے حروف میں لکھا کر
 اپنے کلاس روم میں چسپاں کیا ہوا ہے۔ یہ مجھے اور میرے
 شاگردوں کو یاد دلاتا ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جنہیں
 ہم میں سے بہت سوں کو یاد دلاتا ہے۔ جان گارڈنر سابق
 وزیر صحت، تعلیم اور بہبود عامیہ ہے۔ وہ ”کامن کاؤز“
 (Common Cause) نامی تنظیم کا بانی اور کئی کتابوں
 کا مصنف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگ
 اپنے ماحول کی وجہ سے ”اعلیٰ کارکردگی“ کا مظاہرہ کرنے
 سے محروم رہتے ہیں۔ میں اس سے متفق ہوں۔ ہمیں بے
 شمار ایسی ہدایات دی جاتی ہیں جن کا حقیقی کامیابی سے کوئی
 سرواڑہ نہیں ہوتا۔ ہم اپنے مسائل کے اندر دیکھنے کے
 بجائے مسائل کے فوری حل کو ڈھونڈنے کی تاکید کی جاتی
 ہے۔ اگر ہم نہیں دیکھیں گے تو ہم کبھی نہیں پائیں گے اور
 ہماری صلاحیتیں چھپی ہی رہیں گی۔ ہمیں اپنی مجبوریوں اور
 مضبوطیوں کے بجائے اپنے امکانات کو دیکھنا ہوگا۔

☆ کامیاب لوگ زندہ رہنے اور جینے میں
 سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ منور الذکر کا انتخاب کرتے ہیں
 زندگی سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے
 کہ وہ زندگی کو بہت کچھ دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ دیتے ہیں
 کائنات اور زندگی سے مکمل طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔
 ☆ کامیاب لوگ زندہ رہنے اور جینے میں
 سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ منور الذکر کا انتخاب کرتے ہیں
 زندگی سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے
 کہ وہ زندگی کو بہت کچھ دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ دیتے ہیں
 کائنات اور زندگی سے مکمل طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

☆ کامیاب لوگ ہمارے معاشرے کے لوگوں کی
 اپنے امکانات کو بالکل بھی استعمال نہیں کرتے۔
 کہ ان کا ماحول انھیں اس کی تحریک نہ دیتا ہو۔

☆ کامیاب لوگ زندگی کو دیا ہی قبول کرتے ہیں،
 جیسی کہ وہ ہوتی ہے۔ وہ زندگی کو اس کی ساری دشواریوں
 اور چیلنجوں سمیت قبول کرتے ہیں۔ وہ اس کے بارے
 میں شکایتیں نہیں کرتے بلکہ وہ اسے اپنا لیتے ہیں۔ وہ
 دوسروں پر الزام دھرنے اور بہانے بنانے کے بجائے اپنی
 زندگیوں کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے
 منفی عناصر کے باوجود اسے ”ہاں“ کہتے اور حالات جیسے
 بھی ہوں، اس کو بھرپور انداز میں بسر کرتے ہیں۔

☆ کامیاب لوگ زندگی کے حوالے سے مثبت رویہ
 اپناتے اور اسے برقرار رکھتے ہیں۔ وہ لوگوں میں اور دنیا
 میں اچھائی ڈھونڈتے اور عموماً اسے پالیتے ہیں۔ وہ زندگی
 کو مواقع اور امکانات کا ایک سلسلہ تصور کرتے اور ہمیشہ
 مواقع اور امکانات پالیتے ہیں۔

☆ کامیاب لوگ سمت کے شعور اور مقصد کے حامل
 ہوتے ہیں۔ انھیں علم ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ
 اہداف کا تعین کرتے، انھیں حاصل کرتے اور پھر نئے
 اہداف کا تعین کرتے ہیں۔ وہ چیلنج قبول کرتے اور ان

☆ کامیاب لوگ سمت کے شعور اور مقصد کے حامل
 ہوتے ہیں۔ انھیں علم ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ
 اہداف کا تعین کرتے، انھیں حاصل کرتے اور پھر نئے
 اہداف کا تعین کرتے ہیں۔ وہ چیلنج قبول کرتے اور ان

انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔
پاکستان میں اب بھی کئی لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ
ایبیزن کتابیں فروخت کرتی ہے۔ لیکن پاکستانی نوجوان
نسل آگاہ ہے کہ اس ویب سائٹ کے ذریعہ دنیا بھر کی
شے خریدنا ممکن ہے..... گویا یہ کمپنی دنیائے انٹرنیٹ کی
بین الاقوامی سپر سٹور کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ایبیزن
کو یہ منفرد اعزاز اپنے بانی اور سی ای او، جیف بیوزوں ہی
کی بدولت حاصل ہوا۔

امریکا کا نمبر 1 چیف ایگزیکٹو

جیف بیوزوس

دنیا کے انٹرنیٹ میں
۹۸ ارب ڈالر مالیت
کے حامل سب سے بڑے
سپر سٹور، ایمیزون
کے بانی سے ملے
جواپے گاہکوں کو ہر
چیز پر فوقیت دیتا ہے

تنویر احمد



ناسا سے
لے کر عام آدمی
تک اس کا
معترف ہے

چند

ماہ قبل امریکی نیٹ کمپنی،
ایبیزن ایک تاریخی سنگ
میل طے کرنے میں
کامیاب رہی۔ وہ یہ کہ
پہلے یہ کمپنی دنیائے انٹرنیٹ میں صرف کتابیں اور گانوں و
فلموں کی سی ڈیز، ڈی وی ڈی فروخت کرتی تھی لیکن اب
یہ ہمہ اقسام کا سامان فروخت کر رہی ہے مثلاً ڈرل مشین،
جوتے، ٹینس ریکٹ، پھل و سبزیاں غرض ہر وہ شے جو

ہمدردی کرنے سے پہلے طے کریں کہ آپ نیکی کا کون سا
کام کرنا چاہتے ہیں۔ کتنا زیادہ اور کتنا لمبا عرصہ کرنا چاہتے
ہیں۔ اگر آپ بہت معمولی کام کریں گے تو آپ کو زیادہ فائدہ
حاصل نہ ہوگی اور اگر آپ بہت زیادہ کریں گے تو آپ کو
جائیں گے۔ بہتر ہے کہ آپ ہفتے میں ایک بار نیکی کا کام
خاص بڑا کام کریں یا پھر ۳۵ روپے کے کام
کریں۔ اگر آپ پہلے ہی اس طرح
کا کوئی کام کر رہے ہیں
پھر روٹین سے ہر
کر زیادہ کریں
بدل
کریں۔ روٹین
سے
اس کا
مطلب
کہ
روٹین کے
اور ہمدردی کے
کام نہ کریں
آپ روٹین واپس
بھی کریں۔ مزید کچھ
کریں تاکہ آپ بور نہ ہوں۔
اپنے نیکی، ہمدردی اور مہربانی کے کاموں کو
رہیے۔ اگر پیسے نہیں دے سکتے تو وقت دیں۔ کسی کو کوئی
مشورہ دیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کسی کی بات
سن لیں۔ کسی سے ہمدردی کا اظہار کریں۔ کسی کا شکر
دیں۔ مصیبت کے وقت دوسروں کے کام آئیں۔ کسی کی
چیز مرمت کر دیں۔ دوسروں کی خدمت کریں۔ اگر
سکیں تو کم از کم دوسروں کو تکلیف نہ پہنچنے دیں۔ جس
کریں، اُس کو احسان نہ جتانیں بلکہ صرف اپنے رب
کے لیے ایسا کریں۔

ہمدردی اور مہربانی کے کاموں کو بدلتے رہیے

پروفیسر ارشد جاوید

ریسرچ سے ثابت ہوا ہے کہ لوگوں کے ساتھ نیکی مثلاً
ہمدردی کرنا نہ صرف دوسرے لوگوں کے لیے بلکہ خود نیکی اور
ہمدردی کرنے والے کے لیے بھی مفید ہے۔ اگر آپ خوشی
چاہتے ہیں تو لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اپنائیں۔ لوگوں
کے کام آئیں، رضا کارانہ خدمات سرانجام دیں، خدمت خلق
کریں۔ حقیقی خوشی دوسروں کو خوشی دینے سے ملتی
ہے۔ دوسروں سے ہمدردی کے بغیر
حقیقی خوشی میسر نہیں ہوتی۔

ہمدردی کے رویے کو
بہتر کرنے سے خوشی
میں اضافہ ہوتا
ہے۔ مہربان
اور دوسروں کا
خیال رکھنے
والے اور
کشاہد دل
لوگ زیادہ
خوش باش ہوتے
ہیں۔ ایک اور
ریسرچ سے معلوم ہوا
ہے کہ باقاعدگی سے ہمدردی
(Kindness) کے کام کرنا فرد کو

لبے عرصے کے لیے خوشی دیتا ہے۔ جب آپ
لوگوں کی مدد کرتے ہیں، اُن کے کام آتے ہیں تو لوگ آپ کو
پسند کرتے، داد دیتے، احترام کرتے، شکر گزار اور احسان مند
ہوتے ہیں جس سے آپ کی خوشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس
اچھے رویے سے آپ کو اچھے دوست بھی مل جاتے ہیں، جو
آپ کی ضرورت کے وقت مدد کرتے اور کام آتے ہیں۔
ہمدردی کئی طرح کی ہو سکتی ہے مثلاً کسی کو خون دینا،
بیمار کی خبر لینا، کسی کا شکریہ ادا کرنا، کسی کے کام آنا، کسی کا کوئی
مسئلہ حل کر دینا، کسی کی مالی امداد کرنا، کسی کو اپنی چیز اُدھار
دے دینا وغیرہ۔

یہ ۱۹۹۳ء کی بات ہے کہ ۳۰ برس کے جیف نے اپنے گھر کے گیراج میں ایمیزن کی بنیاد رکھی۔ یہ پھر جلد ہی انٹرنیٹ میں کتابیں فروخت کرنے والی سب سے بڑی ویب سائٹ بن گئی۔ لیکن پچھلے پانچ سال کے دوران ایمیزن محض کتب و میڈیا تک محدود نہیں رہی، بلکہ ضرورت کی ہر شے اپنے گاہکوں تک پہنچانے لگی۔ آج پوری دنیا میں اس کے لاکھوں گاہک ہیں اور ایمیزن کا کاروبار خوب پھل پھول رہا ہے۔ اس امر کا اندازہ یوں لگائیے کہ پچھلے پانچ برس میں ایمیزن کے حصص کی مالیت ”۳۹۷ فیصد“ بڑھ چکی۔

آج ۳۸ برس کا جیف ۱۹ ارب ڈالر (۱۸۲۳ ارب روپے) کی دولت کا مالک ہے۔ یہ حقیقت اُسے دنیا کے ۳۰ امیر ترین افراد میں جا شامل کرتی ہے۔ اس کے باوجود جیف کا جوش و ولولہ سرد نہیں پڑا۔ آج بھی وہ اپنے دفتر میں ایسے جوش و خروش سے کام کرتا ہے جیسے اپنی نئی کمپنی شروع کر رہا ہو۔ تب وہ ایسا بچہ دکھائی دیتا ہے جو ایک رات والے کیمپ کے سارے مزے لوٹنا چاہتا ہے۔

جیف خود کہتا ہے ”میں فطری طور پر بڑا خوش باش انسان ہوں اور اس کی بیوی کا دعویٰ ہے ”اگر آپ جیف کو غمگین دیکھیں، تو صرف پانچ منٹ انتظار کریں۔“ آخر جیف خوش کیوں نہ ہو؟ آج وہ اپنی قابل رشک صلاحیتوں کے باعث امریکا کا نمبر ایک سی ای او (جیف ایگزیکٹو آفیسر) بن چکا۔

اس اعزاز کی اہمیت کا اندازہ یوں لگائیے کہ اُسے پانے والوں میں سٹیو جابز اور بل گیٹس جیسے بڑے نام

جیف جزئیات کی حد تک کاروبار پر دھیان دیتا ہے اسی لیے وہ مصنوعات کی جلد از جلد فراہمی کے لیے مشہور ہے

شامل ہیں۔ یہ اعزاز اسی کو ملتا ہے جو خدا داد صلاحیتوں سے اپنی کمپنی کو بام عروج پر لے جائے اور مسلسل بہترین کارکردگی دکھائے۔ اس مطلوبہ معیار پر جیف پورا اترتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ بنیادی طور پر جیف بیزنس کو اس لیے کامیابی ملی کہ وہ اپنے گاہکوں کو ہر چیز پر مقدم رکھتا ہے۔ ایک صدی قبل شکارگو میں، امریکا کے مشہور ریٹیلر (پرچون فروش) مارشل فیلڈ نے کاروبار شروع کرتے ہوئے اپنا نعرہ (مونو) یہ رکھا تھا ”گاہک ہمیشہ صحیح کہتا ہے۔“

جیف بیزنس نے بھی شہود سے یہی نعرہ اپنایا اور اُسے دنیائے انٹرنیٹ میں متعارف کرا دیا۔ اسی عمل کے دوران جیف کاروبار کے بڑے معیوں میں سے ایک معیار حل کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ کہ کیش رجسٹر ٹھکانے سے قبل ہی یہ تاڑ لیا جائے کہ گاہک کیا چاہتا ہے، اس کی مانگیں کیا ہیں؟

ایمیزن کے اعلیٰ افسر و مینیجر جیف کو خاصا ہیبت ناک پاس سمجھتے ہیں۔ تاہم ان کی زندگیوں میں اس شخصیت کے اثرات سب سے زیادہ ہیں جو دفتر میں ”خالی کرسی“ کہلاتی ہے۔ دراصل ہر کانفرنس کے موقع پر جیف ایک کرسی خالی رہنے دیتا اور حاضرین کو بتاتا ہے کہ سوچ لیجیے، اس پر گاہک بیٹھا ہے۔ جیف کے الفاظ میں ”کمرے کا سب سے اہم ترین آدمی۔“

ایمیزن میں یہی ”خالی کرسی“ حقیقی پاس ہے۔ تاہم اُسے واضح اور صاف آواز جیف کی بدولت ہی ملتی ہے۔ جیف کی نظر میں گاہک کی کیا اہمیت ہے، اس کا اندازہ



یوں لگائیے کہ ایمیزن میں کارکردگی کی جانچ کرنے والے ”۵۰۰ معیار“ (Metrics) ہیں اور ان میں سے ۸۰ فیصد گاہکوں کی ضروریات سے متعلق نہیں۔

آج ایمیزن نے گاہکوں کو ان گنت سہولیات دے رکھی ہیں۔ مثلاً ایک سہولت سے استفادہ کرتے ہوئے وہ فلمیں ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔ دوسری سہولت انھیں آگاہ کرتی ہے کہ نئی اشیا و سامان کون سا آیا ہے۔ ایمیزن کی خاص خوبی یہ ہے کہ ہر گاہک اُسے اپنی ضروریات کے مطابق ذاتی (پرسنلایز) بنا سکتا ہے۔

گاہکوں کی ناپسند کے متعلق جیف مزید سختی برتتا ہے۔ مثلاً انھیں آرڈر کی تفصیل میں دیر سختی سے کھلتی ہے۔ اسی طرح وہ مصنوعات میں تغلغ نہیں چاہتے اور کوئی شے اشاک میں نہ ملے، تو اس پر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

چنانچہ ایمیزن میں ہر ممکن سعی ہوتی ہے کہ گاہک درج بالا کسی خرابی کا سامنا نہیں کریں۔ حتیٰ کہ کمپنی کا کوئی ویب صفحہ لوڈ ہونے میں صرف ”صفر اعشاریہ ایک“ سیکنڈ دیر لگائے، تو اسے بھی بڑی غلطی سمجھا جاتا ہے۔ دراصل ایمیزن کے معیارات کی رو سے اگر صفحے ٹھکنے میں ۱۰۰ سیکنڈ دیر لگے، تو گاہکوں کی ایک فیصد سرگرمیاں کم ہو جاتی ہیں۔

ایمیزن کے سابق اعلیٰ افسر و ملازم گاہکوں پر جیف کے انتہائی ارتکاز کی کئی داستانیں سناتے ہیں۔ مثلاً ۲۰۰۱ سال قبل سامن مردوخ برطانیہ میں ایمیزن آپریٹنگز کا

انچارج تھا۔ اس زمانے میں کوئی آرڈر اگلے دن شام ۶ بجے تک تکمیل کو پہنچتا تھا۔ جیف نے سامن پر دباؤ ڈالا کہ تکمیل کی حد شام ۴ بجے تک پہنچاؤ۔ لہذا سامن کو تمام ممکن اقدامات کر کے باس کے حکم کو عملی جامہ پہنانا پڑا۔ آج یہ عالم ہے کہ اگر صبح آرڈر ملے، تو برطانیہ و امریکا کے تمام بڑے شہروں میں اسی دن شام کو اس کی تقبیل ہو جاتی ہے۔

اس طرح ایک اور اعلیٰ افسر، رچرڈ اسمتھ کو یاد ہے کہ جیف کی خواہش تھی کہ سارا مال عمدہ کارڈ بورڈ کے ڈبوں میں بھجوایا جائے۔ یہ دراصل گاہکوں کے دل میں گھر کر جانے کا طریق کار تھا۔ کیونکہ لوگ عمدہ کارڈ بورڈ تحفے یا دیگر سامان بھجوانے میں استعمال کرتے ہیں۔ یوں وہ آرڈر دیتے وقت ایمیزن کو اولیت دینے لگے۔



جیف نے گاہکوں کے دل میں گھر کرنے کا خوب طریقہ سوچا ہے

گاہکوں کا از حد خیال رکھنے سے بہر حال کمپنی کو فائدہ پہنچا۔ امریکا کی مشنی کی یونیورسٹی ہرسال یہ رپورٹ مرتب کرتی ہے کہ گاہکوں کو مطمئن کرنے والی چوٹی کی ۲۲۵ امریکی کمپنیاں کون سی ہیں؟ پچھلے ۱۰ برس میں شعبہ آن لائن ریلیٹنگ میں ایمیزن سرفہرست چلی آ رہی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر بھی اس کا شمار ۱۰ بہترین امریکی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ فی الوقت سیئیر، کلورکس، ایپل اور کاروں کی ۳ کمپنیاں ایمیزن سے آگے ہیں۔

لیکن صرف گاہکوں کو مطمئن کرنے کا اچھوتا عمل ایمیزن کی زبردست کامیابی کا پتا نہیں دیتا۔ دیگر آن لائن ریٹیلر کمپنیاں مثلاً ٹارگٹ اور کوسٹ کو بھی اپنے گاہکوں کو

اونٹ

اونٹ بہت مضبوط جانور ہے۔ وہ ۲۵۰ کلوگرام وزن اٹھا کر ۴۰ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر سکتا اور بغیر بوجھ کے وہ ۳۰۰ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔ اسی صلاحیت کی بنا پر اونٹ کو صحرا کا جہاز کہا جاتا ہے۔ کیا اونٹ نے صحرائی حالات کی مناسبت سے اپنے جسم کو موافق بنایا ہے؟ کیا اس نے اپنی ناک کی اندرونی سطح یا اپنی کمر پر کوبان خود بنائی ہے؟ قرآن پاک میں خالق کائنات نے ایک سوال کر کے ”کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کیسے تخلیق کیا گیا“ خوب سمجھایا ہے کہ اللہ کیسے منفرد خالق ہے۔

اور کامیاب رہا۔ جہاں تک خوابوں کا تعلق ہے، جیف (لیکن میں غلاباز بننا چاہتا تھا۔ پھر دادا کی ۲۵ ہزار ایکڑ وسیع چراگاہ میں کچھ عرصہ گزارا، تو کاؤ بوائے بننے کا فیصلہ کیا۔ تاہم قسمت نے اُسے کاروباری بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

نوجوانی ہی میں جیف اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ خود انحصاری کو اعلیٰ صفت مانتا اور اُسے اپنے ملازمین میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورانِ انٹرویو تمام امیدواروں سے مخصوص امتحان لیے جاتے ہیں۔ یہ امتحان امیدوار اپنی عقل اور محنت کے مطابق حل کرتے ہیں۔ جو شخص دورانِ امتحان ذہانت و فطانت اور تیزی کا مظاہرہ کرے، ایمیزن کی ٹیم کا حصہ بن جاتا ہے۔ ایمیزن میں ”خالی کرسی“ کے بعد کارکردگی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ درحقیقت جیف کے نزدیک دونوں کا چولی دامن جیسا تعلق ہے۔ دراصل کارکردگی کے ذریعے ایمیزن میں غیر ضروری اخراجات سے چھکارا پایا جاتا ہے۔ مزید برآں جس ملازم کی کارکردگی عمدہ ہو، وہ معاوضہ بھی اچھا پاتا ہے۔

ایمیزن میں تقریباً ”۵۶ ہزار“ مردوزن ملازم ہیں۔ گوانیس گوگل کے ملازمین کی طرح بیسیوں سہولیات حاصل نہیں، تاہم وہ اپنے ادارے سے خوش ہیں۔ اگرچہ انھیں یہ ضرور شکایت ہے کہ جیف تنخواہیں کم دیتا اور کام زیادہ لیتا ہے۔ تاہم یہ مسئلہ محض ایمیزن تک محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔

ایمیزن جیسی بڑی کمپنی کو چلانا بچوں کا کھیل نہیں، یہ امر ۲۳ گھنٹے کی مصروفیت مانگتا ہے۔ لیکن یہ جیف کا کمال ہے کہ وہ جزییات کی حد تک کاروبار پر دھیان دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کاروبار کی بھی ای میلز پڑھتا ہے جبکہ بیشتر سی ای او اسے دوسرے سمجھتے ہیں۔ دراصل ان بیانات سے اسے ہر سال درجنوں نئے خیالات و نظریات ملتے ہیں۔ ان کی بدولت پھر ایمیزن کے ہر شعبے میں بہتری لائی جاتی ہے۔

ایمیزن کے مستقل کارکنوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسی قسم کی انقلابی سوچ نے ایمیزن کی بھی کامیابی ڈالی۔ ۱۹۹۴ء سے ۲۰۰۰ء اور پھر ۲۰۰۳ء تا ۲۰۰۷ء تک ایمیزن کی کارکردگی سپاٹ رہی۔ اس دوران کمپنی نے بنیادی طور پر کتب اور موسیقی ہی کو مارگٹ بنایا۔ پھر جیف دیگر مصنوعات کی طرف متوجہ ہوا اور وہ بھی کارکنوں کو فراہم کرنے لگا۔

۲۰۰۶ء میں جیف نے ”ایمیزن ویب سروسز“ کی بنیاد رکھی۔ آج اس کمپنی کے کارکنوں میں امریکی خلائی ادارے ناسا سے لے کر عام لوگ شامل ہیں۔ گزشتہ سال کمپنی نے ایک ارب ڈالر کمائے اور اس کا منافع روز افزوں ہے۔ یہ کمپنی ”کلاؤڈ“ کے ذریعے لوگوں کو کمپیوٹر سے متعلق مختلف خدمات فراہم کرتی ہے۔

چند ماہ قبل امریکی خلائی جہاز سینی نے مشتری کی ایک لاکھ اسی ہزار تصاویر زمین پر بھجوائیں۔ ایمیزن ویب سروسز کے طاقتور کمپیوٹروں نے صرف ۵ گھنٹے میں تصاویر پروسس کر دیں اور خرچ صرف ۲۰۰ ڈالر آیا۔ اگر ناسا کے کمپیوٹر یہی کام کرتے، تو ۱۵ دن لگا دیتے اور خرچ بھی بنگلہ جوں کا توڑ زیادہ ہوتا۔

جیف عملی آدمی ہے اور خواب دیکھنے والا تصوراتی شخص بھی۔ ۱۹۶۳ء میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں حساب کتاب کا ماہر بن گیا۔ ایک بار اس نے اپنی دادی کو بتایا کہ اگر وہ یونٹی سگریٹ پیتی رہیں، تو فلاں سال چل بیس گی۔

جیف طبعیات پڑھنے پر سنسن یونیورسٹی پہنچا، لیکن وہاں سے کمپیوٹر سائنس کی ڈگری لے کر نکلا۔ بعد ازاں اُسے وال اسٹریٹ میں پرنٹیشن معاوضے پر ملازمت مل گئی۔ تاہم اس نے اپنا کاروبار کرنے کا خطرہ مول لیا



انٹرنیٹ پر سٹور ایمیزن نے کارکنوں کو بے شمار سہولیات فراہم کر دی ہیں

بہترین خدمات فراہم کرتی ہیں لیکن کسی بھی ایسی کمپنی نے پچھلے سال ایمیزن کے مانند ۴۸ ارب ڈالر (۳۶۰۸ ارب روپے) کا سامان فروخت نہیں کیا۔ مزید برآں کوئی بھی آن لائن ریٹیلر کمپنی ایمیزن کی طرح ۹۸ ارب ڈالر کی مارکیٹ نہیں رکھتی۔

چونکہ کارکنوں کو مطمئن کرنے کے سلسلہ میں بے حساب معیار موجود ہیں جن کی پیمائش اعداد و شمار سے کی جاتی ہے، لہذا جیف سمجھتا ہے کہ وہ جو بھی نیا قدم اٹھائے، وہ درست ہوتا ہے۔ یوں اُسے نئی اختراعات کرنے کا موقع مل گیا۔ جیف کہتا ہے:

”ہم اطمینان سے بیچ رہے ہیں اور پھر صبر سے انتظار کرتے ہیں کہ ان سے درخت نکل آئیں۔ لیکن ہم کسی ایجاد یا اختراع کے بجائے اپنے کارکنوں پر پوری توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے کاروباری کلچر میں یہ امر نایاب ہے۔“

اب ایمیزن کے کنڈل (Kindle) ای بک ریڈر ہی کا معاملہ دیکھیے۔ جیف ایسا ای ریڈر ایجاد کرنا چاہتا تھا جس کے ذریعے قاری کوئی بھی ای بک ۶۰ سیکنڈز میں ڈاؤن لوڈ کر لے۔ اس نے پھر اپنے انجینئروں کو کہا کہ انھیں جتنی رقم درکار ہے، لے لیں۔ تاہم ایجاد معیاری اور بہترین ہونی چاہیے۔ کنڈل ای بک ریڈر کی تیاری میں کئی برس لگ گئے۔ اس دوران مالیات سے وابستہ ایک افسر نے جیف سے سوال کیا ”آپ اس منصوبہ پر کتنی رقم خرچ کرنے کو تیار ہیں؟“

جیف نے فوراً دریافت کیا ”ہمارے پاس کتنی رقم موجود ہے؟“ آخر ستمبر ۲۰۱۱ء میں کنڈل مارکیٹ میں آگئی اور

مشکل ترین معاشی حالات میں
بھی آخری سانسوں تک لڑنے کا
عزم رکھنے والی ایک باہمت

رشین نانی کی زندگی کا ایک دن

دن بھر سردی، بارش اور پولیس کا معتابلہ
کرتے ہوئے بمشکل ۸۵ سینٹ (ایک ڈالر)
کسپانے والی ۶۵ سالہ انتونینا نیکیشووا کی
کہانی اسے یاد نہیں کہ آخیری بارگوشت
کب کھایا تھا

انعام الحق مسزرا

روس

میں ایک معاشی بحران نے
لوگوں کو اس شدت سے
متاثر کیا کہ آن واحد میں
ان کی زندگیاں بدل گئیں۔
سب سے زیادہ عمر رسیدہ پنشنرز متاثر ہوئے۔ آئیے آپ کی
ملاقات ۶۵ سالہ ”رشین نانی“ مادام انتونینا نیکیشووا
(Mrs. Antonina Nikishova) سے کراتے ہیں۔
رشین نانی کا ایک دن اس بات کا گواہ ہے کہ وہ
بحران کے بعد رومنا ہونے والے ناگفتہ بہ حالات میں
جس ہمت و حوصلہ کے ساتھ زندہ رہنے کی تگ و دو کر رہی
ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اس کی زندگی کا ہر روز ایک ہی ڈگر پر رواں دواں
ہے۔ وہ روزانہ علی الصبح اٹھ کر اپنے لیے دن بھر کا کھانا تیار
کرتی ہے۔ آج اُس نے آلوؤں میں چند دنوں کی بچی بچی
مشروم کی بجٹی اور روٹی کے چند ٹکڑے ملا کر سوپ بنایا ہے

اور اسی سوپ سے اسے دن بھر پیٹ کی آگ کو بجھانا
ہوگا۔ بحران سے پہلے وہ دن گئے جب نانی بھی کبھی قیہ
کے کوٹے اور ایک آدھ چکن پکا کر کھا لیا کرتی تھی۔ تب
اس کی ماہوار پنشن ۴۲۳ روپل تقریباً ۱۰۰ امریکی ڈالر
کے مساوی ہوا کرتی تھی۔ بحران کے بعد امریکی ڈالر کے
مقابلہ میں روپل ایسا زوہ زوال ہوا کہ ایک طرف افراد
زر کی وجہ سے اس کی پنشن کی قوت خرید گھٹ کر تقریباً
۳۶ روڈالر کے برابر ہو گئی اور دوسری جانب اشیائے
خور و نوش کی قیمتیں روز بروز آسمان کو چھوئے لگیں۔ برقی
ہوئی اس بے لگام مہنگائی نے ناصر ف نانی جان کو بلکہ اس
جیسے دیگر لاتعداد پنشنروں کی بھی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یہ لوگ
غربت کی آخری حدوں کو چھو دینے والے محاذ پر اپنے آپ
کو زندہ رکھنے کی جنگ مردانہ وائرل رہے ہیں۔

ماشی کو یاد کرتے ہوئے نانی جان کہتی ہیں کہ مجھے
جنگ عظیم دوم کا وہ نازک دور اب بھی یاد ہے جب بحران

افواج ہم پر تباہ توڑ حملے کر رہی تھیں،
لیکن یہ یاد نہیں پڑتا کہ زندگی جیسی اب
بہانک ہے تب بھی ایسی ہی مہیب اور
تکلیف دہ تھی۔ لوگ فاقہ کش ہیں اور
بھوک سے مرے جا رہے ہیں مگر پھر بھی
زندہ ہیں۔ ان کی ہمت اور حوصلہ کو داد
دیتی ہوں۔

موجودہ پنشن سے نانی جان کی
زندگی کا پتہ نہیں چل رہا اور اسے چلانے
کے لیے ہر صبح وہ اپنے گھر کے قریب
شہر ڈیمٹروو (Dmitrov) جو ماسکو سے

تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے وہاں سے سستی
شراب ”رشین واڈکا“ کی سات آٹھ بوتلیں خرید کر ایک تھیلے
میں ڈال لیتی ہے اور پھر اس بھاری بھر کم تھیلے کو اٹھائے
مسافروں سے بھری ایک بس میں سفر کر کے قریبی مقامی
ریلوے اسٹیشن جاتی ہے، جہاں سے وہ بذریعہ ٹرین ۳۰ گھنٹے
کی مسافت کے بعد ماسکو پہنچتی ہے۔ ماسکو میں
Kievskaya نامی زیر زمین ریلوے اسٹیشن کے باہر
جانے والے راستے کے قریب فٹ پاتھ پر سارا دن ایک
ہاتھ میں ”واڈکا“ کی بوتل لیے ٹرین سے آنے جانے
والے لوگوں کو آوازیں لگا کر متوجہ کرتی ہے۔ گاہک مل
جائے تو ایک بوتل ۱۲ روپل تقریباً ایک ڈالر کی بک جاتی
ہے۔ اگر تمام بوتلیں فروخت ہو جائیں تو اسے تقریباً ۸۵
سینٹ یعنی ایک ڈالر سے بھی کم منافع ہوتا ہے اور یہ برائے
نام فتنہ بھوش دن بھر سردی، بارش اور پولیس سے آنکھ بھولی
کھینے کے بمشکل حاصل ہوتا ہے۔ پولیس سے اس لیے بچنا
پڑتا ہے کہ اس کے پاس شراب بیچنے کا پرمٹ نہیں ہے۔
اگر اچھے اور بڑی کمپنی سے کچھ خالی بیئر کی بوتلیں بھی اکٹھی
کرتی ہے تو اس سے اضافی آمدن تقریباً ۳۰ سینٹ ہو
جاتی ہے۔

نانی جان نے انکشاف کرتے ہوئے کہا ”پہلے وہ
کبھی اس طرح روزانہ ماسکو نہیں گئی۔ اب اسے ہر روز

وہ اس پیرانہ سالی
میں کئی گھنٹوں تک
فٹ پاتھ پر کھڑی
رہ کر اپنی روزی
کماتی ہے



لازمًا جانا پڑتا ہے اس لیے کہ وہاں جاکر واڈکا شراب کی
بوتلیں نہ بیچیں تو اس کا مطلب بھوکا رہ کر دن کاٹنا ہوگا۔
اس مشقت کے لیے دن بھر اسے فٹ پاتھ پر کھڑا رہنا
پڑتا ہے۔ یہ کوئی زندگی تو نہیں؟ بھوک زدہ ہوں اس لیے
ہر حال میں ماسکو جانا پڑتا ہے۔“

نانی جان درمیانے قد و قامت والی بیوہ خاتون
ہیں۔ خاوند کو راعی ملک عدم ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں۔
وقت کی چیرہ دستیوں نے اس کے خوبصورت چہرے کو
جھریوں سے بھر دیا ہے۔ اپنے چاندی جیسے سفید بالوں کو
ایک رنگ برنگے سکارف کے نیچے ڈھک لیتی ہے۔ تن
بدن پر ایک سویٹر اوپر ڈھیلا ڈھالانی رنگ کا معمولی
کوٹ، موٹی جرابیں اور پٹھے پرانے بوٹ پہنے ہوتے
ہیں۔ اس کے سامنے کے دانت بھی گر گئے ہیں اور ان کی
جگہ نئے دانت لگوانے کے لیے ڈینٹسٹ کی فیس جو
۴۵۰ روپل بنتی ہے ادا کرنے کی سکت نہیں اور گزشتہ کئی
برسوں سے بنادانتوں کے ہی کام چلا رہی ہے۔

اُسے اپنی جسمانی قوت پر بھروسہ ہی نہیں بلکہ فخر
بھی ہے کہ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ فٹ پاتھ پر کئی
گھنٹوں کھڑی رہ سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسے اس بات کا
بھی اندیشہ ہے کہ جب اس کی ہمت جواب دے جائے
گی اور پاؤں لڑکھڑانے لگیں گے تو تب کیا ہوگا؟ وہ پہلے

جو افغانستان سے
چلے جانے کے
بعد بھی کئی برس
تک امریکیوں
کے لیے جاسوسی
کرتے رہیں گے



نئے منے

امریکی جاسوس

ارشد ادا شاری

اور دیگر مشینی آلات چلائیں گی۔ انھیں بنانے والوں کا
دعوٰی ہے کہ یہ بیٹریاں ۲۰ برس تک کام دیں گی۔
روایتی طور پر جب افواج باہم ٹکرائیں، تو وہ اپنے
پچھے تباہی و بربادی کی خوفناک نشانیاں چھوڑ جاتی ہیں۔
مثال کے طور پر زیر زمین بارودی سرنگیں جو جنگ ختم
ہونے کے کئی برس بعد بھی معصوم شہریوں کا لبو پتی ہیں۔
اگرچہ یہ نئے امریکی جاسوس افغانستان میں ایسی آفت
نہیں مچائیں گے جنھیں عسکری ماہرین نے ”دیکھ بھال سے
بے پروا ارضی حساسیے“ (Unattended ground
sensors) کا نام دیا ہے۔
تاہم ان جاسوسوں کو بے وقعت نہ سمجھیے کیونکہ انہی کی
بدولت امریکی فوج کو یہ سنہرا موقع ملے گا کہ میدان جنگ
چھوڑنے کے باوجود وہ طویل عرصہ اس پر نظر رکھ سکے۔ گویا
امریکی افغانستان سے چلے جانے کے بعد بھی افغانوں کی
جان نہیں چھوڑیں گے۔
لاک ہیز مارٹن دنیا میں سب سے بڑی اسلحہ ساز
امریکی کمپنی ہے۔ اس کا ایک اعلیٰ افسر، میٹ پلے برن کہتا
ہے ”ہم افغانستان میں اپنے پیچھے سیڑوں“ ”پیش آپریٹرز“
چھوڑ جائیں گے۔ ان آپریٹروں کو خاص صلاحیتیں دی گئی

صدر، باراک اوباما نے اعلان
کر رکھا ہے کہ ۲۰۱۳ء کے آخر
تک امریکی فوج افغانستان کو
خیر باد کہہ دے گی۔ لیکن عسکری
ماہرین نے انکشاف کیا ہے کہ اس کے بعد امریکی حکومت
کئی برس تک افغانوں کی جاسوسی کرتی رہے گی۔ جاسوسی کا
ٹیل ٹنٹے نئے مشینی جاسوسوں کے ذریعے انجام پائے گا۔
یہ مشینی جاسوس امریکا کی جدید ترین سائنس و
ٹیکنالوجی کی حامل عسکری کمپنیوں نے امریکی فوج کے لیے
تیار کیے ہیں۔ ان جاسوسوں کی جسامت ہاتھ جتنی ہوگی اور
امریکی فوج افغانستان سے رخصت ہوتے ہوئے ایسے کئی
سو جاسوس سرزمین افغانستان کے طول و عرض میں چھوڑ
جائے گی۔ جب بھی کوئی ان کے نزدیک آیا، تو یہ جاسوس
اسے شناخت کر کے اس کی خبر اپنے ہیڈ کوارٹر بھجوائیں گے۔
بیشمار ایسے جاسوس چٹانوں، درختوں یا مٹی کے اندر
پنہ بند ہوں گے۔ لہذا آنے جانے والے ان سے بے خبر
رہیں گے۔ پھر کچھ جاسوس دیکھنے میں بالکل پتھر لگیں
گے۔ ان میں سے کئی تو انسانی سے چارج ہونے والی بیٹریاں
نصب ہوں گی۔ وہی جاسوسوں کے حساسیے (Sensors)

امریکی

فٹ ہاتھ پر کی گئے کھڑا نہیں رہنا پڑا اور گھر واپس
راستے میں پڑا ایک استعمال شدہ کافی جاربھی مل گیا جو
کسی گھریلو استعمال میں لاسکتی ہے۔
برے دن وہ ہوتے ہیں جب اسے انتہائی بھوک لگی
ہوتی ہے اور بنا کھانے کئی گھنٹے فٹ ہاتھ پر کھڑا رہ کر
گاؤں کو متوجہ کرنے کے لیے ”واڈکا“ کی آوازیں لگا
پڑتی ہیں اور بعد میں بھوک مٹانے کے لیے دن بھر کا مٹا
یعنی ۱۸ روپے چھتدر اور گوشت سے بنے سوپ کے ایک
پیالے پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ سب سے بدترین ایام وہ
ہوتے ہیں جب ماسکو پولیس کا دورہ
انتہائی جارحانہ ہوتا ہے۔ اس کی
طرح اور پنشنرز جو فٹ ہاتھ پر
سگریٹ اور ”واڈکا“ بیچ رہے ہوتے
ہیں ان میں کسی کے پاس بھی یہ سب
کچھ فروخت کرنے کا پرمٹ نہیں ہوتا
اس لیے پولیس کو آتے دیکھ کر ڈرے
ہوئے چوہوں کی طرح بھاگ جاتے
ہیں۔ پولیس گشت کر کے چلی جاتی
ہے تو واپس آ کر پھر سے اپنی اپنی
چیزیں بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔
نانی جان پچھلی مرتبہ جب ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں تو
ڈاکٹر نے اسے کہا تھا کہ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ کس
قدر جسمانی طور پر مضبوط ہے اور اب تک اپنے پاؤں پر
ہمت و حوصلہ کے ساتھ کھڑی ہے۔
نانی جان نے کہا کہ وہ ایک باہمت خاتون ہیں، وہ
ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔
انہوں نے کہا کہ اگر کھانے کو کچھ نہ ہوا تب بھی وہ پانی اور
نمکین روٹی کے ٹکڑوں پر زندہ رہ سکتی ہیں۔ حالات کیسے
بھی کیوں نہ ہوں زندگی کی آخری سانسوں تک لڑوں گی۔
انھوں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا کہ حکومت نے
حالات پر جلد قابو نہ پایا تو ممکن ہے کہ بہت سے لوگ زندہ
نہ رہیں۔ کبھی میری طرح تو نہیں۔

ہی دے اور بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔ آمدن کا ایک کیشر
حصہ اس کی دوائیوں پر خرچ ہو جاتا ہے۔
کئی برس سوویت ہسپتالوں میں نرسنگ اور جزوقتی
سکولوں میں صفائی ستھرائی کا کام کرنے کے باوجود اس کی
غربت اپنی جگہ قائم رہی۔ تاہم ٹیلی ویژن اور فریج وغیرہ
خریدنے کی سکت رکھتی تھی۔ آج وہ بلند بالا عمارت میں
ایک چھوٹے کمرے کے اپارٹمنٹ میں اکیلی رہائش پذیر
ہے۔ اس کا برسوں پرانا ٹی وی اور فریج دونوں کام نہیں
کرتے اور بند پڑے ہیں۔ بلڈنگ میں گرم پانی کی سپلائی
بھی نہیں ہے۔ اسے اس بات کی
چھین محسوس ہوتی ہے کہ ملک میں کتنی
غربت ہے۔ اس کا اندازہ اسے تب
ہوا جب اس کے کچھ عزیز واقارب
یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے
تو تدفین کے اخراجات ان کے
لواحقین کے بس میں نہ تھے اور مجبوراً
انہیں دفنانے کی بجائے شمشان بھومی
میں لاش سوڑی کرنا پڑی۔ وہ بتاتی
ہے پہلے ایک غریب ترین آدمی بھی
پانچ روپے کے عوض کفن و دفن کر سکتا تھا۔
ایک ماہ گزر جانے کے بعد پہلی بار اس نے کوئنگ اہل
کی ۲ پولیس جن کی قیمت ۱۲ روپے سے بڑھ کر ۲۳ روپے
ہوگئی ہے، خریدی ہیں۔ پچھنی اس لیے نہیں خرید پائی کہ اس کی
قیمت پہلے سے ۳ گنا بڑھ گئی ہے۔ اب تو اسے یہ بھی یاد
نہیں رہا کہ آخری بار اس نے گوشت کب کھایا تھا۔
ماہوار پنشن نانی جان کو ہمیشہ تاخیر سے ملتی ہے۔ پہلے
اس کی بیٹی جو ایک سکول ٹیچر ہے اور داماد کچھ مالی امداد کر
دیتے تھے مگر جب سے اس کی بیٹی کوگزشتہ کئی ماہ سے تنخواہ
نہیں ملی تب سے یہ آسرا بھی جاتا رہا۔
اس کی زندگی میں برے دن تو رہتے ہی ہیں مگر ایسا
بھی نہیں کہ اچھے دن نہیں آتے۔ کل اس کا بہت اچھا دن
تھا جب اس کی تمام کی تمام بوتلیں فوراً بیک گئیں اور اسے

ہیں تاکہ وہ خفیہ طریقہ سے کسی بھی گاؤں کی نگرانی کر سکیں۔ یوں امریکی فوج کو یہ سہولت ہوگی کہ وہ سڑکوں اور راستوں پر جاسوسی کرنے والے عیام آلات رکھنے سے بچ جائیں۔“

یہ واضح رہے کہ امریکی فوج ۱۹۶۶ء سے کسی نہ کسی طور دیکھ بھال سے بے پروا ارضی حتماً استعمال کر رہی ہے۔ پہلے پہل امریکیوں نے ویت نام میں آواز ریکارڈ کرنے والے نئے جاسوس گرائے۔ ان کا مقصد ہو چکی منہ کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا تھا۔ حال ہی میں ہزارہا یہ نئے جاسوس عراق اور افغانستان میں استعمال کیے گئے۔



”ہم افغانستان میں اپنے پیچھے سیکڑوں ”سپیشل آپریٹرز“ چھوڑ جائیں گے۔ ان آپریٹروں کو خاص صلاحیتیں دی گئی ہیں تاکہ وہ خفیہ طریقہ سے کسی بھی گاؤں کی نگرانی کر سکیں“

نئے جاسوس

یہ نئے جاسوس کرکٹ کی گیند سے بھی چھوٹے ہیں۔ ہر ایک پر چار انچ لمبا اینٹا نصب ہے۔ وہ مسلسل ۳ ماہ تک کام کرتے ہوئے کسی گاڑی کے پیہوں یا انسانی قدموں کے نشان ہیڈکوارٹر بھجواتے ہیں۔ گویا مشرقی افغانستان کے دور دراز علاقوں میں یہ جاسوسی کرنے والے بہترین امریکی اوزار ہیں۔

مستقبل کے نئے جاسوس

آج کل لاک ہیڈ مارٹن کی لیباریوں میں نئی قسم کے دیکھ بھال سے مبرا ارضی حتماً سیوں پر تجربات جاری ہیں۔ ایک ایسا ارضی حتماً یہ تقریباً پچاس حتماً سے رکھتا ہے جسے نفوس علاقہ میں جال کی طرح بچھایا جاتا ہے۔ جب ایک حتماً کسی آدمی یا گاڑی کو شاخت کرے، تو خفیہ ریڈیائی فریکوئنسی کے ذریعے اس امر کی اطلاع اگلے حتماً سے کو دیتا ہے۔ یوں حتماً سیوں کے درمیان اطلاع کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ آخر یہ اطلاع مواصلاتی سیارے، خفیہ ریڈیو نیٹ ورک یا وائی فائی (Wi-fi) کے ذریعے مکائنڈر کنٹرول سنٹر تک پہنچتی ہے۔ ان حتماً سیوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ ٹویٹر جیسا پیغام ایسی جس افسر کے فون یا ٹیبلیٹ کو بھی بھجوا سکتے ہیں۔ جب یہ حتماً سے کوئی گنٹل نہ پکڑیں اور نہ ہی امریکیوں کو اطلاعات بھجوائیں، تو وہ نیم مردہ ہو جاتے اور بہت کم توانائی استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ ان میں مٹی میں دبا کر کئی ماہ محفوظ و کارآمد رکھا جائے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں مصنوعی پتھروں کے اندر پوشیدہ رکھنا بھی ممکن ہے۔ چنانچہ قریب سے دیکھنے پر وہ پتھر

ان نئے جاسوسوں نے دونوں ممالک میں امریکی و اتحادی افواج کی چوکیوں کے گرد خفیہ دفاعی حصار قائم کر دیا۔ یہ تھا کہ دشمنوں کی نقل و حرکت سے باخبر رہا جائے۔ امریکیوں کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ خفیہ بھر فوجیوں کے ذریعے ہی خاصے وسیع علاقے پر نظر رکھ سکیں۔ امریکی افواج میں بریگیڈیئر میٹ رسل ان نئے جاسوسوں کا کمانڈر ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کسے کی تعینات کیا جائے۔ بریگیڈیئر رسل کہتا ہے ”ہم انہیں ”مردہ“ علاقہ کی نگرانی کرنے میں وسیع پیمانے پر استعمال کرنے لگے ہیں۔ مردہ علاقہ سے مراد وہ اہم جگہیں ہیں جہاں کی نگرانی ہم انسانوں یا ڈرونوں سے نہیں کر سکتے“

قابل ذکر بات یہ ہے کہ دیکھ بھال سے مبرا ارضی حتماً صرف ۱۰ سال قبل تک بہت بڑے، بدشا اور ہوتے تھے۔ وہ اکثر غلط الارم بجا دیتے اور ان کی عمر کم دن یا ہفتے ہوتی۔ رفتہ رفتہ انہیں جدید بنایا گیا۔ اب امریکی افواج کو جدید ترین بنانے کے لیے ۲۰۰۰ سرب (۱۹۰ کھرب ۲۰۰ روپے) خرچ کرنے کا منصوبہ ہے۔ مزید ترقی یافتہ نئے جاسوس متفقہ طور پر آئیں گے۔ امریکی انہیں بیرون ممالک ہی نہیں اندرون بھی کام میں لا رہے ہیں مثلاً میکسیکو کی سرحد ۵۰۰ دیکھ بھال سے مبرا ارضی حتماً سے تعینات ہیں۔ غیر قانونی مہاجرین پر نظر رکھی جائے۔ اسی لیے

میکسیکو کی سرحد پر ۵۰۰ دیکھ بھال سے مبرا ارضی حتماً سے تعینات ہیں تاکہ غیر قانونی مہاجرین پر نظر رکھی جائے

ہی لگتے ہیں۔ تاہم ان میں نئے نئے ششی پینل لگے گئے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ دھوپ میں تیزی سے چارج ہونے والے یہ ششی پینل نئے جاسوسوں کو اس قابل بنادیں گے کہ وہ دنیا میں کہیں بھی سیکڑوں رات دن تک ”زندہ“ رہیں۔

لاک ہیڈ مارٹن کمپنی کا دعویٰ ہے کہ درج بالا حتماً سیوں کی بیٹری ڈاک ٹکٹ جتنی ہوگی۔ نیز یہ ممکن ہوگا کہ اسے ”۸۰ ہزار“ بار چارج کیا جاسکے۔ واضح رہے، عام تقسیم۔ آئن بیٹری کو چند سو بار ہی چارج کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ حتماً سے معمول کے مطابق بھی کام کریں، تو ان کی بیٹریاں انہیں کم از کم ۲۰ سال تک چالو رکھیں گی۔ بعض عسکری ماہرین کو کمپنی کے دعویٰ پر شک ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بیٹری جتنی بڑی ہو، اس کی عمر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس اعتراض کے باوجود امریکی فوج یہ ارضی حتماً سے خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ ایک وجہ ان کا سستا ہونا بھی ہے۔ حتماً سیوں کا ایک نیٹ ورک صرف ۱۰۰۰ ارڈر میں ملتا ہے۔ ظاہر ہے، یہ ایسی فوج کے لیے خاصا سستا ہے جو توپ کے ایک گائیڈ ڈکولے پر ۸۰ ہزار ڈالر (تقریباً ۷ لاکھ روپے) خرچ کر ڈالتی ہے۔

لاک ہیڈ مارٹن کے علاوہ کمپنیاں مائیکروسافٹ نامی کمپیوٹر کمپنی کے ماہرین بھی نئے جاسوس کی تیاری پر مجھے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں امریکی فوج نے اسے

میدان جنگ میں چھوڑ دو اور بھول جاؤ

نئے جاسوس ڈرامائی طور پر بہت چھوٹے اور انتہائی کم توانائی استعمال کرتے ہیں۔ یوں ممکن ہو گیا کہ وہ ۱۰۰ فیصد حد تک نظروں میں آئے بغیر کئی ماہ بلکہ برسوں تک اپنا کام کر سکیں۔ اسی لیے لاک ہیڈ مارٹن کے ماہرین کی رو سے نئے جاسوس مسلسل جاسوسی کرنے والے ایسے سپاہی ہیں کہ انہیں میدان جنگ میں چھوڑ دو اور پھر بھول جاؤ۔“

دوران بیماری و علاج امی نے کبھی مایوسی کا اظہار نہیں کیا، کبھی کلمہ ناشکری ادا نہیں کیا، حتیٰ کہ کبھی موڈ بھی خراب نہیں ہوا، بس ہر دم اللہ کی یاد ہوتی تھی یا ہماری فکر، ہمیشہ ہمارے ہر کام میں دلچسپی لیتی رہیں کیا پکا یا کیا پکانا چاہیے، کیا کھایا یا کیا کھانا چاہیے، کس سے ملے یا کس سے ملنا چاہیے اور بازار سے کیا لائے یا کیا لانا چاہیے وغیرہ وغیرہ..... معجزانہ حد تک بڑی بات تھی کیونکہ زندگی ان سے روکھ رہی تھی لیکن وہ زندگی سے راضی تھیں بلکہ موت سے بھی سے راضی تھیں، کیونکہ اللہ سے راضی تھیں۔ یہاں میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ کینسر ان کی زندگی میں پہلی آزمائش نہیں تھا بلکہ بلابالغہ ان کی زندگی کی تاریخ میں چند ایک خوشیوں کے علاوہ سارا عرصہ حیات آزمائش ہی تھا، سب تاریک تھا لیکن اللہ کی محبت نے ہر دور کو روشنی دی۔

پھر کینسر دوسری سے آخری سیج کی طرف سفر کرتا گیا۔ جب امی کے سر کے سارے بال جھڑ گئے تو دل درد سے چور ہو گیا تھا کیونکہ یوں تو ہر ماں ہی اپنی زندگی بچوں پر نچھاور کر رہی ہے لیکن ہم اسے ایک تلخ حقیقت کی طرح لہجہ بہ لہجہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھ رہے تھے۔ ہر خطرناک رپورٹ کے بعد بھی امی کا صبر و استحکام اپنی مدھرنے میں سفر کر رہا تھا کہ ایک رات ہاتھ روم سے واپسی پر وہ گر پڑیں اور کندھے کی ہڈی میں کرک (Crack) آگیا، ڈاکٹر نے ہاتھ لگانے سے معذرت کر لی کیونکہ کینسر کا اثر ہڈیوں میں بھی نفوذ کر چکا تھا۔ دائیں جانب کینسر اور بائیں جانب چوٹ، کمر میں میڈوز..... ”دکھ“ جیسے چھوٹے لفظ کی مکمل تفسیر ہم پڑھ رہے تھے اور ”درد“ جیسے ہماری لفظ کی مکمل تصویر ”ہماری ماں“ کو ہم دیکھ رہے تھے۔ یونہی دیکھتے دیکھتے میں پوچھ ہی بیٹھی، امی! آپ اس سب سے پریشان تو نہیں؟ بستر مرگ پر تصویر درد نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائیں اور جواب دیا نہیں بیٹا میں بہت مطمئن ہوں، ان کا یہ اطمینان مجھے عمر بھر کے لیے مطمئن کر گیا اور یہ سبق دے گیا کہ اطمینان کا تعلق جسمانی آرام و آسائش سے نہیں بلکہ

دل کی حضوری سے، شرف باریابی سے ہے۔ اب نیند کے انجکشن کے سوا چارہ نہ تھا، تاکہ ہر روز کی شدت کو کم سے کم محسوس کرے لہذا آخری روز بھی معمول رہا کہ انجکشن لگا کر سلا دیا جاتا۔ سونے کے دوران انھیں تو میری بہن نے اڑا کر ہٹھکے انداز میں پوچھا ”امی! خواب میں کیا دیکھتے تھیں؟“ تو جواب فرمایا: ”آج تو سارا وقت مدینہ کی میں گزارا ہے۔ پھر آنکھیں بند کر لیں..... پھر رات کی لیکن آنکھیں نہ کھلیں۔ میں نے جگایا امی! تو ایک بار طرف آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر بند۔ طبیعت تھی۔ ایسویٹس آئی۔ سارا سفر یا حسی یا قیوم برحمتک استغیث اور حسنا اللہ نعم الوکیل پڑھتے گزارا..... امی آئی سی یو میں اور میں باہر اللہ کو یاد کر رہی تھی، امی کو دیکھ رہی تھی کہ وہ دیر بعد ڈاکٹر نے باہر آکر ”Sorry“ کہا تو میں آنسوؤں کو روکنے ہوئے، کپکپاتے ہوتوں سے کہا کہ بات نہیں ڈاکٹر صاحب ہم اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔ ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات انتہائی حیران کن تھے۔ میں نے اپنا جملہ دہرایا..... ہسپتال کے کالڈکس دیکھ کر۔ بقایا ہوش و حواس گھر فون کر کے بہن کو گھر سمیٹنے اور چھوٹی بہن کو سنبھالنے کے لیے کہا اور کے بعد فون اپنے بھائی کو پکڑا دیا کہ اب کچھ اور مجھ میں تاب نہ بھی جو کچھ کہہ رہے تھے میرے آنسوؤں سے تھے اور میرے آنسوؤں کے کہنے سے بڑھ کر امی کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ جی ہاں مسکراہٹ۔ یہ سب ہی جسے میں نے تصویر میں بند کرنا چاہا مگر نہ ہوئی غسل (دنیا کی آلائشوں سے پاکی کے لیے) پھر غسل کی محبت کا لباس) پھر فون (ازلی آرام گاہ میں)۔ اس سب کے بعد وہی زندگی کا گورکھ دیکھا مقصد اپنی والدہ کی کہانی سنانا نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ میں کو بتا سکوں کہ اللہ آپ کے، ہمارے، ہم سب کے ہے، آس پاس ہے۔ اسے پکارنے کے لیے دلدار

ہی نہیں، بلکہ سی شبنمی سرگوشی بھی کام کرتی ہے۔ روز اول سے تاحرور میں اپنے رب کی انہی نعمتوں سے فیض یاب ہوتی آ رہی ہوں، آپ بھی ہو رہے ہیں اور مزید ہو سکتے ہیں۔ ذرا اللہ کی محبت کو Practice تو کر کے دیکھیں۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ میں نے ڈاکٹر کے Sorry کہنے پر کس طرح سے یہ کہہ دیا کہ ہم اپنے اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔ میں جو دعا کرتے ہوئے اس لہجہ کے بارے میں سوچنے سے بھی گریزاں تھی اور ڈرتی تھی کہ اگر ایسا ہوا تو میں ڈوب نہ جاؤں لیکن دوینا تو دور کی بات میں تو لڑکھائی بھی نہیں۔ میں یا حسی یا قیوم برحمتک استغیث کا جو ورد کرتی آتی تھی وہ امی کی وفات کے بعد بھی جاری رہا شاید اسی کو قلب کا جاری ہونا کہتے ہیں۔ آج بھی جب ان مناظر کے بارے میں سوچتی ہوں تو برملا کہتی ہوں کہ میرے رب کی رحمت نے مجھے پکڑ لیا تھا، جذبات کی شدت میں کوئی کلمہ ناشکری بھی نقل نہ سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اپنی امی جیسی زندگی جینے کی ہمت اور ظرف مجھ میں نہیں اس لیے اس بارے میں نصیحت کرنا میں اپنا حق نہیں سمجھتی مگر عزیزان من جان لیجیے! جس جس گھر میں دل میں غم ہے وہ بہت خوش قسمت ہے کیونکہ یہ بڑی دولت ہے جو قرب الہی کا ذریعہ ہے۔ اگر غم ”دولت“ نہ ہوتا تو اللہ اپنے نبیوں اور ولیوں کو یہ نہ دیا کرتا۔ غور کیجیے آپ بھی اس دولت کے امین بنائے گئے کیا آپ نے اس خوش قسمتی پر اپنے اللہ کا شکر ادا کیا؟ قسمت آپ کو کینسر ہسپتال لے کر زندگی کے نئے زاوے کو دیکھا..... زندگی کی نعمتوں کی وہ قدر محسوس کرنے کو ملی جو اس سے پہلے نہ تھی، کیا آپ نے اس شعور اور عرفان حیات پر اللہ کا شکر ادا کیا؟ وہ ہسپتال جوتی بڑی بیماری کے علاج کے لیے آپ کے سعادتوں سے، مددگار و غم خوار رہے۔ کیا آپ نے ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے؟

آپ اپنے پیارے کے مرنے کے غم میں مرنا تو چاہتے تھے لیکن کیا آپ نے غور کیا کہ درد تو جینا سکھا دیتا

اللہ آپ کے، ہمارے، ہم سب کے قریب ہے، آس پاس ہے۔ اسے پکارنے کے لیے دل و زچہ نہیں، بلکہ سی شبنمی سرگوشی بھی کام کرتی ہے

ہے۔ جس درد کو کمزوری بنا لیا جائے تو وہ مار دیتا ہے اور جس درد کو اپنی طاقت بنا لیا جائے تو انسان ”جی“ جاتا ہے۔ شوکت خانم کینسر ہسپتال، ہسپتال کا نہیں، عمران خان کے درد کا نام ہے۔ اسی طرح سے کئی اور فلاحی ادارے کئی درد کو اپنی طاقت بنانے سے بنے ہیں۔

امی کی وفات کے بعد جب ہمیں رورہی تھیں تو میں نے انہیں کہا تھا کہ ”ممت روؤ، یہ درد بھی نبی ﷺ کی سنت ہے اور ہم اس کے امین بنائے گئے ہیں، یہ ہماری خوش نصیبی ہے، رب رحمن کی عطا ہے۔ آپ ﷺ پیدا ہوئے تو والد وفات پا چکے تھے۔ ذرا سوچیے! ہم اپنے بچے، بھانجے یا بھتیجے کے لیے یہ سوچ سکتے ہیں کہ وہ پیدا ہوا اور یتیم ہو؟ نہیں ناں تو دیکھیں یہ کتنا بڑا غم ہے اور پھر ایسا یتیم جب صرف ۶ برس کا ہو تو دوران سفر والدہ وفات پا جائیں، راستہ میں دفنا دی جائیں اور واپسی اکیلے ہو؟ اور پھر دادا کے سایہ شفقت میں پناہ ملیں تو ۲ برس۔ محض ۲ برس کے بعد وہ بھی وفات پا جائیں اور تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب دادا کا جنازہ جا رہا تھا تو آپ ﷺ پیچھے پیچھے روتے جاتے تھے۔

سوچیے! کائنات کے والی، اللہ کے محبوب اور نبیوں کے سردار پر کیا کیا غم ٹوٹے تو ہماری اوقات کیا ہے؟ یہی غم پیارے نبی ﷺ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بناتا ہے اور پھر یہ غم جب بھی کسی کے دل پر دستک دیتا ہے تو رحمت بن کر دیتا ہے۔ رحمت عالم ﷺ کی سنت بن کر دیتا ہے۔ اگر ہم اعلیٰ ظرف و احترام سے اسے اپنالیں تو یہ

۳/ افراد کی کہانی
ایک دن وہ دنیا کے بادشاہ بن گئے تھے.....



تنہا تنہا

امریکا کے ایک مستقبل بین
فنانسٹرازرے براڈبری کی تحریر
تحفہ خاص

ترجمہ: عالیہ اخلاق

اعتراض بھی ہو سکتا ہے، خاص کر وہ لوگ جو سطحی جہان کے حامل ہیں، تاہم الحمد للہ! آپ مجھے یہ کہہ کر بھی نال سکتے کہ صبر و شکر کی تلقین کرنا تو آسان ہے بی بی کر کے بتاؤ تو جائیں۔ میں نے صبر و شکر کو کتابوں پڑھ کر Quote نہیں کیا ہے، یہ میں آپ بیتی کہیں ہوں میں نے بھی جھڑتے بال دیکھے ہیں، سیاہ پڑتے ہیں جو سفید و اش بنیں کو نیلا کر دیتی ہیں، اور وہ اور خون کی کمی سے بجھتا زرد چہرہ دیکھا ہے اور وہ دیکھا ہے جو گفن کو بھی سرخ کر دیتا ہے لیکن گفن کی یہ انسان کو کہاں لے جا سکتی ہے، اس کا ایک رنگ یہ خواب سے عیاں ہے۔ اپنی والدہ کی وفات کے کچھ عرصے بعد میں نے خواب میں دیکھا ”میری والدہ مسجد نبویؐ باہر ایک سبز رنگ کے سادہ سے نکلری کے بیچ بیٹھی پھر منظر بدلتا ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ امی حج کرنے بعد مٹھائیوں سے لدی گھر آئیں اور مجھے کہتی ہیں آپ کو پتا ہے؟ کہ وہ بیچ پیارے نبیؐ کا ہے اور اس پر کی سب کو اجازت نہیں، مجھے اجازت ملی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اب نبیؐ روزانہ مجھے نظر آئیں گے۔“ یہ سب دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کے جب یہ قول مبارک پڑھا تو یقین جانیں کہ یہ خوشی مجھے قول مبارک کی تفسیر لگی، قول یہ تھا کہ ”پریشانی تذکرہ کرتے رہنے سے بڑھ جاتی خاموش ہونے سے کم، صبر کرنے سے ختم اور شکر کرنے سے خوشی میں بدل جاتی ہے۔“

میرے پاس لفظوں کا طلم ہے اور نہ جملوں کا جو گری بس ایک مخلصانہ ہی گزارش ہے جان سے جان کے بعد بھی جینے والوں کے نام۔ میں جانتی ہوں کہ بھی ان کے ساتھ ہی مر جانا چاہتے ہوں لیکن میں نے اس کی اجازت نہیں دی ہوگی۔ کبھی موت جیسے اجازت نہیں دیتی اور بھی زندگی مرنے کی۔ ہمارے میں واقعی کچھ نہیں اور جو کچھ ہمیں اختیار لگتا ہے وہ بھی کے اختیار کی ایک معمولی سی جھلک ہے اور کچھ بھی نہیں

رحمت تاحیات بلکہ بعد از ممات بھی ہمارے ساتھ چلتی ہے۔ امی کی بیماری کے دوران ایک رات میری بہن نے خواب میں دیکھا کہ جیسے ہمارے گھر میں پیارے نبیؐ کرسی پر تشریف فرما ہیں اور امی ان کے قدموں میں بیٹھی اپنا تمام دکھ اور حال بیان کر رہی ہیں اس کے بعد پیارے نبیؐ میرے چچا کا نام لے کر کہتے ہیں کہ اس کو بلاؤ..... یہ خواب سن کر بے حد خوشی تو ہوئی لیکن چچا کے ذکر کی سمجھ نہ آئی (کیونکہ اس وقت تک چچا بھی امی کی بیماری سے آگاہ نہیں تھے) بعد ازاں یہی چچا امی کے لیے ۲۰ بیگ صحت مند خون کا بندوبست کرنے کا ذریعہ بنے تو ہمیں خواب کے دوسرے حصہ کی تعبیر سمجھ میں آئی۔

معزز قارئین! یہ سب بتانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ کو بھی خواب ہی دکھائی دیں یا آپ بھی ڈاکٹر سے کہیں کہ ہم راضی ہیں۔ بلکہ مقصد رویوں کی تبدیلی سے ہے، خوشیوں اور غموں کو نئے زاویہ نظر کی ضرورت ہے۔ جب اللہ ہمیں لاتعداد نعمتیں اور خوشیاں دیتا ہے تو کیا ہم لاتعداد بار شکر ادا کرتے ہیں؟ نہیں ناں پھر جب بھی اللہ ہمیں آزماتا ہے تو ہم ناشکری پر، مایوسی پر اتر آئیں؟ یہ رویہ خود کو Justify نہیں کر سکتا۔ ذرا سوچیے کہ اس غم کے ذریعے اور اس آزمائش کو وسیلہ بنا کر اب کائنات نے آپ کے اکاؤنٹ میں کس قدر کثیر تعداد میں خالص دعائیں شامل کر دیں کہ جن کی بابت اس کا وعدہ ہے کہ روز قیامت وہ ان کا ایسا نعم البدل عطا کرے گا کہ بندہ کہے گا کاش! زندگی میں میری کوئی بھی دعا قبول نہ ہوئی۔ تو کیا آپ نے اپنے اس اکاؤنٹ پر اللہ کا شکر ادا کیا؟ مجھے اندازہ ہے کہ بعض لوگوں کو میری اس تحریر پر

”اگر غم“ دولت“ نہ ہوتا تو اللہ اپنے نبیوں اور ولیوں کو یہ نہ دیا کرتا“

خیال ہے مارتھا.....! یہیں پکنک منائیں؟“
 ”ہاں، یہ اچھی جگہ ہے۔“ مارتھا نے مسکرانے کی
 کوشش کی پھر آہستہ سے پوچھا۔ ”جارج! آج ہم نے کتنا
 سفر کیا ہے؟“

”۹۰ میل۔“ جارج نے بتایا۔ ”بہت زیادہ سفر کرنا
 بھی مناسب نہیں ہوتا۔ آدمی فطرت کے رنگ غور سے نہیں
 دیکھ پاتا، لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ کل تک ہم مانٹی رے
 پہنچ جائیں گے اور پرسوں پالو آلوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ننھا
 جونی تھک جائے۔“

ان تینوں نے وہیں پکنک کا آغاز کر دیا۔ جارج نے
 سبز گھاس پر چادر بچھائی اور ننھا جونی انجن سے سامان
 نکال نکال کر لانے لگا۔ مارتھا نے سینڈوچز اور کافی کے
 پیالے سلیتے سے سجادے اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔
 ان کے ارد گرد خاموشی تھی مگر اس خاموشی میں سمندر کی
 گرج تھی اور پرندوں کے چہچہے تھے۔ پینر کا سینڈوچ
 کھاتے کھاتے ننھے جونی نے اچانک کہا ”پاپا! کیا ہم
 لوگ اکیلے رہ گئے ہیں؟“

مارتھا اور جارج نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر جارج
 نے جواب دیا ”ہاں بیٹا!“
 جونی نے پوچھا ”کیا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے؟“
 کہیں بھی نہیں ہے؟“

”ہاں، بیٹا! دنیا میں کہیں کوئی نہیں ہے۔“
 ”کیا پہلے دنیا میں لوگ رہتے تھے؟“
 ”کیسی باتیں کرتے ہو جونی! بار بار تم ایک ہی جیسے
 سوالات کرتے ہو۔ ابھی چند ہفتے پہلے ہی کی بات ہے۔
 تمہیں یاد ہوگا بیٹا!“
 ”یاد تو ہے۔“ جونی نے ننھے ہاتھوں سے اپنا منہ
 صاف کیا۔

”مگر میں بار بار بھول جاتا ہوں۔ اچھا، پاپا، یہ سب
 لوگ کہاں چلے گئے؟“

جارج نے سر گھما کر سمندر کی طرف دیکھا، پھر بولا۔
 ”پتا نہیں جونی!“ اور یہ بالکل سچ تھا۔ وہ ایک صبح بیدار

ایک تروتازہ دن تھا۔ اتنا ہی تروتازہ
 جتنا خوش رنگ گھاس اور نیلے آسمان
 پر تیرنے والے بادل اور رنگ برنگی
 تتلیاں کسی عام دن کو بنا سکتی ہیں۔
 فضا میں سناٹا تھا، ایک عجیب سناٹا جس میں سمندر کی، زمین
 کی اور شہد کی کھپیوں کی بھین بھناہٹ اور پودے سر سرانے
 کی آوازیں شامل تھیں۔ زمین ساکت تھی مگر ساکت نہیں
 تھی۔ سمندر خاموش تھا مگر خاموش نہیں تھا۔ ہر سرب کسی
 دوسرے سرب میں ملتا محسوس ہوتا تھا۔ ہر چپ ایک اور
 چپ میں مدغم ہوتی نظر آتی تھی۔ ہر آواز کسی نئی آواز سے
 ہم آغوش ہوتی معلوم ہوتی تھی۔

یہاں ایک جانب پہاڑی سلسلہ تھا، دوسری جانب
 سمندر اور ان کے درمیان ریل کی ایک پرانی، زنگ آلودہ
 پٹری تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے برسوں سے یہ
 پٹری کسی نے استعمال نہیں کی۔ چھوٹی چھوٹی گھاس نے
 جگہ جگہ پٹری ڈھانپ لی تھی۔

پٹری اچانک لرزنے لگی، شاید برسوں بعد اس پر کوئی
 ریل آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد، بہت دور، پٹری پر ایک انجن
 نمودار ہوا۔ صرف انجن۔ اس کے پیچھے کوئی ڈبائیں تھا۔
 تیزی سے دوڑتے ہوئے انجن نے بریک لگانے
 شروع کیے۔ زنگ آلود پٹری لرزنے لگی۔ انجن کی رفتار کم
 ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ انجن رک گیا۔ پھر کسی نے انجن کا
 سوچ آف کر دیا۔

ہر جانب پھر وہی گہری خاموشی چھا گئی۔
 انجن سے ایک مرد پہلے کود کر اتر ا پھر ایک عورت
 اتری پھر ایک ۷۰ سالہ بچہ نیچے اتر ا۔ انھوں نے اتر کر
 ادھر ادھر دیکھا، پہاڑی سلسلے پر اور دوسری جانب پھیلے
 ہوئے نیلے سمندر پر نگاہ کی۔

”سمندر اچھا لگ رہا ہے۔“ عورت نے کہا۔
 ”کیوں جارج؟“

”مجھے بھی اچھا لگ رہا ہے۔“ بچے نے کہا۔
 جارج نے دُور بین سے آگے کا منظر دیکھا۔ ”کیا

ہوئے تو دنیا لوگوں سے خالی ہو چکی تھی۔

پڑوسیوں کے عقیبی باغیچے میں دھلے ہوئے کپڑے اسی طرح لٹک رہے تھے۔ گھروں کے سامنے کاریں اسی طرح کھڑی تھیں مگر کہیں، کوئی نہیں تھا۔ دنیا انسانوں اور ان کی آوازوں سے خالی ہو چکی تھی۔ سارا ہنگامہ، سارا شور، ساری بھاگ دوڑ ایک سائے میں بدل چکی تھی۔

اس واقعہ سے صرف ایک دن پہلے جارج اور مارتھا اپنے پورچ میں سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ باکر نے شام کا اخبار ان کی طرف اچھالا اور اپنی موٹر سائیکل پر زن سے آٹھے نکل گیا۔ وہ جانتے تھے کہ اخبار وہی خبریں لایا ہوگا۔ تباہی کی، بربادی کی، غارت گری کی خبریں۔ جارج اور مارتھا، دونوں اخبار کھولنے اور اس کی سرخیاں دیکھنے سے گر پڑاں تھے۔ معاً جارج نے کہا ”نہ جانے خدا کب انسان سے تنگ آئے گا اور کب اسے فنا کرنے، روئے زمین سے غائب کرنے کا فیصلہ کرے گا۔“

”واقعی؟“ مارتھا نے کہا۔ ”انسان کی درندگی کب تک، کہاں تک چلتی رہے گی؟ ہم انسان کس قدر نادان، کس قدر بے وقوف ہیں، ہے نا؟“

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں.....“ جارج بولتے بولتے رک کر پائپ سلگانے لگا۔

”کیا سوچتے ہو؟“ مارتھا نے سوال کیا۔

پائپ کا طویل کش لے کر جارج نے کہا۔ ”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اگر ہم کل صبح بیدار ہوں اور ہمیں پتا چلے کہ دنیا سے انسان غائب ہو گیا ہے اور اب جیسے انسانی زندگی کا پھیانے سرے سے چلانا ہو۔“

مارتھا مسکرائی۔ ”اچھا، فرض کرو، اگر تمہیں ایسا کرنے کے لیے صرف ایک مین دبان ہو تو کیا تم وہ مین دبا دو گے؟“

”شاید دبا دوں گا۔“ جارج نے سوچتے ہوئے کہا۔

”بشرطیکہ ایسا کرنا کوئی قتل عام نہ ہو۔ انسان، بس غائب ہو جائیں۔ دنیا اسی طرح رہے۔ زمین، سمندر، پھل پھول اور جانور سب کچھ اسی طرح رہیں بس انسان نہ رہیں۔ یہ وحشی انسان صفحہ ہستی سے مٹ جائے جو بھوکا نہ ہو تو بھی

شکار کرتا ہے، شکم سیر ہو چکا ہو پھر بھی کھاتا ہے، کسی کے ہاتھوں پریشان نہ ہو پھر بھی کمینگی سے باز نہیں آتا۔“

مارتھا پھر مسکرائی۔ ”واقعی، برا مزہ آئے۔ بس ہم لوگ زندہ رہیں۔ میں اور تم اور جوئی۔“

”کیا زبردست زندگی ہوگی۔“ جارج ہنسا۔ ”وقت ہی وقت ہوگا۔ تاریخ کی طویل ترین چھٹیاں ہوں گی۔ کائنات کی سب سے لمبی پلنگ منائیں گے ہم۔ ہمیں نہ وقت پر کہیں پہنچنا ہوگا، نہ کہیں سے تھک ہار کر واپس آنا ہو گا۔ نہ دولت مندی میں کسی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ نہ کوئی خوبصورت، خوش رنگ کار رکھنی ہوگی۔ ہم خوب سیر کریں گے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک۔ سینڈوچز، کافی اور سیر و سیاحت۔“

وہ بہت دیر تک پورچ میں خاموش بیٹھے رہے۔ اخباریوں ہی تہہ کیا ہوا پڑا رہا۔ لمبے وقفے کے بعد مارتھا نے صرف اتنا کہا ”جارج، ہم تنہائی تو محسوس نہیں کریں گے؟“ جارج نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اگلی صبح ان کی نظروں نے وہ منظر دیکھا جو ناقابل یقین معلوم ہوتا تھا۔ ان کی آنکھ کھلی تو دنیا بدل چکی تھی۔ انسانوں کی آوازیں، انسانوں کا ہنگامہ، سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ جارج نے بیدار ہوتے ہی یہ خاموشی محسوس کر لی۔ اس نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی اور کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا ”سب کچھ ختم ہو گیا۔“

دونوں نے حیرت انگیز، ناقابل یقین واقعہ پورے حوصلے، پورے ہوش سے سمجھنے کی کوشش کی۔ ناشتا کرنے کے بعد بھی وہ دیر تک میز پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ آخر جارج نے کہا ”میرا خیال ہے اب مجھے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“ مارتھا نے پوچھا۔ ”کیا تم نوکری چھوڑ دو گے؟“

جارج ہنسا۔ ”تم شاید اب تک بے یقینی کا شکار ہو۔ جان من! اب مجھے ہرج دفتر جانے کے لیے طوفان کی طرح روانہ نہیں ہونا، جوئی کو اسکول نہیں جانا۔ پڑھائی،

تو کمری، باس کی ناراضی..... سب ختم۔ بالکل ختم۔“
 انھوں نے باہر نکل کر ویران سڑکیں اور سنان
 عمارتیں دیکھیں ہر جانب گہرا سناٹا تھا۔ ”لوگ مرے نہیں
 ہیں۔“ جارج نے کہا۔ ”بس..... غائب ہو گئے ہیں۔
 نہیں چلے گئے ہیں۔“

مارتھا نے پوچھا۔ ”کیا ہر جگہ؟ ہر شہر میں؟“
 انھوں نے ایک ٹیلی فون بوتھ سے دوسرے شہروں
 میں آباد اپنے عزیزوں کے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔
 نیواگ، نیویارک، سان فرانسسکو۔ خاموشی، ہر جگہ خاموشی،
 گہری، بے انت خاموشی۔ جارج نے ریسیور کریڈل پر لٹکا
 دیا اور بوتھ سے نکل آیا۔

”میں..... میں احساس جرم کا شکار ہو رہی ہوں۔“
 مارتھا نے کہا۔ ”انسان ختم ہو گیا اور ہم بچ گئے ہیں اور اس
 پر میں خوش ہو رہی ہوں۔ کیوں؟ مجھے تو ناخوش ہونا چاہیے۔“
 کیا احقانہ بات ہے۔“ جارج نے کہا۔ ”یہ کوئی المیہ
 تو نہیں ہے۔ انہیں قتل نہیں کیا گیا، دھماکے سے نہیں اڑا دیا
 گیا، جلایا نہیں گیا۔ وہ بس، خاموشی سے رخصت ہو گئے۔
 ہم پر اب کوئی بوجھ نہیں ہے۔ ہماری ذمہ داری اب
 صرف یہ ہے کہ ہم خوش رہیں۔ ۲۰، ۳۰، ۴۰ سال خوش
 رہیں۔ اتنی طویل خوشی کے سوا آدمی کیا آرزو کر سکتا ہے۔“
 ”لیکن.....“ مارتھا نے کہا۔ ”ہمارے اور بھی بچے
 پیدا ہونے چاہئیں۔“

”تا کہ دنیا دوبارہ آباد ہو سکے؟“ جارج نے تلخی
 سے کہا۔ ”نہیں ہرگز نہیں۔“ مارتھا نے اس دنیا کا آخری
 انسان ہو گا اور اس کے بعد اس دنیا پر صرف پرندے،
 جانور اور درخت حکمرانی کریں گے۔ پھر شاید کروڑوں،
 اربوں سال بعد کوئی دوسری، کوئی مختلف نسل اس زمین
 پر جنم لے جو ایسے شہر بسائے جہاں خوشیاں ہوں اور
 امن ہو۔ انسان کو اس دنیا میں دوبارہ آباد ہونے کا حق
 نہیں ملنا چاہیے۔ اچھا اٹھو، اب ہمیں تاریخ کی طویل ترین
 جڑیاں گزارنی ہیں۔ دنیا کی سب سے لمبی پکنک کا آغاز
 کرنا ہے۔ تیاری شروع کر دو۔“

وہ سر سبز گھاس پر چادر بچھائے بیٹھے تھے۔ ایک
 جانب بلند پہاڑ تھے، دوسری جانب شور مچاتا سمندر تھا اور
 ان کے درمیان وہ پرانی پٹری تھی جس پر ان کا انجن کھڑا
 تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ساحل کی طرف آگئے۔ ننھا
 جونی رنگین سپیاں جمع کرتا رہا، جھاگ اڑاتی لہریں ساحل
 کی طرف آتی اور دم توڑ کر واپس جاتی دیکھتا رہا پھر وہ ایک
 درخت کے سائے میں سو گیا۔

دوپہر ڈھلنے لگی تو وہ درختوں کے سائے سے نکل کر
 پہاڑ کی طرف چلے گئے۔

۵، ۴، ۳، ۲، ۱۔ ہفتے گزر چکے تھے۔ وہ مسلسل سفر کر رہے
 تھے۔ ہر روز ۵۰ یا ۱۰۰ میل کا سفر۔ نئی جگہیں، نئے
 علاقے، نئے مرغزار، نئی وادیاں۔ انھوں نے مل کرنے
 راستے ڈھونڈے، نئے پودے دیکھے، نئے پھول تلاش کیے
 اور نئے پرندے پرواز کرتے دیکھے۔

آج وہ جس جگہ رُکے تھے، یہ بھی بہت حسین جگہ
 تھی۔ شام ڈھلنے لگی تو جارج نے لکڑیاں جمع کر کے آگ
 جلائی۔ ”اب میں تم دونوں کو قدیم عہد کے انسان کی طرح
 چائے بنا کر پلاتا ہوں۔“

اس نے چائے بنائی۔ ننھا جونی بہت دلچسپی سے سب
 کچھ دیکھتا رہا۔ پھر وہ مزید سپیاں چنے کے لیے ساحل کی
 طرف چلا گیا۔

جارج نے مارتھا کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی پھر انجن
 میں جا گھسا اور کچھ ہی دیر میں ایک بڑا سا نقشہ نکال لایا۔
 زمین پر نقشہ بچھا کر وہ اس پر جھک گیا۔ یہ پورے
 امریکا کا جہازی ساز کا نقشہ تھا جس میں شہر، گاؤں، دریا،
 ندیاں اور پہاڑ ہر چیز کی تفصیل درج تھی، ریل کی ان
 پٹریوں کی بھی جو ایک شہر سے دوسرا شہر ملاتی تھیں اور جن
 پر وہ گزشتہ ۵، ۴، ۳ ہفتوں سے جو سفر تھے۔

بہت دیر تک نقشے پر غور کرنے کے بعد جارج نے سر
 اٹھایا۔ ”مارتھا..... اگلے ماہ ہم سیکرامونٹو کی طرف چلیں گے۔
 پھر ممی آجائے گا اور ہم سیائل کے علاقے میں داخل ہو
 جائیں گے۔ جولائی تک پورے علاقے کی سیر کرنے کے

ترقی کا راز

اشفاق احمد لکھتے ہیں:

”روم (اٹلی) میں میرا ٹریفک چالان ہوا۔ مصروفیت کی وجہ سے چالان تیس وقت پر ادا نہ کر سکا تو مجبوراً کورٹ جانا پڑا۔ جج کے سامنے پیش ہوا تو اُس نے وجہ پوچھی۔ میں نے کہا کہ ٹیچر ہوں، اس لیے کچھ دن سے مصروف تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا، جج نے کہا ”A Teacher is in the Court“ اور سب لوگ کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ جج صاحب بھی کھڑے ہو گئے اور مجھ سے معافی مانگ کر چالان کینسل کر دیا۔ میں اپنی غلطی پر بہت شرمسار ہوا مگر اُس روز میں نے قوم کی ترقی کا راز جان لیا۔“

(صائمہ وہاب، لاہور)

پہلے کی طرح دنیا میں بسنے والے لوگ واپس آجائیں۔ ساری بے وقوفی، سارا شور، ساری نفرت، ساری ہولناک چیزیں، سارے ڈراؤنے خواب سارے عیار لوگ، ساری گڑبڑ، ساری امیدیں، ضرورتیں، محبتیں واپس آجائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو، ہے نا؟“ مارٹھا نے لمحے بھر سوچا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی وقت ایک ہلکی سی آہٹ نے اُنھیں چونکا دیا۔ ننھا جو نبی ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ نہ جانے کس وقت دبے پاؤں آیا اور نہ جانے کب سے اُنھیں دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ اس نے اپنے باپ کو غور سے دیکھا پھر اپنا ننھا ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرا، آنسوؤں کی نبی اب تک چمک رہی تھی۔ ”پاپا!“ اس نے سادگی سے کہا۔ ”آپ بھی رو رہے ہیں؟ میری طرح آپ کے ساتھ بھی کھینے والا نہیں رہنا۔“

مارٹھا اور جارج، دنیا کے سب سے تنہا لوگ، دم بخود بیٹھے رہ گئے۔

ابد ہم واشگفتن پہنچ جائیں گے۔ وہاں گرمی کا موسم اچھا ہوتا ہے۔ موسم ذرا اور بہتر ہوگا تو ہم یلا اسٹون کے علاقے کی طرف نکل جائیں گے، مچھلیوں کا شکار کریں گے۔“

مارٹھا خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

جارج نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”سردی ہمیں یکم سن کے علاقے میں گزارنی چاہیے اور یہاں سے ہوتے ہوئے ہم فلوریڈا میں داخل ہو جائیں گے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے ہم بہار کا موسم گزاریں گے اور میرا خیال ہے، اگلے سال کی گرمی ہم شکاگو میں گزار سکتے ہیں اور ۲ سال بعد کی سردی..... کیا خیال ہے، میکسیکو میں نہ گزاریں؟ جہاں جہاں یہ پٹری ہمیں لے جائے، جس طرف بھی لے جائے، ہم چلتے چلے جائیں گے۔ ابھی تو نہ جانے کتنے علاقے ہیں، ہزاروں، لاکھوں شہر ہیں جنہیں ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے اور شاید پھر کسی سال ہم دریائے مسیسی میں کشتی رانی کر سکیں۔ نہ

جانے کب سے میری آرزو ہے کہ میں اس شاندار دریا میں کشتی چلاؤں۔ زندگی کی سب خواہشیں پوری کرنے کو دل چاہتا ہے اور اب تو پوری زندگی سامنے پڑی ہے کہ.....“ بولتے بولتے اس کی آواز دھیمی پڑنے لگی پھر وہ چپ ہو گیا۔ وہ نقشہ سمیٹ کر واپس رکھنا چاہتا تھا کہ اچانک نقشے کے تحت کاغذ پر کوئی چیز گرے۔

مارٹھا نے چونک کر دیکھا۔ نقشے برقی کے آثار تھے۔ یہ ۲۲ آنسو تھے جو اس کے شوہر کی آنکھوں سے نکلے اور گالوں پر لکیریں بناتے ہوئے نیچے نقشے پر جا گرے تھے۔ مارٹھا نے جارج کا ہاتھ تھام لیا۔

جارج نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر رکھی تھیں۔ اس کے چہرے پر ردھک کے آثار تھے۔ اس نے پوری قوت سے مارٹھا کا ہاتھ کھینچ لیا۔

”مارٹھا.....“ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے آہستہ سے کہا ”میں ایک عجیب بات سوچ رہا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں..... کتنا اچھا ہو، اگر ہم آج رات جب سو جائیں تو رات کو کسی وقت، کسی طرح پھر سب کچھ واپس آجائے،

چلی سے ایک ہسپانوی داستان

دام دام

ایک ڈاکو اور دہشت گرد کی کہانی
اُس کے ستارے ایک عورت کے قبضے میں تھے
اور اُسے یہ حقیقت ماننے میں بہت وقت لگا

از اربیل آئندے
ترجمہ: سید کاشف رضا

لیے ضروری تھا کہ وہ عورتوں سے پرہیز کرے۔ دنیا کی یہ
سب سے لطیف اور زندہ نعمت اس پر حرام تھی، جیسے
پروانے کے لیے شیخ اور بھونزے کے لیے پھول ممنوع ہو۔
یہ گویا اس کی پیدائشی محرومی تھی کیونکہ جس دن وہ پیدا ہوا

ایک تندرست اور معقول شکل و صورت
کا آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر دو
آنکھیں بھی تھیں اور سینے میں ایک دل
بھی دھڑکتا تھا مگر بد قسمتی سے اس کے

نچ کی ۳ سالہ ازدواجی زندگی میں اس کی بیوی کا سلا ۳ مرتبہ امید سے ہوئی۔ وہ ایک نرم و نازک عورت تھی مگر زچگی کے جان لیوا مراحل سے زندہ بچ گئی۔

بڈاگو اور کاسلا میں قابل رشک رینگلت اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی اور اس بات نے بڈاگو کے مزاج پر مثبت اثر ڈالا تھا۔ اس کی سنگ دلی نری میں بدل گئی تھی اور لوگوں میں یہ مشہور ہوتا جا رہا تھا کہ نچ بڈاگو پہلے فولا تھا، اب موم ہو گیا ہے اور یہ قلب ماہیت اس کی بیوی کا سلا کی وجہ سے ہوئی ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ نچ بڈاگو مختلف مقدمات کے فیصلوں کے متعلق بھی اپنی بیوی سے مشورے کرنے لگا ہے۔

بہر حال نچ بڈاگو کی یہ مبینہ نری نکولس ووال کے لیے کسی خوشی اور خوش فہمی کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے معاملے میں نچ بڈاگو بدستور سخت اور اٹل تھا، اس لیئرے کے لیے اس کے دل میں رعایت کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ نچ کے لیے یہ بات خفت کا باعث تھی کہ اسی کے گاؤں کا ایک شخص گاؤں گاؤں ڈاکے ڈال رہا ہے اور قانون کی گرفت میں نہیں آ رہا۔ ووال نچ کی بدنامی کا باعث تھا۔

ووال ۳۰ برس پہلے جوانا ترستی نام کی ایک عورت کے گھر پیدا ہوا تھا، اس کا باپ نامعلوم تھا۔ ماں نے بھی اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ ہاں، ایک بار شاید بے خیالی میں، وہ اسے یہ ضرور بتا بیٹھی کہ اس کی پیدائش میں ماں کی کوئی خواہش یا پسند شامل نہیں تھی بلکہ حمل کے دوران وہ چاہتی تھی کہ اولاد پیدا نہ ہو۔ اس نے اسقاط کی غرض سے کئی دوائیں کھائیں، کئی ترکیبیں استعمال کیں لیکن ووال کو دنیا میں آنے سے نہ روک سکی۔ ووال آدھکا۔ پیدائش کے بعد بھی وہ بہت سخت جان ثابت ہوا اور ہر قسم کی تکلیفیں بے پروائی سے جھیلتا چلا گیا۔ پیار اور چھاؤں سے محروم ایک لڑکے کا بگڑ جانا حیرت کی بات نہیں۔ بے گھری کے عالم میں اس بد نصیب کو عورت کی محبت بھی نہیں ملی اور اس محرومی کا ذمہ دار وہ تھا کیونکہ اس

تھا، گاؤں کی کاہنہ نے اسی دن یہ پیشین گوئی کر دی تھی کہ اس بچے کی موت ایک عورت کے باعث واقع ہوگی۔ اس کا نام نکولس ووال تھا۔ ووال نے ہوش سنبھالا اور کچھ سوچہ بوجھ پیدا ہوئی تو یہ پیشین گوئی اس نے سنی۔ وہ خفت ہراساں ہوا اور سواہن روح میں مبتلا ہو گیا۔

گاؤں سے کوسوں دور ایک قصبے میں ملک کی مشہور کاہنہ رہتی تھی۔ ووال کسی نہ کسی طرح لہسا سفر کر کے اپنا مستقبل معلوم کرنے کے لیے اس کاہنہ کے پاس پہنچا۔ کاہنہ نے ووال کی ہتھیلی کا غور سے جائزہ لیا اور صاف گوئی سے اس امر کی تصدیق کر دی ”تمھاری موت ایک عورت کے باعث واقع ہوگی۔“

ووال نے خود کو تقدیر کے سامنے بے بس مان کے اپنی آمتیں اور خواہشیں بالائے طاق رکھ دیں اور عورت ذات سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کر لیا۔ وہ اس معاملے میں نہایت محتاط رہا۔ شروع میں اسے کچھ دشواری ضروری ہوئی لیکن رفتہ رفتہ اس کا دل پتھر ہو گیا، اسے رفاقت اور محبت کی ضرورت ہی نہ رہی۔

اس چیز نے اسے ایک عام آدمی کی طرح معمول کی زندگی گزارنے کے قابل نہیں چھوڑا، اس نے مجرمانہ روش اختیار کر لی اور ایک لٹیرا بن گیا۔ وہ لوٹ مار کرنے اور ڈاکے ڈالنے لگا۔

اسی قصبے میں بڈاگونامی ایک معزز آدمی بھی رہتا تھا۔ وہ نچ تھا اور عدالتی اختیارات کے ساتھ ساتھ اُسے قصبے کے انتظامی اختیارات بھی حاصل تھے۔ نچ بڈاگو کی شادی جوانی کی بہار گزر جانے کے بعد ہوئی تھی مگر بیوی اسے اچھی ملی، حسین و جمیل، نوخیز اور ذہین، اس کا نام کاسلا تھا۔ نہ صرف قصبے، بلکہ ارد گرد کے علاقوں میں بھی نچ بڈاگو کی انصاف پسندی اور سخت مزاجی کی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مرغی کی چوری جیسی معمولی غلطی کو بھی قتل جیسی سنگین واردات سمجھتا تھا۔ اپنے سیاہ لباس کی وجہ سے وہ لوگوں کو موت کا فرشتہ معلوم ہوتا، کبھی اس سے خوف کھاتے تھے۔ وہ جوتے بھی کالے پہنتا تھا۔

ودال کی گرفتاری کا کوئی اور طریقہ نہیں بچا تھا۔

ودال کو ماں سے بچھڑے ہوئے ایک طویل مدت ہو گئی تھی اور اسے ماں سے کوئی خاص محبت بھی نہیں تھی لیکن اب محبت سے زیادہ اس کی عزت اور شان کا سوال تھا۔

اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ ان کا سردار جج کی یہ مذموم حرکت برداشت نہیں کرے گا، انہوں نے متوقع مقابلے کے لیے اپنے ہتھیار تیز کرنے شروع کر دیے لیکن ووال نے غصے کے بجائے محل کا مظاہرہ کیا اور یہ اعلان کر کے انہیں حیرت زدہ کر دیا کہ ہم کوئی جواب کارروائی نہیں کریں گے۔

وقت گزر رہا تھا۔ ووال کے گروہ میں بے چینی بڑھتی گئی لیکن ووال خود ہر رات سکون کی نیند سوتا۔ اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ ووال کوئی بہترین منصوبہ سوچ رہا ہے۔ انہیں یہ خیال بھی آیا کہ سخت جانی کے باوجود ممکن ہے، ووال ڈر گیا ہو لیکن یہ امکان انہوں نے خود رد کر دیا کیونکہ ووال کی مرتبہ حیرت انگیز جرأت کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ ایک مناسب موقع پر گروہ والوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”سردار! کیا حکم ہے؟“

”کچھ نہیں“ ووال نے اطمینان سے جواب دیا۔
”انھوں نے تمھاری ماں کو قید کر دیا ہے۔“
”کر دینے دو، دیکھنا یہ ہے کہ حوصلہ کس میں زیادہ ہے، جج میں یا مجھ میں۔“

۳ روز کی قید کے بعد جونا میں اتنی سخت نہ رہی کہ وہ رورو کر روٹی مانگ سکے۔ اس کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ ہونٹوں پر بیڑیاں جم گئی تھیں اور زبان چھڑے کی ہو گئی تھی۔ بچھرے کے باہر ۳۴ مسلح سپاہی پہرا دے رہے تھے تاکہ قصبے کے لوگ جونا کو روٹی پانی نہ دے سکیں۔

قصبے میں بے چینی بڑھ گئی اور جج کے خلاف مظاہرے ہونے لگے، سرکاری ملازموں نے بھی اس ظلم کے خلاف ہڑتال کر دی لیکن جج ٹس سے مس نہ ہوا۔ قصبے کے سب سے بڑے پادری نے اسے حضرت مسیح کا واسطہ بھی دیا مگر جج نے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اُسے یقین تھا کہ

کے سر پر کاہنہ کی منحوس پیشین گوئی سوار تھی۔ وہ جانتے بوجھتے کسی عورت کے، یعنی اپنی موت کے قریب کیسے پہنکتا۔ ۱۰ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ووال اپنی عمر سے بڑے لڑکوں کو پینے لگا تھا۔ آئے دن کی مار دھاڑ کی وجہ سے اس کے چہرے پر چاقو کے نشان بھی پڑ گئے تھے۔ ۲۰ سال کی عمر میں اس نے مغرور اور پوشیدہ زندگی شروع کر دی اور اپنے جیسے مایوس نوجوانوں کا باقاعدہ ایک گروہ بنالیا۔ بس پھر کیا تھا، جگہ جگہ مختلف وارداتیں ہونے لگیں۔ بدنامی بڑھی تو قصبے میں ہونے والا ہجرم اسی کے کھاتے میں ڈالا جانے لگا۔ اس سے وہ واقعات بھی منسوب کر دیے گئے جو اس نے نہیں کیے تھے۔ ہر طرف اس کے نام کی دہشت بیٹھ گئی۔ ارد گرد کے زمیندار اُسے اپنی حویلیوں سے دُور رکھنے کے لیے نذرانے اور بھتے بھجوانے لگے۔

جج ہڈاگو برابر اس کی تاک میں رہا۔ اسے پکڑنے کا ہر طریقہ استعمال کیا اور قصبے بھر کے سرکاری اہل کار اس کام پر لگا دیے مگر ووال بھی کسی چھلاوے سے کم نہ تھا۔ جج صاحب کو مایوسی اور جھلاہٹ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تھک ہار کے ہڈاگو نے مرکزی حکومت سے درخواست کی کہ ووال اور اس کے گروہ کی گرفتاری کے لیے فوجی دستہ روانہ کیا جائے۔ آخر فوجی دستہ آیا، متعدد چھاپے مارے گئے، مستقل ناکا بندی کی گئی لیکن ناکامی ہی ہوئی۔

تھک آ کے جج نے ووال کو پھانسنے کے لیے ایک اور پھندا تیار کیا۔ اس نے ووال کی بوڑھی ماں جونا کو پکڑوا کے ایک بڑے سے بچھرے میں بند کیا اور بچھرا اپنے دفتر کے سامنے عام شاہراہ پر رکھوا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ووال، ماں کی تکلیف اور بے حرمتی پر تملکا کے خود کچے دھاگے سے بندھا چلا آئے گا۔ جج کی ہدایت کے مطابق بچھرے میں قید بڑھیا بھوک پیاسی رکھی گئی، اسے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا۔

جج کو معلوم تھا کہ اس اقدام سے وہ انصاف کے نام پر خود ایک سنگین جرم کر رہا ہے لیکن اس کی دانست میں

ودال کی قوت برداشت آخر ختم ہو جائے گی اور جلد ہی وہ اپنی ماں کو بچانے آجائے گا اور پکڑ لیا جائے گا۔

قصبے کے مظاہرین نے جج سے مایوس ہو کے اس کی بیوی کا سلا سے ملاقات کی۔ جج ۳ روز سے گھر نہیں آیا تھا، وہ اپنے دفتر میں اپنا فرض ادا کر رہا تھا اور ودال کا منتظر تھا۔ کا سلا ان ۳ دنوں میں گھر سے باہر نہیں نکلی تھی، پھر بھی اسے سب کچھ معلوم تھا۔

مظاہرین کی درخواست سن کر کا سلا نے اپنے بچوں کو اچھے کپڑے پہنائے اور ان کے ساتھ قیدی عورت کے پاس روانہ ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھلوں کی ٹوکری تھی اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا جگ۔ پہرے داروں نے اسے دیکھا تو سمجھ گئے کہ وہ کس مقصد سے آئی ہے لیکن جج نے انہیں سختی سے حکم دیا تھا کہ کسی کو پنجرے کے قریب نہ پھٹنے دیا جائے۔ انہوں نے کا سلا کو روکنے کی کوشش کی تو کا سلا نے اصرار کیا، اس کے بچے بھی رو رو کر اس کا ساتھ دینے لگے۔

جج بدستور دفتر میں بیٹھا تھا۔ اگر اسے ودال کے گھوڑوں کی ٹائپ سننے کا اشتیاق نہ ہوتا تو وہ اپنے کانوں میں موم بھر لیتا۔ ۳ روز سے وہ جوانا کی چیخیں، آہیں، مظاہرین کے نعرے اور بدعنائیں سن رہا تھا اور بے فکر تھا لیکن جب اس نے اپنے بچوں کا رونا سنا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ دفتر سے باہر نکلا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں جھانکا۔ کا سلا کی خاموشی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے اتنی شدت سے بھی اپنے شوہر کو نہیں گھورا تھا اور وہ بھی پورے قصبے کے سامنے۔ ہڈاگو نے مغلوب ہو کر بیوی سے پھلوں کی ٹوکری اور پانی کا جگ لے لیا اور پنجرے کا دروازہ کھول کر یہ ممنوعہ چیزیں خود جوانا تک پہنچا دیں، اس کے بعد جوانا رہا کر دی گئی۔

ودال کو یہ خبر ملی تو وہ جھوم اٹھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا ”دیکھا، میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جج ہار جائے گا، اس میں اتنا حوصلہ نہیں، جتنا مجھ میں ہے۔“

لیکن دوسرے ہی روز اس کی خوشی کافور ہو گئی۔ اسے بتایا گیا کہ اس کی بوڑھی ماں نے اپنے گھر میں پکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی ہے۔ ماں سے یہ ذلت اور یہ بے توجہی برداشت نہیں ہو سکتی کہ اس کے اکلوتے بیٹے نے اسے پنجرے میں بھوکا پیاسا بندر بنے دیا جب کہ پورا قصبہ اس کی حمایت میں چیخ پکار کر رہا تھا۔ ودال، ماں کی خودکشی کی خبر سن کر غصے سے سرخ ہو گیا اور غضب ناک لہجے میں بولا ”جج کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔“

وہ جج سے انتقام لینے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ جج کو قید کر کے اسی پنجرے میں بند کر دے گا جس میں اس کی ماں بند کی گئی تھی۔ ایک دن اسے اچانک معلوم ہوا کہ جج چھٹیاں منانے اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ ساحل کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔

جج ہڈاگو، ساحلی قصبے کی طرف جا رہا تھا، ایک سرائے میں مخبروں نے اطلاع دی کہ ودال اس سے انتقام لینے کے لیے چل پڑا ہے۔ سرائے میں جج کے ساتھ اتنے سپاہی نہیں تھے جو ودال کے گروہ کا مقابلہ کر سکتے البتہ جج کی کار بہت تیز رفتار تھی، وہ ودال کی آمد سے قبل اگلے قصبے تک پہنچ سکتی تھی اور شاید ایسا ہو بھی جاتا لیکن افسوس، جج کے دن پورے ہو چکے تھے۔ جج اپنے فرائض منصبی کی وجہ سے شب و روز جاگتا رہا تھا، قصبے کے مظاہرین کی آہ و زاری، سرکاری ملازموں کی ہڑتال اور جوانا کی خودکشی سے اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ ڈرائیونگ کے دوران اس کی حرکت قلب بند ہو گئی اور وہ راستے ہی میں چل بسا۔

کار تھوڑی دُور جا کر سڑک سے نیچے اتری اور ایک گڑھے میں پھنس گئی۔ جج کی بیوی کا سلا حواس باختہ ہوئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر جلد ہی اسے صورت حال کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا شوہر اس سے کافی بڑا تھا اور کا سلا کو خدشہ تھا کہ وہ کہیں جلد بیوہ نہ ہو جائے لیکن اسے گمان بھی نہ تھا کہ یہ سانحہ اس طرح اچانک پیش آجائے گا۔

نظامو

ایک نور چشم کا ماحبرا
وہ عزت سے جینا چاہتا تھا
اور اس کے اپنے اسے
جینے نہ دیتے تھے



تحریر: علی بیلا
ترجمہ: فاکر عبدالحق خاں حسرت کاسٹوئی

مہر

کاسلا کی مترنم آواز نے اسے چونکایا۔ ”ودال! تمہارا دشمن مر چکا ہے، میں اس کی بیوہ ہوں۔“ اس نے کچھ توقف سے کہا ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہاری ماں کو بچانے کی کوشش کیوں کی تھی؟“

”کیوں کی تھی؟“ ودال نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ کاسلا بے خوفی سے ودال کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ دشمن کی بیوی سے یہ الفاظ سن کر ودال کے اندر کی دنیا زیر و زبر ہوئی۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ کسی عورت نے اس سے اعظماء محبت کیا تھا لیکن ودال کو فوراً کاہنہ کی پیشین گوئی یاد آگئی۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

کاسلا نے ودال کی آنکھوں میں شک کے سائے دیکھے۔ اس نے فیصلہ کیا وہ اپنے بچوں کی حفاظت اور ودال کو گرفتار کروانے کے لیے آج تمام حدیں عبور کر جائے گی۔ ایک دم آگے بڑھ کے اس نے ودال کا گریبان پکڑ لیا۔ ”ودال! میں تمہیں چاہتی ہوں۔ دیکھو، میرا بڑھا شوہر مردہ پڑا ہے۔ میں اس کی لاش کے سامنے تم سے محبت کا اقرار کر رہی ہوں۔ ودال! ودال! میرا اعتبار کرو۔“ وہ ایک پری چہرہ، حسین و جمیل عورت تھی۔

آخر ودال نے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے گلے لگا لیے۔ اتنے میں کاسلا کو گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ کمک پہنچ گئی تھی۔ کاسلا نے لمحے بھر کے لیے اپنے متنی شوہر سے ودال کا موازنہ کیا۔ اسے دل میں ودال کے لیے رحم کی ایک لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”ودال! ودال! وہ لوگ آگئے۔ جاؤ، تم چلے جاؤ۔“ مگر اب جانے کا وقت نہیں تھا۔

ودال نے چہرہ اوپر اٹھایا، اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو۔ اس نے کہا ”کاسلا! آہ..... وہ عورت تم ہو جو میری موت کا باعث.....“

ہرمنٹ بعد سرکاری دستے ودال کی لاش اٹھا رہے تھے۔ کاسلا نے دیکھا کہ ودال کی آنکھوں میں اب بھی آنسو موجود ہیں۔

ودال کے گھوڑے مسلسل تعاقب میں تھے اور کار بیکار ہو چکی تھی۔ کاسلا بے حد فکر مند تھی۔ اپنے بچوں کو ودال کے قہر و غضب سے بچانا تھا۔ جج نے سرائے سے روانگی سے قبل ملک کے لیے پیغام بھجوادیا تھا لیکن اب مدد کے انتظار کا وقت نہیں بچا تھا۔ کاسلا نے عزم کر لیا کہ جیسے بھی ممکن ہو، اسے اپنے بچے محفوظ رکھنے ہیں۔

اس نے کار سے اتر کر ۲ بچوں کو سینے میں بھر لیا اور ایک بچہ پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔ کاسلا نے تینوں بچوں کو قریبی پہاڑی کی ایک کھدک میں چھپا دیا۔ اس نے ارد گرد دیکھا کہ کوئی جانور تو نہیں ہے۔ کاسلا نے بچوں کو پیار کیا۔ اسے کتوں سے زیادہ خطرہ ودال کے آنے کا تھا۔ کاسلا نے بچوں سے کہا۔ ”کچھ دیر میں مدد آتی ہوگی۔ اس وقت تک چاہے کچھ ہو جائے، غار سے باہر مت آنا، چاہے تمہیں میری چیخیں سنائی دیں تب بھی مت آنا، سمجھ گئے؟“

کاسلا پہاڑ سے اتر آئی اور کار کی بھپلی نشست پر بیٹھ کر ودال کا یا ملک کا انتظار کرنے لگی۔

زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا، جلد ہی دور سے دھول اڑتی دکھائی دی، ساتھ ہی بہت سے گھوڑوں کی ٹاپیں بھی گونجیں۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

ودال کے مسلح سواروں نے گاڑی گھیر لی۔ کاسلا نے چہرے پر زخموں کے نشانات سے ودال کو پہچان لیا۔

ودال نے گاڑی کے قریب پہنچ کے اپنے سواروں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ سوار چلے گئے۔ ودال اکیلا کاسلا کے پاس رہ گیا۔ کاسلا جانتی تھی کہ اب موت سے زیادہ شدید صدمے کا سامنا ہے۔

ودال، جج ہڈانگو پر نظر پڑتے ہی سمجھ گیا کہ وہ انتقام کی دسترس سے بہت دور جا چکا ہے۔ اب اس کے سامنے دشمن کی جوان بیوی موجود تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور کاسلا کی نزاکت سے انداز لگا لیا کہ اسے پستول ہاتھ میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے پستول گھوڑے کی زین سے لگے ہوئے تھیلے میں ڈال دیا۔ معاً

کوشش کے باوجود بھی تیز نہیں چل سکتا تھا۔ اس کی بانیں ٹانگ میں لٹک تھیں۔ بچپن سے ہی کوٹھے کی بڑی ایک طرف کوٹھی ہوئی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھا تو چاند گرہن سے متاثر ہوا تھا۔ بہر حال اس کی ایک ٹانگ میں نمایاں فرق تھا۔ وہ جب چلتا تھا تو یہ فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا تھا۔ اس کی حالت بھی کچھ عجیب عجیب سی تھی۔ تھکا تھکا، اداس اداس، مریضوں کی طرح۔ اسے دیکھتے ہی ترس آنے لگتا تھا۔ وہ ہمارے گڈز آفس میں سلیز میں تھا۔ مصوم چہرہ، بونا سادہ، نحیف ولاغر جسم۔ دور سے دیکھنے پر وہ ۱۵، ۱۶ سال کا لڑکا ہی معلوم ہوتا تھا۔ سارا دن کام میں گھٹا رہتا تھا۔ وہ کابلوں کی طرح کبھی نہیں بیٹھا لیکن نہ جانے کیوں سارا دن اسے جھڑکیاں ملتی تھیں۔

”ارے او نظامو کے بچے! جالیک سیر برف تو لے آ۔“
”ارے وہ یلزمین کہاں مر گیا! اس سے کہو جا کر دو لفافے لے آئے۔“

”ارے نظامو دوڑ کر یہ تار دے آ اور واپسی پر گھر سے کپڑے لا کر دھو بی کو دے دینا۔ جا جلدی جا! کیا ریگ ریگ کر چوٹی کی چال چلتا ہے۔ اتفاق سے ہمارے دفتر میں کوئی چپرائی تھا یہ نہیں اس لیے سارے اوپر کے کام بھی نظامو کو ہی کرنا پڑتے تھے۔ ایک کام ختم نہیں ہونے پاتا تھا کہ دوسرا کام تیار ہوتا تھا۔ اے لو..... کہاں مر گیا تھا تو، جابیموسی ٹی او کو اور یہ ڈیبوایف او کو دے کر آ۔ واپسی پر گھر سے میرا کھانا لیتے آتا۔ ابے او..... میری بات سن بھی رہا ہے اور یہ تو ایک انگ کر چٹا کیسے ہے۔ جا جلدی کر ایک بیو دینے میں ہی سارا دن لگا دیتا ہے۔“

موسلا دھار بارش ہو رہی ہو یا آسمان سے آگ برس رہی ہو، آندھی ہو یا طوفان، نظامو کے فرائض اور جھڑکیوں میں کبھی کی نہیں آتی تھی۔ وہ سارا دن پسینے میں شرابور لنگڑا لنگڑا کر چلتا رہتا، کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا۔ یہاں

تک کہ رات کے ۱۰/۱۱ بجے آتے۔ میں نے کئی دفعہ اسے اپنا میلا سا تولیہ دیا تا کہ وہ جب دھوپ میں باہر جائے تو سر پر ڈال لے۔ کبھی کبھی وہ تولیہ اپنے پیٹ سے باندھ لیتا تھا۔ کہتا تھا پیٹ میں سخت تکلیف محسوس کرتا ہوں کبھی کبھی تو وہ اپنے پیٹ کی تکلیف سے رونے لگتا تھا۔ نہ جانے کیا بیماری لگی تھی، دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

مجھ سے اس کی دوستی تھی۔ جب بھی اسے کوئی بات پوچھنی ہوتی تو وہ مجھ سے پوچھتا تھا۔ گھر سے خط آتا تو مجھ سے ہی پڑھواتا۔ دفتر کے معاملات میں بھی وہ مجھ سے مشورہ لیتا اور جب کوئی مسئلہ یا بات اس کی سمجھ سے باہر ہوتی تو وہ مجھے اپنا رازدار سمجھ کر پوچھتا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ ”بابو جی! یہ لوگ آوروں نام کیوں نہیں دیتے، صبح ۸ بجے آتا ہوں اور رات کو ۱۱ بجے تک کام کرتا ہوں۔“ میں کیا جواب دیتا، میں بھی ملازم ہی تھا۔ کبھی کبھی کہتا ”بابو جی! یہ بڑا صاحب نہایت حقارت سے ناک سیکڑ کر کٹ آؤٹ کر دوں گا، کٹ آؤٹ کر دوں گا، کیا کہتا ہے؟“ کبھی کبھی تو اس کے مسلسل سوالوں پر مجھے ہنسی بھی آجاتی تھی اور بعض اوقات اس کے سوالات اتنے عجیبے، کمزورے، کیلے اور طنز سے بھر پور ہوتے تھے کہ میں ان کا کوئی جواب نہیں دے پاتا تھا۔

ایک دن وہ مجھے غیر معمولی طور پر زیادہ خوش نظر آیا۔ وہ شاید تنخواہ کا دن تھا۔ نہ جانے کس نے اس کی کھوپڑی میں یہ بات دھنسا دی تھی کہ تنخواہ بڑھ رہی ہے۔ تنخواہ بڑھنے کے تصور سے ہی اس کے چہرے پر خوشی چھلک رہی تھی۔ کہنے لگا ”بھائی، آج تو فلم دیکھیں گے! سنا ہے کبھی ڈرائیور اچھی فلم ہے۔“

اور کچھ دیر کے بعد جب وہ تنخواہ لے کر آیا تو اس کا چہرہ لڑکا ہوا تھا۔ ہاتھ بے جان سے تھے۔ چہرے پر اداسی تھی۔ ”تنخواہ بڑھنا تو الگ رہا لے میرے ۲۰ روپے کاٹ لیے۔ میری تو حاضریاں بھی پوری تھیں۔“ میں نے اسے بتایا کہ ۲ ماہ سے جو واشنگٹن الاؤنس مل رہا تھا، وہ کاٹ لیا ہے۔ لیکن اس بے چارے کو اس کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا۔

دفتر میں سب کا خیال تھا کہ نظامو کوئی بی ہوگئی ہے۔ جوں ہی یہ بات پھیلی اسے دفتر کے منگے سے پانی پینے سے منع کر دیا گیا۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسے ٹی بی یا اس قسم کا کوئی اور مرض نہیں تھا۔ میں ہی کیا سب کو معلوم تھا کہ اسے کون سی بیماری ہے اور اس بیماری کا کیا علاج ممکن ہے۔ لیکن ہم میں سے کسی کو اس بات پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ ہم لوگ اسے یہ مشورہ تو دیتے تھے کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کراؤ ورنہ مر جاؤ گے اور یہ حقیقت ہے کہ میں نے جب بھی اس کے پیٹ پر تولیہ دیکھا تو مجھے بھی اس سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں یہ مجھ سے پیسے نہ مانگے۔ وہ میرے علاوہ کسی اور سے اس درجہ فرجی نہیں تھا۔ ”بابو جی! آج تو بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ ۲ روپے دے دو تنخواہ کے دن واپس کر دوں گا۔“ وہ اس طرح مصعومیت کے ساتھ کہتا کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ وہ تنخواہ کے دن یہ پیسے واپس نہیں کرتا تھا۔ وہ پیسے پابندی کے ساتھ واپس کر دیتا تھا لیکن بات یہ تھی کہ میرا حال بھی کچھ زیادہ ہی پتلا تھا۔

ایک دن ہمارے دفتر کا سارا عملہ جمعہ کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ ہم دونوں ہی رہ گئے۔ کوئی کام بھی نہیں تھا اس لیے صبح سے دفتر کی میز پر ٹانگیں پھیلا کر سگریٹ کے کش لینے لگا اور ساتھ ساتھ اخبار بھی پڑھنے لگا۔ نظامو بلیوں والی کاپیوں پر اداس بیٹھا تھا اور ٹھنڈی سانس لے رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے کسی نے مارا ہے۔ کوئی نئی دن ہوگا جب اس کی ایسی حالت نہ ہوئی ہو۔ میں نے بھی اس کے چہرے پر سکون نہیں دیکھا۔ وہ بڑے کرب کے ساتھ بولا۔

”بابو جی! اب اس نوکری سے جی کھنا ہو گیا ہے۔ آج پھر بڑے صاحب نے چارج شیٹ دی ہے۔ میں بھلا کوئی پڑھا لکھا ہوں جو یہ روز روز چارج شیٹ کا جواب لکھتا رہوں۔“ ”آج کس بات پر چارج شیٹ ملی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ بڑے اداس لہجے میں کہنے لگا ”انھوں نے مجھے روٹی

کے بوروں پر سوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ دیکھو بھائی! میں بھی آخر انسان ہوں۔ صبح ۸ بجے کام پر آتا ہوں، رات کے ۱۰، ۱۱ بجے جاتے ہیں..... آخر یہ لوگ مجھے چین سے کیوں نہیں بیٹھتے دیتے؟“

”جس دن چھٹی ہوتی ہے اس دن بھی مجھے آنا پڑتا ہے ذرا سی دیر ہو جائے تو ہزاروں باتیں سناتے ہیں اور یہ چارج شیٹ تھا دیتے ہیں۔ میں ان روز روز کی باتوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے نوکری چھوڑ دوں۔“ ”پھر کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ بے حد اداس تھا اور میں ہی اس کے گھر کے خط پڑھ کر سنا تھا تھا لہذا میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ”پنگل! ایسا خیال بھی دل میں مت لانا۔ آج کل نوکری مشکل سے ملتی ہے اور پھر تم اکیلے تو ہو نہیں۔ مے افراد اور بھی کھانے والے ہیں۔ ان کے ہی بارے میں سوچو۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو اٹھ آئے۔ ”پھر یہ لوگ مجھے چین سے کیوں نہیں بیٹھتے دیتے؟ جینے کیوں نہیں دیتے؟.....“ وہ رونے لگا اور روتے روتے اپنا سر سامنے میز پر رکھ دیا اور منہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ اس کے رونے اور جھکیوں میں عجیب کیفیت تھی۔ عجیب درد تھا۔ میری آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن میں کسی کام سے حیدر آباد چلا گیا۔ ۳ راتوں کے بعد جب واپس آیا تو دفتر میں دیکھا کوئی اور لڑکا کام کاج میں مصروف ہے۔ اس بات کا مجھے بعد میں علم ہوا کہ نظامو نے سیل لگانے کے لیے کسی بیوپاری سے پیسے مانگے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اس کی کئی شکایتیں تھیں۔ اسے نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔



اللہ کے بھید وہی جانے

نویدا سلا صدیقی

ایک ہسپتال کا ماحبرا

۱۳/۲۰۰۰ میں چھپے راز کو ایک ڈاکٹر نے ماننے سے انکار کر دیا تھا وہ نہیں جانتا تھا ناممکن انسانوں کے لیے ہوتا ہے، انسانوں کے خالق کے لیے نہیں

خاص طور پر روزانہ آپ نے مانگی ہے کہ اللہ مجھے بنادے۔ یورپ جاکر ہسپتال میں لیڈی ڈاکٹر سے چیک کرایا تو اُس نے بتایا کہ ۲۴ ماہ بعد آپ کو اللہ اولاد کا تحفہ دے گا اُس وقت تک آپ نے باقاعدگی سے ہر ماہ یہاں آکر معاینہ کرانا ہے۔ میں بیٹی کے کہنے کے مطابق ہر نماز کے بعد نواسے کے لیے دعا کرتا رہا۔ مجھے گھر والوں نے بتایا ہی نہیں کہ ہسپتال والوں نے الٹرا ساؤنڈ کر کے بیٹی زرینہ کے کارڈ پر لکھ دیا 'لڑکی' گھر والوں نے مجھ سے یہ بات بالکل چھپائے رکھی اور میری دعاؤں کا سلسلہ چلتا رہا۔ گھر والوں نے لڑکی کے پانچ چھ جوڑے سی کر کسی کے ہاتھ دتی بھیج دیے لیکن مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ گھر والوں نے داماد اور بیٹی کو بھی منع کر دیا کہ مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کرنی۔ سب اہل خانہ کا خیال تھا کہ اگر مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو میں بلاوجہ پریشان ہوں گا۔

عرصہ قبل ایک شادی کی تقریب میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، حضرت کا نام محمد سلیم تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کی بیٹی کی شادی گزشتہ سال ہوئی تھی، دولہا میاں غالباً جرمنی (یورپین ملک کے نام کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ دلہا میاں مختلف ممالک فرانس، اٹلی، سچینم وغیرہ میں بھی رہتے رہے اور گفتگو کے دوران ان کے سر کی ممالک کے نام لیتے رہے) سے آئے تھے۔ شادی کے فوراً بعد شوہر تو فوری طور پر واپس یورپ چلے گئے، بیوی کا پاسپورٹ اور ویزہ بننے میں چند ماہ لگ گئے، بعد میں وہ بھی یورپ چلی گئی۔ یورپ جانے سے قبل بیٹی میرے پاس آئی اور کہنے لگی آپ نے اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا ہے اور ایک دعا

کچھ

کچھ اس طرح تھا:

”تو چشم نظام الدین! خدا تجھے خوش رکھے۔ اس سے پہلے میں ایک خط روانہ کر چکی ہوں لیکن تو نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں پریشان ہوں۔ تمہارے چھوٹے بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ غالباً میعاد بخار ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگیں گی ورنہ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔

بیٹا کسی نہ کسی سے ادھار سدھار لے کر کچھ پیسے بھیج دو۔ بیماری تو ہے لیکن گھر کا حال یہ ہے کہ آج صبح سے مین سب کا فاقہ ہے۔ کلو دکان دار نے ادھار دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس دفعہ کچھ کفایت سے کام لینا کچھ زیادہ پیسے بھیجنا۔ دکان دار کا قرضہ زیادہ ہو گیا ہے اور بھی گھر کے دوسرے خرچ ہیں۔ تیری بڑی بہن کی میس جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر میری جان جلتی ہے۔ تیرے چاچا کا ہم لوگوں سے غیروں کا سا برتاؤ ہے پھر بتا ہم غریبوں کی بیٹی انھیں کیوں پسند آئے گی۔ تم نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ تم ٹھیک نہیں ہو میں اور بھی بے چین ہو گئی۔ بیماریاں سب ہی خطرناک ہوتی ہیں، توجہ کرنا، دوا دارو کرنا۔ تمہیں دیکھتے بہت دن ہو گئے اگر توجہ نہ کاٹیں تو کسی دن آکر منہ دکھا جاؤ۔ اپنے بیمار بھائی اور آٹے کے لیے پیسے جلد روانہ کرنا فقط تمہاری ماں۔“

نظامو کا مسئلہ معاشرے کا عام مسئلہ ہے۔ نہ جانے کتنے نظام روز اس مسئلے کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ میرے پاس نظامو کے لیے ہمدردیاں تھیں، آسو تھے جس کی اسے ضرورت نہیں تھی اس کا مداوا کیا کرتا۔ میں تو خود ایک نظامو ہوں۔ ایک ایسا نظامو جس نے اپنے سفید کاروں کی عزت رکھنے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔

روپیہ لے لیتا تھا۔“

”میں نے ہمدردی سے کہا تھا یا! تم لوگ تو یوں ہی اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ وہ بے چارہ تو کبھی بھی فاقے بھی کرتا تھا۔“ میری اس بات پر میرا سہمی اچھل کر بولا ”یا! تم بھولے بھالے آدمی ہو، تمہیں کیا پتا وہ تو لوڈنگ تک کے پیسے کھا جاتا تھا۔ جو بھی نیا بوباری آتا کہتا نکال پیسے تیرا مال سب سے پہلے لوڈ ہوگا۔ سب سے پہلے جائے گا۔ میں جو اس سے جلتا تھا اس کی وجہ تھی۔ بڑا کمین تھا وہ۔“ تھوڑی دیر بعد وہ بولا ”تمہیں یاد نہیں شاید جس دن وہ بابو بھائی سے باتیں بنا رہا تھا اور انھوں نے غصے میں اس کے منہ پر ٹھانچہ مار دیا تھا۔“

اس پر جتنے لوگ موجود تھے سب نے نظامو کو برا بھلا کہا کچھ نے تو گالیاں دیں اور اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ وہ مجھے پھر بھی نظر نہیں آیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا ایک خط مجھے ملا جواب تک میرے پاس موجود ہے۔ کہتے ہیں دوسروں کا خط پڑھنا اخلاقی جرم ہے۔ اس بات کا میں مجرم ہوں، اس لیے آپ سے بھی نہیں چھپاتا۔ اس کا خط میں نے پڑھا۔ یوں تو وہ خط مجھ سے ہی پڑھواتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کا خط پڑھنے میں ملامت محسوس نہیں کی تھی۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس میں گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اس خط میں کوئی بھی ایسی انوکھی بات نہیں جسے آپ کا ضمیر سننے کے لیے تیار نہ ہو۔ یہ ایک دھمی ماں کے دھم بھرے الفاظ ہیں۔ نہایت سیدھے سادے الفاظ ہیں۔ ملک کے کروڑوں انسانوں کی درد بھری کہانی جس کو ہم سب بخوبی جانتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ہم اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ نظامو کی ماں کا خط

مصطفیٰ علی بابا، بلوچوں کے رند قبیلہ میں ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ بابا سندھی زبان میں جدید طرز کی مختصر کہانیاں لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی لکھی حقائق پر مبنی یہ کہانیاں سبق آموز بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔

☆☆☆

مترجم ڈاکٹر عبدالحق خاں حسرت کاسٹیکو ہیں۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ میں سینئر ماہر مضمون کے عہدہ پر فائز رہے۔ سندھی انسانوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا خاص سلیقہ اور مہارت رکھتے ہیں کہ ان کے تراجم پر مبلغ زاد ہونے کا کمان ہوتا ہے۔

ایک دن میں نے صبح ناشتے کے دوران جب اہل خانہ کو بتایا کہ آج رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی ہسپتال میں ہوں، نرس میرے پاس آتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ کو نواسہ مبارک ہو۔ آپ جلدی سے بتائیں اُس کا کیا نام رکھنا ہے۔ میں نے نرس سے کہا کہ اس کا نام عبداللہ رکھنا ہے۔ میں نے کہا کہ اب جب آپ لوگ فون پر بات کریں تو ان کو کہنا کہ 'عبداللہ نام نوٹ کر لیں۔ میرا خواب سن کر سب اہل خانہ نے سر نیچے کر لیے اور تیزی سے کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ جس کی وجہ (اُس وقت) مجھے سمجھ نہ آئی۔

ایک دن اچانک زرینہ بیٹی کی طبیعت خراب ہوئی، اُس کا شوہر اُسے چیک کرانے کے لیے ہسپتال لے گیا۔ ہسپتال والوں نے چیک کرنے کے بعد ہسپتال میں داخل کر کے ایک کمرے میں بھیج دیا۔ عمران گھر گئے اور ضروری چیزیں گھر سے ہسپتال لے آئے۔ چیزوں میں قرآن پاک بھی تھا۔ زرینہ نے پوچھا کہ یہ کیوں لائے ہیں۔ عمران نے کہا کہ میں لایا نہیں، نہ جانے کیسے ساتھ آ گیا ہے۔

شام کو ہسپتال کا ایڈمنسٹریٹر راولڈن پر نکلا تو اس کمرے میں بھی آیا۔ الماری کے اوپر کپڑے میں لپی کتاب نظر آئی تو کتاب کی طرف اشارہ کیا، مسکرایا اور یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

Oh, I see the guidebook of International Terrorism. (بین الاقوامی دہشت گردی کی گائیڈ بک) عمران نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن وہ جواب سننے کے لیے ٹھہرا نہیں۔ زرینہ نے کہا دیکھا نہ بلا وجہ اسے لانے کے باعث بے لگی باتیں سننی پڑیں۔ عمران نے کہا زرینہ گھبراؤ نہیں، ایسی باتیں تو ہم روزانہ یہاں سنتے رہتے ہیں۔ کیا ان جالوں کی باتوں کی خاطر ہم قرآن سے اپنا ناطہ توڑ لیں۔ تمہیں معلوم ہی ہے میں نے یورپ میں کئی سال بغیر پاسپورٹ ویزا چھپ چھپ کر گزارے ہیں۔ میں تم کو کبھی بتاؤں گا کہ قرآن نے میرا کتنا ساتھ دیا ہے۔

رات کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو زرینہ کو لیبر روم

میں لے گئے۔ عمران کمرے ہی میں بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا کہ نرس نے آکر اسے بتایا کہ آپ کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ صبح مقامی ایف ایم ریڈیو اسٹیشن نے خبر نشر کر دی کہ ہمارے مقامی ہسپتال میں لاپرواہ عملہ بیٹھا ہوا ہے۔ ایک عورت کو ۳۰ مرتبہ الزاؤنڈ کی یہ رپورٹ دی گئی کہ تمہاری بیٹی پیدا ہوگی لیکن اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ صبح ایڈمنسٹریٹر راولڈن پر تھا تو اُن کے کمرے میں بھی آیا اور کہنے لگا کہ ایف ایم ریڈیو اسٹیشن کو خبر بھیجے کی کیا ضرورت تھی؟ ویسے ایسے موقعوں پر میں نے دیکھا ہے کہ آپ اسٹیشن لوگ بہت جذباتی ہو جاتے ہو اور خاص طور پر مسلمان تو لڑکا پیدا ہونے پر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ عمران اور اس کی بیوی کو خبر نشر ہونے کے بارے میں بالکل معلوم نہیں تھا۔ عمران نے کہا ہم نے کیوں ہوش و حواس کھوئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کی مشینوں کی اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا حیثیت ہے۔ آپ مشینوں پر believe (بھروسہ) کرتے ہو، ہم خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ہم مسلمان تو سمجھتے ہیں کہ اللہ کے بھید اللہ ہی جانتے۔

یہ ہمارا قرآن پاک، یہ ہماری گائیڈ بک زندگی کے ہر مسئلے میں ہماری راہنمائی کرنی اور بتانی ہے کہ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ رحم مادر کے اندر ۳۰ اندھیروں (بناؤں یا پردوں) کے پیچھے کیا ہے، لڑکا ہے لڑکی ہے۔ شیطان صفت ہے یا نیک انسان ہے۔ پھر یہ ہمیں بتا رہی ہے کہ تمام بادشاہت اللہ ہی کی ہے وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹھیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر صاحب نے ایک زوردار تہققہ لگایا۔ بہت خوب بھئی، ہمارے ڈاکٹروں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھ کر آپ لوگوں نے یہ باتیں بھی اپنی کتاب میں لکھ لی ہیں۔ یہ کس ایڈیشن میں پہلی مرتبہ شامل کی ہیں؟ عمران نے بتایا کہ یہ ۱۴۰۰ سال پرانے اور بچل ایڈیشن میں بھی لکھا ہوا تھا۔ ایڈمنسٹریٹر نے چیخے ہوئے کہا "ناممکن ناممکن"۔ یہ

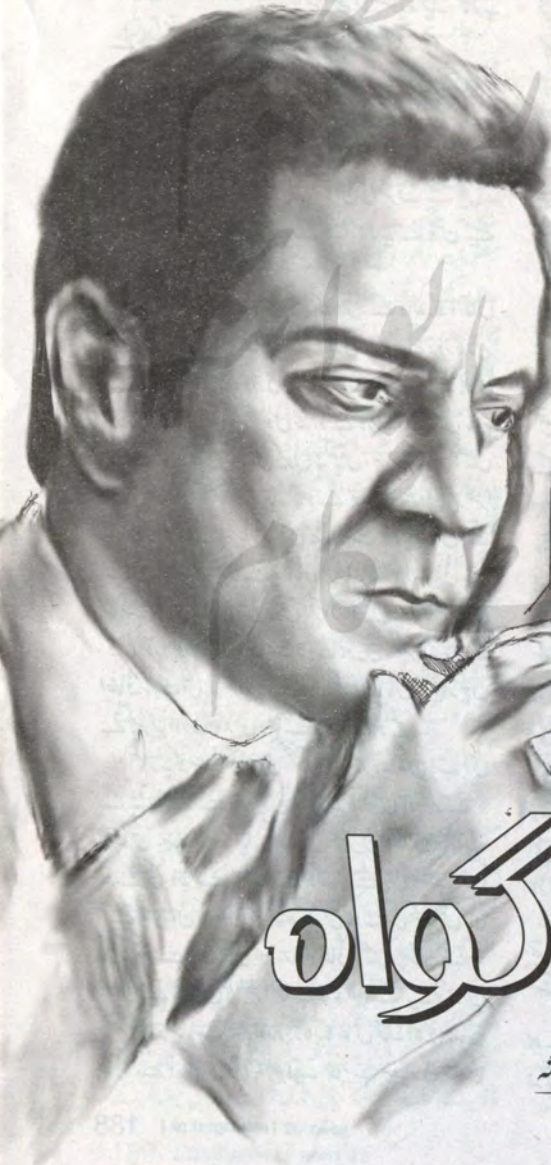
میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہاں زچہ و بچہ کا معائنہ کرنے کے لیے ہفتہ میں ۵۰۰ نرس گھر میں آتی ہے۔ وہ جب پہلے دن آئی تو کہنے لگی ماں کے یہ آرام کے دن ہیں۔ ان دنوں کھانا پکانا، کپڑے دھونا، استری کرنا اس کو بالکل منع ہے۔ یہ سب کام اُس کا شوہر کرے۔ بچے کے رونے کی آواز گھر سے باہر نہیں آتی چاہیے۔ اگر آپ کا پردیسی بچے کے رونے کی آواز سنے گا تو وہ فوری طور پر پولیس کو فون کر سکتا ہے۔ پولیس آئے گی اور بچہ اٹھا کر لے جائے گی۔ حکومت نے اس مقصد کے لیے باقاعدہ ادارے بنائے ہیں جہاں ایسے بچوں کو نگہداشت کے لیے رکھا جاتا ہے۔

پردیس سے اطلاع آتے ہی بچوں نے مجھے بتایا کہ اللہ نے آپ کی دعائیں سنی لی ہیں اور زرینہ کو بیٹی کے بجائے بیٹا دیا ہے۔ پھر انھوں نے ساری بات تفصیل سے بتائی۔ اہل خانہ نے بتایا کہ ہم نے آپ کا بتایا ہوا نام 'عبداللہ' زرینہ یا عمران کو نہیں بتایا تھا۔ انھوں نے بیٹے کا نام عرفان احمد ہسپتال میں درج کرا دیا تھا، جو اب بدلنا ممکن نہیں۔

بچوں سے ہی یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ عمران نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اللہ نے بیٹا دیا تو ہم عمرہ کرنے سعودی عرب جائیں گے۔ نئے میاں کو آب زم زم پلائیں گے۔ اسی لیے بیٹی کتنی تھی کہ بیٹے کے لیے دعا کریں تاکہ وہ جلد از جلد عمرے کی سعادت حاصل کر سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زرینہ اور عمران الزاؤنڈ کی رپورٹ آنے کے باوجود بیٹے کے لیے دعا کرتے رہے۔ عمران کہتا تھا کہ میں ہر نماز کے بعد اللہ کے سامنے لڑکھاتا تھا کہ مولا!..... تجھے معلوم ہے اس معاشرے میں بیٹی نہیں رہ سکتی۔ بیٹا ہوگا تو وہ یہاں رہ سکے گا۔ بیٹی ہوئی تو تیلی کو پاکستان واپس بھیجنا پڑے گا۔

سلیم صاحب کی دلچسپ باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ اچانک شور مچا کہ کھانا نکل گیا۔ پھر "نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز....."

ایک آبائی لہر کا ماحبر
جو خوشی کے بجائے پریشانی کا باعث بن گیا تھا
مشکلات اگر گنل ہیں تو اتنی دیر سے کیوں سمجھ میں آتے ہیں



پہلا گواہ

توقیر عائشہ

بھائی

صاحب کا فون آیا تھا۔ ان کے جانے کی تاریخ آگئی ہے۔ اس مہینے کی ۲۵ ہے۔ وہ پوچھ رہے تھے کیا مشورہ کیا۔“ نازیہ

نے طاہر کی طرف چائے بڑھاتے ہوئے کہا۔
”بھئی میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اتنی بڑی آخر قبول کرتے ہوئے شرمی محسوس ہوتی ہے۔“ طاہر نے جواب دیا۔

”اچھا ایسا کرتے ہیں شام کو ان کی طرف چلتے ہیں۔ اونٹ کسی کروٹ بیٹھ ہی جائے گا۔“ نازیہ نے برتن سیٹھے ہوئے کہا۔

نازیہ ابھی چھوٹی ہی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی جمال نے جو ابھی نئے نئے روزگار پر لگے تھے بڑی ذمہ داری کا احساس کیا اور چھوٹے بھائی اور بہن کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ ایسے میں ماں کی بے شمار دعائیں انھیں کیوں نہ لگتیں، ہرگز رتا دن انھیں معاشی طور پر مستحکم کرتا گیا۔ چھوٹے بھائی کو پیروں پر کھڑا کیا اور اس کے گھر بار کا بھی بندوبست کر دیا۔ ماں نے اب انھیں بھی گھر بسانے پر آمادہ کر لیا۔ خدا کی مہربانی سے شائستہ ان کی زندگی میں رونق افروز ہو گئیں۔ وہ نام نہاد کی نہیں طوراً طور کی بھی شائستہ ثابت ہوئیں۔ گھر میں ان کا اضافہ بہت ہی خوشگوار ثابت ہوا۔ مگر اب ماں کو بیماریوں نے گھیر لیا اور وہ جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

نازیہ کو سب کی بڑی محنتیں ملی تھیں۔ لیکن اب امی کے نہ ہونے سے بھائیوں کو نازیہ کا فرض ادا کرنے کا احساس بہت بڑھ گیا۔ گھر میں بہترین معاشی حالات ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ رشتے کی طلب میں آتے لیکن ان کی لاچ اور کچھ حاصل ہونے کی خواہش ان کی گفتگو سے ٹپک پڑتی اور جمال بھائی انھیں چلتا کرتے۔ ایسے میں ان کی نظر انتخاب خاندان کے ایسے نوجوان پر پڑھری جو مناسب تعلیم اور روزگار کا حامل تھا۔ آدمی جمال بھائی سے تو کم ہی تھی لیکن ایک مناسب معیار کی زندگی

آرام سے گزاری جا سکتی تھی۔ خاندان کے دیگر افراد جمال بھائی کے کمزور وغیرہ بے وجہ احساس کمتری کے ساتھ یا کسی لاچ میں جمال بھائی کے آگے پیچھے پھرتے لیکن نوجوان برابری اور وقار کے ساتھ ملتا۔ یہ ہر لحاظ سے نازیہ کا ہم پلہ تھا۔ خرابی تھی تو بس ایک کہ وہ شادی شدہ تھا۔ اور بات تھی کہ بیوی چند ماہ ساتھ نبھانے کے بعد غلط کر چلی گئی تھی۔ اولاد بھی کوئی نہ تھی۔ غلطی کی وجوہات جمال بھائی سے پوشیدہ بھی نہ تھیں۔ انھیں طاہر سے بڑی ہمدردی محسوس ہوئی۔ بیوی اور بھائی کے سامنے انھوں نے بات رکھی تو کسی کو اعتراض نہ ہوا۔ ڈر نازیہ کا تھا کہ کہیں انکار نہ کر دے۔ مگر شائستہ بھائی نے اس طرح نازیہ سے بات کی کہ وہ بھی راضی ہو گئی۔

دوسری طرف طاہر کا بھی ایک پس منظر تھا۔ طاہر کی والدہ انتقال کر چکی تھیں۔ طاہر کے تین بھائی اور دو بہن تھیں۔ کچھ شادی شدہ تھے۔ تعلیم کے بعد طاہر والد صاحب کے ساتھ کاروبار میں لگ گیا تھا۔ آدمی اتنی تھی کہ درمیانے درجے کی آبادی میں ایک ون پونٹ بنگلہ اپنی رہائش کے لیے بنا لیا تھا۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ بھائیوں میں محبت قائم رکھنی ہے تو اپنی اپنی رہائش الگ ہونی چاہیے۔ انھوں نے طاہر کا گھر آباد کیا لیکن وہ مکان گھر نہ بن سکا۔ میکے کا اصرار اور خود فرح کی امریکا کی ہونے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ چند ماہ سے زیادہ ساتھ نہ رہ سکیں۔ تو اب بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی طاہر اکیلا تھا۔ خوش مزاجی طبیعت کا حصہ تھی۔ لہذا زندگی کی گاڑی رواں دواں تھی۔ اس رشتے کو طاہر نے اہل خانہ نے بھی پسند کیا اور یوں سب کی دعاؤں میں نازیہ طاہر کے گھر میں آن بسی۔

جمال بھائی کو کنیڈا میں بہت اچھی ملازمت مل چکی تھی۔ جس میں انھیں اپنے اکلوتے بیٹے کی تعلیم اور بہتر مستقبل کی جھلک نظر آرہی تھی۔ لہذا انھوں نے وہاں چلنے والے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ اس آئیالہ گھر میں نہ بیچیں اور نہ ہی کرائے پر دیں۔ بلکہ اپنی پیاری بہن

بھائی اختیار کرنے کے لیے کہیں۔ کرایہ وصول کرنے کی باتیں کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔
نازیہ اور طاہر کی بیٹی بیٹا ابھی چھوٹے تھے۔ یہ بنگلہ جو طاہر نے شوق سے بنایا تھا اب اس کی مقامی آبادی میں غلط فہمی کے افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ گلی کے کونے پر آؤ ورنشاپس کی ڈھیروں دکانیں کل چکی تھیں۔ سارا دن گاڑیوں کا شور رہتا۔ ان کے قریب ہی کسی ویگن کا انگریز شاپ تھا۔ نازیہ طاہر سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ اب میں رہائش بدل لینی چاہیے۔ بھائیوں کی پیشکش میں سے بڑا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ آج جمال بھائی نے ان دونوں کو اسی سلسلے میں بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔

حسب وعدہ مغرب کے بعد طاہر اپنی فیملی کے ساتھ جمال بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ ”طاہر میاں! ہمارے اوپر رہائی کرو اور ہمارے گھر میں رہ لو۔“
شائستہ نے مذاق میں کہا ”بھئی جو تنخواہ چوکیدار مانگ رہا ہے وہ تم کو ہی دے دیں گے۔“ سب ہی ہنس پڑے۔
جمال بھائی نے بات آگے بڑھائی۔ ”ہم اپنے بیٹے کے مستقبل کے لیے تم سب کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تم بھی اپنے بچوں کے بارے میں سوچو۔ آج تمہارا اسد چھوٹا ہے۔ کل گلی میں کھیلے گا۔ کیسے کیسے دوست بنائے گا۔ تمہاری گڑیا سکول کالج جائے گی۔ انہی رستوں سے گزرے گی۔ اب ماحول پہلے جیسا نہیں رہا۔ تم یہاں رہائش اختیار کرو۔ اپنے گھر کو فروخت کر کے اسی علاقے میں پلاٹ لے کر ڈال لو۔ یہاں رہتے ہوئے آہستہ آہستہ تعمیر کرتے رہنا۔ تمہیں بہتر ماحول میسر آجائے گا۔ بچوں کی بہتری اسی میں نظر آ رہی ہے۔“ جمال بھائی نے ختم سے کہا۔

طاہر گوگو کی کیفیت میں تھا۔ بات تو درست تھی اور اس کے مفاد میں تھی۔ منصوبہ بندی میں کوئی جھول نہ تھا۔ بچوں میں چھپے غلوں نے طاہر کو قائل کر ہی لیا۔
جمال بھائی جا چکے تھے۔ نازیہ اور طاہر شفٹنگ میں لگ گئے۔ اپنا گھر خالی کرتے ہوئے طاہر کو عجیب سا لگ

رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اچانک وہ دن آ گیا۔ جب فرح کے بھائی غلطی کے بعد فرح کو دیا جانے والا جہیز اٹھا کر لے جا رہے تھے اور بدلے میں ایک سانا اور دشت چھوڑ کر جا رہے تھے۔ لیکن اب میں اور جب میں کتنا فرق تھا۔ نازیہ کے خاندان میں شامل ہو کر وہ ہر لحاظ سے پُرسرت زندگی گزار رہا تھا۔

اب وہ مرحلہ آیا کہ اپنا بنگلہ فروخت کرے۔ امید تھی کہ ایک دو ماہ میں اس کام سے بھی فراغت ہو جائے گی مگر..... طاہر نے قریب کے اسٹیٹ ڈیلرز کے پاس تمام معلومات رکھوا دیں۔ دونوں میاں بیوی اس گھر میں آنا جانا رکھتے کہ کوئی خالی گھر میں گھر میں نہ بیٹھ جائے۔ چوکیدار رکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ وہ کوئی غیر قانونی کام نہ شروع کر دے۔ گیس، بجلی کے بل باقاعدگی سے بھرتا حالانکہ اسے اب جمال بھائی والے گھر کے بل بھی ادا کرنے ہوتے تھے۔ اس نے اخبارات میں اشتہار دے دیے۔ پارٹیاں آتیں جو قیمت لگاتیں وہ طاہر کو پسند نہ آتی۔ اچھی قیمت کے چکر میں وہ گاہک لوٹا دیتا۔ اچانک وہاں چائیدادوں کی قیمت گرنے لگی۔ جتنی قیمت شروع میں مل رہی تھی اب اُس سے کہیں کم دام مل رہے تھے۔ گاہک تو اب بھی آ جاتے تھے۔ طاہر نے کم قیمت پر ہی دل کو آمادہ کر لیا۔ کیونکہ آئے دن یہاں کی حاضری اور بلوں کی ادائیگی روزمرہ کے معمولات اور بجٹ کو متاثر کر رہی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ سودا ہوتے ہوتے رہ جاتا۔ بیعانہ، لین دین تک نوبت آ جاتی پھر کوئی ایسا مسئلہ اڑے آ جاتا کہ معاملہ ٹھپ ہو جاتا تھا۔ طاہر چڑچڑا ہوا چلا تھا۔ موجودہ رہائش کے قریب ایک بہت اچھا پلاٹ مناسب قیمت پر مل رہا تھا۔ امید تھی کہ رقم ملتے ہی اس پلاٹ کو لے لے گا۔ مگر وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

”اس سے تو اچھا تھا کہ آپ کرائے پر چڑھا دیتے۔ جب ہم کہیں جانے کا پروگرام بناتے ہیں آپ گھر کے چکر میں نکل جاتے ہیں۔ بچے گھر میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ نازیہ نے تنگ آ کر کہا ”ہاں تاکہ کرائے داری قبضہ کر کے

بیٹھ جائے۔“ طاہر کا جواب ہوتا۔ یوں اس کا دل کبھی یکسو نہ ہوتا۔ ایسے میں ایک دن اس کا پرانا دوست سرور آفس میں ملنے چلا آیا۔ باتوں باتوں میں مکان کی فروخت کا ذکر نکل آیا۔

”کیا بتاؤں؟ خدا کو کیا منظور ہے؟ میں مکان کے چکر میں کہاں کہاں نہیں گیا؟ مگر پکنا ہی نہیں۔“ طاہر نے اپنے دوست سے کہا۔

سرور نے کہا ”خالی گھر میں تو جن بیرا کر لیتے ہیں۔ تم نے کسی ہالے کو بھی دکھایا؟“

”کیا بات کرتے ہو یا! تم کو پتا ہے کہ میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ اب تم عامل کامل کے پاس جانے کا مشورہ دو گے۔“ طاہر نے کہا۔

سرور نے کہا ”عامل کامل تو نہیں لیکن اسی شہر میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو چنگی بجاتے مسئلہ حل کرتے ہیں مگر تم اس پر بھی شک کرو گے۔“ سرور نے منہ بنا کر کہا۔

”ہاں وہ کہے گا، کوئوں میں تعویذ دباؤ۔ یہ پانی چھڑکو وغیرہ۔“ طاہر نے بے زاری سے کہا۔

”نہ نہ ایسا کچھ نہیں۔ وہ ایک اسکالر ہیں اخبارات میں مضامین لکھتے ہیں۔ وہ صرف لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں۔ شاید تمہیں بھی کوئی مفید مشورہ مل جائے۔“ سرور نے طاہر کو رضا مند کر دیا۔

☆☆

سرور نے ناظم لے لیا تھا اور اب وہ رحمانی صاحب کے دروازے پر تھے۔ ایک میزدار چوکیدار نے انہیں اندر بٹھایا۔ لائبریری جیسا ماحول تھا۔ ملاقاتیوں کے لیے شاندار صوفیٹ بھی موجود تھا۔ وہی منٹ بعد درمیانی عمر کے ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ سفید چائنا ٹوٹی بارلش چیرے پر پہلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سرور سے واقف تھے۔ سرور کوئی افراد کو ان کے پاس لا چکا تھا اور سب ہی مطمئن ہو کر گئے تھے۔ سرور نے طاہر کا تعارف کرایا اور بتایا کہ مکان کی فروخت میں ناقابل یقین حد تک رکاوٹ آجاتی ہے۔

رحمانی صاحب نے طاہر سے کہا ”میں آپ سے سوالات کروں گا جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے مریض سے کرتا ہے آپ انہیں تو محسوس نہ کریں گے؟“

”نہیں میں تو آیا ہی اسی لیے ہوں کہ میرا مسئلہ حل ہو جائے آپ جو پوچھنا چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔“ طاہر کا جواب تھا۔

انہوں نے تعلیم، روزگار، رہائش وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ پھر شادی کے بارے میں پوچھا۔ طاہر نے بتایا کہ ”میں شادی شدہ ہوں البتہ یہ میری دوسری بیوی ہیں۔“

رحمانی صاحب نے پوچھا ”پہلی بیوی کہاں ہیں؟“ طاہر نے کہا ”اب یہ تو مجھے علم نہیں کیونکہ انہوں نے شادی کے سال بھر کے اندر ہی خلع لے لیا تھا۔ دراصل

اپنے والدین کے پاس امریکا سیٹ ہونا چاہتی تھیں اور میں اس پوزیشن میں نہ تھا۔“ طاہر نے وضاحت سے جواب دیا۔

”اچھا! اچھا! آپ موجودہ شادی سے مطمئن ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں! اس خاندان نے مجھے بڑی عزت دی ہے۔“ طاہر نے جواب دیا۔

”جو مکان آپ بیچنا چاہتے ہیں اس میں آپ نے کتنا عرصہ قیام کیا؟“ اگلا سوال تھا اور جواب تھا ”۸ سال۔“

رحمانی صاحب نے پوچھا ”اس مکان پر کوئی قرضہ ہے؟“

طاہر نے جواب دیا ”جی ہاں تھا۔ لیکن اب سب ادا کر دیا گیا ہے۔“

”آپ نے یہ مکان کسی کو گفٹ تو نہیں کیا۔“ رحمانی صاحب نے پوچھا۔

”جی ہاں! میں نے اپنی بیوی کو دیا ہے۔“ طاہر نے بتایا۔

رحمانی صاحب نے فوراً ہی پوچھا ”کون سی بیوی؟ پہلی یا دوسری؟“

”وہ جی میری پہلی شادی تھی اور خیال بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ میں نے ایک سادہ کاغذ پر لکھ دیا تھا۔ شادی کی خوشی تھی اور وہ جذباتی سا دور تھا۔ کوئی باقاعدہ دستاویز نہیں بنی تھی۔“

رحمانی صاحب نے آگے کا نقشہ کھینچا۔ ”پھر حالات بدل گئے۔ پھر خیر آجائے سے آپ کے اور ان کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟“

”جی ہاں۔“ طاہر نے مختصر کہا۔

”انہوں نے بھی اس بات کا مطالبہ کیا کہ یہ مکان تو میرا گفٹ ہے۔“ رحمانی صاحب نے اب یہ سوال کیا۔

طاہر نے کہا ”نہیں۔ وہ پیپرو تو کاغذات میں کہیں دے گیا۔ نہ انہوں نے کبھی مطالبہ کیا نہ میں نے اس پر کبھی سوچا اور پھر وہ جلد ہی ملک سے باہر چلی گئیں۔“

”پھر آپ کی شادی ان خاتون سے ہو گئی اور آپ نے انہیں بھی یہی مکان گفٹ کر دیا۔“ رحمانی صاحب نے بات مکمل کی۔

”جی ہاں۔“ طاہر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ اب مسئلہ ایک تیار شدہ اختیار کر رہا تھا جس کے تمام زاویے ایک بزنس مین ہونے کے ناطے طاہر پر عیاں ہو رہے تھے۔

رحمانی صاحب نے ایک لمبی ہوں کی اور کہا ”میرا خیال ہے آپ بہت کچھ سمجھ چکے ہیں۔ آپ نے ایک تحفہ کی کو دیا اور پھر اس سے پوچھتے بغیر وہی تحفہ کی اور کو دے دیا۔ مکان کا فروخت نہ ہو سکتا اس بات کی علامت ہے کہ وہ چیز دراصل آپ کی ملکیت نہیں۔ ہر وعدے کا پہلا گواہ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے چاہے وہ زبانی ہو یا کاغذات پر۔ آپ کی موجودہ بیگم تو اس کی فروخت پر راضی ہیں لیکن

میں علم نہیں کہ یہ سابقہ بیگم کو دیا جا چکا ہے۔ اگر آپ کی سابقہ بیگم بخوشی آپ کو دیتی ہیں اور اس میں کوئی دچکپی

ظاہر نہیں کرتیں جب ہی آپ وعدے کی زنجیر سے آزاد ہو سکیں گے اور پھر یہ مکان فروخت ہو سکے گا۔“ رحمانی صاحب نے ہر پہلو واضح کر دیا۔

طاہر نے بے چارگی سے پوچھا ”اب میں کیا کروں؟“

رحمانی صاحب نے حل پیش کرتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے آپ موجودہ بیگم کو اعتماد میں لیں اور انہیں بتا دیں کہ یہ مکان آپ کا نہیں رہا۔ پھر آپ سابقہ بیگم سے رابطہ کریں۔ یہ بے تو بڑے دل گردے کا کام لیکن آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود آپ اسے فروخت نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ رب تعالیٰ آپ کو وعدے کی پاسداری کا نوٹس دے رہا ہے۔“

سرور منہ پھاڑے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ بات تو اس کی سمجھ میں بھی آچکی تھی۔ اس نے سوچا اگر اس کی دوستی کا حق ادا کرنا ہے تو مجھے اس کی مدد کرنی ہوگی۔ اس نے طاہر کو اٹھاتے ہوئے کہا ”آؤ طاہر! بہت کچھ واضح ہو گیا۔ چلو اللہ بہتر کرے گا۔“

وہ دونوں رحمانی صاحب کا شکریہ ادا کر کے باہر آگئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر دونوں باتیں کرنے لگے۔ ”یار! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اگر میں نازیہ کو سب بتا دوں تو اس کے بھائیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔ اگر میں فرح کو مکان دے دوں تو میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔ پھر میں اتنی بڑی دنیا میں اس سے کہاں رابطہ کروں؟“

سرور نے کہا ”نیت ثابت رکھ میرے بھائی! اب دنیا گلوبل ویج بن چکی ہے۔ ڈھونڈ لیں گے انہیں بھی۔ ایسا کرتے ہیں جن لوگوں نے تمہارا پہلا رشتہ کرایا تھا ان سے رابطہ کرو۔ ہو سکتا ہے وہ مدد کریں۔ بلکہ وقت کے لو میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

دونوں کی کھوج کرید کے بعد وہ دونوں فیروز صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ فرح پاکستان میں نہیں۔ ان کے والدین نے ان کی شادی وہیں کر دی ہے۔ وہ مطمئن ہیں اور صاحب اولاد بھی۔

ان کے سامنے ہی فیروز صاحب نے امریکا فون پر بات کی اور تمام صورتحال فرح کے سامنے رکھ دی۔ فرح کے لیے بھی یہ بات ایک دھماکے سے کم نہ تھی کہ اسے بیٹھے بٹھائے ایک مکان مل رہا تھا۔ اس نے سوچنے کے

روز

ایک ماں کا ماحبرا
اے اپنے بیٹے کی بڑی محبت تھی
اور وہ محبت کے مفہوم واقعی سے بے خبر

کچھ
سوالوں کے
جواب کبھی
نہیں ملتے

حسن رزاقی

درستی سے جواب دیا۔

میں چھٹیاں گزارنے اپنی ماں کے پاس کراچی آیا تھا۔
میں مونٹریال میں رہتا ہوں۔ ہر سال چھٹیاں اپنی
ماں کے پاس کراچی میں گزارتا ہوں اور ہر سال واپس

ایک دن اور رک جاتے۔
یہ میری ماں کی انتہائی بھری آواز تھی۔
”یہاں رک جاؤں یا وہاں جا
کر نوکری کروں۔“ میں نے

بیٹا

خیالات کی طاقت

انسان دیکھ جاسکتے ہیں، ٹٹولے جاسکتے
ہیں، تم انہیں پکڑ سکتے ہو، ان پر حملہ کر سکتے ہو
اور قید کر کے ان پر مقدمہ چلا سکتے ہو اور انہیں
تختہ دار پر لٹکا سکتے ہو۔

لیکن خیالات پر اس طرح قابو نہیں لیا
جاسکتا۔ وہ نامحسوس طور پر پھیلے ہیں، نفوذ کر
جاتے، چھپ جاتے اور اپنے مٹانے والے
کی نگاہوں سے مخفی ہو جاتے ہیں۔ روح کی
گہرائیوں میں چھپ کر نشوونما پاتے ہیں،
پھلتے پھولتے اور جڑیں نکالتے ہیں۔ جتنا تم
ان کی شاخیں جو بے احتیاطی کے باعث ظاہر
ہو جائیں گی، کاٹ ڈالو گے، اتنا ہی اُن کی
زمین دوز جڑیں مضبوط ہو جائیں گی۔
(الیکٹر ڈوما)

میرے بھی بچے ہیں اور طاہر کے بھی بچے ہیں۔ میں بے
مکان طاہر کے بچوں کو دیتی ہوں۔ طاہر ان کے سر پرست
کی حیثیت سے ان کی بہتری کے لیے جس انداز سے
چاہیں اس کو استعمال کریں۔“

طاہر جو ذہنی طور پر مکان فرح کو منتقل کرنے پر تیار تھا
اس فیصلے پر حیران رہ گیا۔ فرح کی طرف سے کیے گئے اسی
ظرفی کے اس مظاہرے نے اس کے بہت سے مسئلے
آسان کر دیے تھے۔ جب طاہر نے صدق دل سے وعدہ
پورا کرنے کی ٹھان لی تو اللہ کی رحمت اس کے شامل حال
ہوتی چلی گئی۔

واقعی انسان کا کسی مشکل میں گرفتار ہونا دراصل
رب تعالیٰ کی طرف سے سنگت ہوتا ہے کہ اپنے معاملات
درست کر لے جائیں۔ اس لیے اپنے دل کی بیڑی چارچ
رکھیے۔ کہیں کوئی خاص سنگت زندگی کی بھگ دوڑ میں آپ
سے چھوٹ (مس) نہ جائے اور پھر خدا کے حضور پہنچنے کے
بعد تلافی کی کوئی صورت بھی نہ رہ جائے گی۔

لیے ایک دن کا وقت مانگا۔

جب طاہر گھر پہنچا تو پریشانی چہرے سے عیاں تھی۔
جس مکان سے بچوں کے مفادات وابستہ تھے وہ ہاتھ
سے جاتا دیکھ رہا تھا۔ لیکن وعدے کو پورا کرنے کے
اخلاقی تقاضے نے ہمت دے رکھی تھی۔ نازیہ نے پوچھا
”سرور بھائی! آپ کو کہاں لے جاتے ہیں۔ کئی دن سے
روز ہی چکر لگاتے ہیں۔ کیا پریشانی ہے؟“ اب طاہر کی
ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ساری صورت حال
نازیہ کے سامنے رکھ دی۔

”نازیہ! میں تمہارا مجرم ہوں۔ جس چیز پر میرا بھی
حق نہ رہا تھا وہ تمہیں دے بیٹھا۔ اب یہ گھر ہمیں فرح کو
دینا ہوگا جو میری زندگی کی صرف چند ماہ کی شریک تھی۔
زبان سے نکلے الفاظ ہوں یا کاغذی دستاویزات سب پر
خدا پہلا گواہ ہوتا ہے۔ اب میں تم سے اور تمہارے
خاندان سے نظر نہیں ملا سکتا۔“

اس کا خیال تھا کہ نازیہ یہ سن کر بھڑک اٹھے گی۔ مگر
وہاں خاموشی تھی۔ ”بولو نازیہ! مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“
طاہر نے کہا۔

نازیہ کے لیے بھی یہ ایک بڑا دھچکا تھا۔ مگر وہ تھوڑی
سی ذہنی کشمکش کے بعد نتیجے پر پہنچ گئی اور بنجیدگی سے گویا
ہوئی۔ ”میرے بھائی نے آپ کی شرافت کی وجہ سے آپ
کو میرا سامھی بنایا تھا۔ اس مکان کی بنیاد پر نہیں۔ اللہ
مہربان ہے کہ اس نے بے گھری کے عذاب سے بچاتے
ہوئے پہلے ہی ہم کو ایک ٹھکانہ فراہم کر دیا۔ آپ وعدہ پورا
کریں اللہ بہتری کرے گا۔“

طاہر کے دل سے منوں بوجھ اتر گیا۔ کئی رات کے
بعد آج اسے پرسکون نیند آئی۔ دوسرے دن سرور اور طاہر
فیروز صاحب کے پاس بیٹھے فرح کا حیران کر دینے والا
فیصلہ سن رہے تھے۔ فرح نے پیغام دیا تھا ”آج کل
پاکستان میں جو حالات ہیں ان میں کوئی جائیداد بنانا بہت
مشکل کام ہے۔ پھر طاہر کے پاس اس کے سوا کوئی دوسری
جائیداد بھی نہیں۔ میرا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

جاتے ہوئے ”ایک دن اور“ رکنے کا تقاضا ہوتا ہے۔

مجھے رخصتی کے لمحوں کی ان جذباتی باتوں سے چڑ ہے۔
”اچھا اگر ایک دن نہیں رک سکتے تو ایک گھنٹے بعد
ہوائی اڈے چلے جانا۔ ابھی فلائٹ میں تین گھنٹے باقی
ہیں۔“ ماں کا یہ اُلوکھا تقاضا تھا۔

”اگر ایک گھنٹہ اور رک بھی گیا تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟“
”میری آنکھیں ایک گھنٹہ اور خشتری رہیں گی۔“ وہی
جذباتی باتیں۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ پہلے مجھے
لندن جانا تھا۔ وہاں ۲ دن رک کر مونٹریال۔

..... (ب)

لندن ہوائی اڈے سے میں کوئٹہ آئیشن آیا جہاں
مجھے ”سن رائز“ بیڈ اینڈ بریکفاٹ ہوٹل میں ٹھہرنا تھا۔
میں جب بھی لندن آتا۔ اسی ہوٹل میں ٹھہرتا۔ میں پہلی
دفعہ ”سن رائز“ میں اس وقت ٹھہرا تھا جب میں پہلی دفعہ
کینیڈا جا رہا تھا۔ جب میں زیادہ مہینے نہ تھے۔ کم کرائے
والے ہوٹل کی تلاش تھی۔ ”کوئٹہ آئیشن“ کے پیچھے ایسے
بہت سے ہوٹل تھے۔ ان میں سے ایک سن رائز تھا۔ یہاں
پر میری ہوٹل کے مالک کے سر سے ملاقات ہوئی جو اس
ہوٹل کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان سے دوستی ہو گئی۔ پھر
میں یہیں ٹھہرنے لگا۔ گھر کا دوستانہ ماحول تھا۔ گپ شپ
رہتی۔ وقت اچھا گزرتا۔

ان صاحب کا نام جنید تھا۔ جنید صاحب ویسے تو عمر
رسیدہ تھے لیکن اپنے دل کو جوان رکھا ہوا تھا۔ گھومنے
پھرنے کے شوقین اور باتوں کے رسیا۔

فرصت ہوتی تو قصہ گوئی شروع کر دیتے۔ ہندوستان
کے پرانے قصے اور اپنا تجربہ سنایا کرتے کہ لکٹی جوانیوں کو
زیر کیا۔ کبھی کبھی آوارہ گردی کرتے ہم لندن کی سڑکوں پر
نکل جاتے۔ آج آکسفورڈ سڑکس جانے کا پروگرام بنا۔
وہاں ان کی ایک پسندیدہ کافی شاپ بھی جہاں ٹی پیٹریاں
ان کو مرغوب تھیں۔ سینڈویچ وغیرہ بھی ملتے تھے۔ مگر وہ
پیٹریوں کے شیدائی تھے۔

ہم لوگ کاؤنٹر سے اپنی پسند کی پیٹری لے کر مڑے
تو ساری میزوں کو بھرا ہوا پایا۔ ایک میز پر ایک اکیلے لڑکی
سر جھکائے بالوں کی لٹوں کو کرائے کچھ لکھ رہی تھی۔

میز کے پاس پہنچ کر اجازت چاہی کہ ہم یہاں بیٹھ
جائیں تو سر کی جنبش سے اجازت مرحمت فرمائی۔ شاید
امتحان کا پرچہ لکھ رہی تھی کہ وقت ختم ہونے سے پہلے پرچہ
ختم ہونا تھا۔ سر اٹھانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ میں نے
تصدیق کرنے کی خاطر پوچھا کہ پرچہ کا مضمون کیا ہے۔
جملہ کو سراہتے ہوئے اور بالوں کی لٹ کو ایک طرف کرتے
ہوئے ”آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میری آنکھیں اُس کی
آنکھوں کی کشش کی تاب نہ لائیں۔

ساری شوخی دھری رہ گئی۔
آنکھیں تھیں یا مقناطیس کی جھیلیں کہ مجھے اپنی طرف
کھینچنے لیے جا رہی تھیں۔ قدم تک نہ سنبھالے جاسکتے تھے۔
ابھی میں ان جھیلوں میں ڈوب ہی رہا تھا کہ دوسرا وار ہوا۔
اپنا صندلیں ہاتھ میری طرف بڑھایا ”میرا نام روز ہے۔“
میری شامت میں نے ہاتھ تھام لیا۔ جس طرح
بادلوں میں بجلی چھپی ہوئی ہے اسی طرح اس ہاتھ میں بھی
بجلی چھپی ہوئی تھی اور جس طرح بادل کی بجلی جب چاہے
جس پر چاہے گر پڑتی ہے اسی طرح اس ہاتھ کی بجلی
میرے ہاتھ پر گری۔ ایک برقی رو میرے اندر دوڑ گئی۔
اگر مقناطیسی کشش میں کسی جھپٹے کو گھمایا جائے تو اس
میں برقی رو پیدا ہو جاتی ہے۔ روز کی آنکھوں کی اس
شدت کی مقناطیسی کشش میں اس کے ہاتھوں میں میرا
ہاتھ اسی جھپٹے کی طرح گھوم گھوم کر اور گردنیں کھٹکھا کر
برقی رو پر برقی رو پیدا کیے جا رہا تھا جو میرے اعصاب پر
چھا رہی تھی۔

میں ابھی اپنے اس سانسے تجربہ پر نازاں ہوئی رہا
تھا کہ میرے کانوں میں رس گھولنے والی آواز آئی۔ ”مجھے
اچھا لگا کہ آپ کو میرا ہاتھ پسند آیا۔ لیکن اگر آپ اس کو
چھوڑ دیں تو میں دوسروں سے بھی ہاتھ ملا لوں۔“
روز کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے

گھبرا کر جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”شکریہ“ اس کی آنکھوں میں شوخی سے زیادہ کسی کو اپنی
شخصیت کے سحر سے زیر کرنے کی فتح مندی کا احساس تھا۔
میں ابھی تک ان مقناطیسی جھیلوں میں ڈبکیاں لگا رہا
تھا۔ جتنا ابھرنے کی کوشش کرتا اور ڈوب جاتا۔ پھر وہی
رس بھری آواز ”اب میرے ہاتھ خالی ہیں، پیش کروں۔“
روز اپنے شکار کو ذبح کر کے اس کے تڑپنے کے بھرپور
مزے لوٹنا چاہتی تھی۔ مگر اس نے صرف میرے دل پر
ڈاک ڈالا تھا۔ زبان پر نہیں۔

”ایک شرط پر“ میں نے کہا۔

جواب ملا ”منظور۔“

”اچھی طرح سوچ لو۔ پھر پلٹنا نہیں۔“

”سوچ لیا۔ تم شرط بتاؤ۔“

”یہ ہاتھ میرا ہو جائے گا۔ ساری زندگی میرے پاس
رہے گا، واپس نہیں ملے گا۔ تم اس ہاتھ کو کسی اور کے آگے
پیش نہیں کر سکتیں۔“
خاموشی۔

یہ میرے دل کی بات تھی مگر میرا مقصد روز کو خجل کرنا
نہ تھا۔ میں نے بات پلٹ دی۔

”تم لندن میں رہتی ہو؟“

”نہیں۔“ جواب ملا۔ ”میں کارڈف میں رہتی ہوں۔“

لندن اپنی نانی سے ملنے آئی تھی۔ وہ گھر سے باہر ہیں۔

۲ گھنٹے بعد آئیں گی۔ میں کافی پینے چلی آئی۔“

روز نے اپنے بارے میں بتانے کے بعد میرے

بارے میں جاننا چاہا۔

”تم شکل سے پاکستانی لگتے ہو مگر تمہارا بات کرنے کا

انداز اور لہجہ مختلف ہے۔ کیا تم امریکا میں رہتے ہو؟“

”اس ایک فقرے میں ۳ سوال ہیں ان کا جواب

سن لو۔ میں نے کہا پھر تفصیلی جواب روز کی خدمت میں

پیش کیے۔

”تمہارا انداز ٹھیک ہے میں پاکستانی ہوں۔ لب و

لہجہ زمانے اور وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔“

پھر تیسرا جواب ”میں امریکا کے شمال میں رہتا ہوں۔“
روز کو میری ”شرط“ کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ ”اچھا
تو تم ”اسکیمو“ ہو؟“ پھر ”اسکیمو“ کے خالی ہاتھ ہونے کی شکایت
”اسکیمو! تمہاری لومٹری کے بالوں والی ٹوپی اور ”انگو“
کہاں ہیں؟“

”ٹوپی کا تو پتا نہیں لیکن انگو تمہارے ہاتھوں کی گرمی
سے پگھل کر تمہاری آنکھوں کی جھیلوں میں بہہ گیا۔ میں
مونٹریال میں رہتا ہوں۔“

روز نے میری معلومات میں اضافہ کیا ”میں بھی

امریکا جا رہی ہوں۔“

میں سمجھا شاید میری پڑوسن بنے۔ میرے زیادہ تر

خیالات غلط نکلتے ہیں اور یہ خیال بھی غلط نکلا۔

”میرا منگیترا امریکا میں رہتا ہے۔“

کوئی اگر کہتا کہ قیامت آگئی ہے تو شاید مجھے اتنا بڑا

دھچکا نہ لگتا۔

عشق کا کارواں چلا بھی نہیں
اور ابھی سے غیار کی باتیں

کانی کا کپ میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔

”کیا ہوا؟“ روز نے شوخی سے پوچھا۔

عورت پر اگر کوئی پسندیدگی کی نظر ڈالے تو وہ اس کو

فوراً جان لیتی اور اُس کا قد اونچا ہو جاتا ہے۔ انداز میں

دلیری آجاتی ہے۔

”روز مجھے یہ بتاؤ میں نے تم کو کتنے دن پہلے کھو دیا۔“

اس کو میرے سوال پر نہ تو حیرت ہوئی اور نہ ہی وہ

اس بدتمیزی پر ناراض ہوئی۔ اپنی شوخی پر قرار رکھے ہوئے

بولی ”۲ مہینے پہلے۔“ پھر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

کہنے لگی ”اگر تم مجھ سے ۶ مہینے پہلے ملے ہوتے تو“

”آگے بولو رک کیوں گئیں۔“ میرے سوال کا

جواب ملنے سے پہلے جنید صاحب نے مجھے ٹھونکا لگایا۔ وہ

ہوٹل جانے کے لیے بے چین تھے۔ میں بادل خواستہ اٹھ

گیا۔ اٹھتے ہوئے میں نے جنید صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”کافی بہت عمدہ تھی۔ میں ۷ بجے پھر آؤں گا۔“ روز نے میری طرف معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا۔ اس کو معلوم تھا کہ شام ۷ بجے کا مخاطب کس سے تھا۔ کافی شاپ سے نکلنے ہی جنید صاحب نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ ”کیا کر رہے ہیں آپ؟“ انھوں نے پوچھا۔

”آپ کا کیا مطلب ہے۔“
”مطلب آپ خوب جانتے ہیں۔ بھولے نہ بنیے۔ آگ سے مت کھیں، جل جائیں گے۔ اپنے ساتھ روز کو بھی لے ڈوبیں گے۔ اس کی شادی ہو لینے دیں۔“
جنید صاحب شاید ٹھیک کر رہے تھے مگر میں نہ جانے کن سوچوں میں تھا۔
”میں اس کی شادی میں کیسے رکاوٹ ڈال سکتا ہوں۔“
”۷ بجے ہاتھوں لگا۔“ جنید صاحب نے جواب دیا
پھر اپنے خدشہ کا اظہار کیا ”اگر وہ ۷ بجے آگئی تو اس کی شادی نہیں ہوگی۔“

”وجہ.....“
”اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ لیجیے گا۔“
جنید صاحب نے ایسے شکار متعدد بار کھیلے تھے۔ کہنے لگے ”میں نے یہ کھیل بہت کھیلے ہیں۔ عورت جب کس کو دل دیے بیٹھتی ہے تو اس کی دلبری کا انداز ہی اور ہوتا ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ شکاری خود شکار ہو رہا ہے۔ جب شکاری خود پتھر بن جائے تو معاملہ سنگین موڑ مڑ جاتا ہے۔“

پھر جنید صاحب نے کافی شاپ سے اٹھنے کی وجہ بتائی
”میں آپ کو اس موڑ پر مڑنے سے بچا لایا ہوں۔ اس میدان میں آپ کچے ہیں۔ میں اس کا کھلاڑی ہوں۔ آپ کو صرف جہاز اڑانا آتا ہے۔ آپ وہی کیجیے۔ اس میدان کو چھوڑ دیجیے۔“
ہم واپس ہو کر پتھر چکے تھے۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے جنید صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ

رکھ کر تحفظ دیا اور بزرگانہ انداز میں درخواست کی۔ ”اس کے حال پر رحم کریں۔ ۷ بجے نہ جائیں۔“
میں وعدہ نہیں کر سکتا تھا۔ سوچ ضرور سکتا تھا۔
میرے قدم میرے دماغ کے تابع نہ رہے تھے۔
میں ۷ بجے سے پہلے ہی کافی شاپ پہنچ چکا تھا۔
ٹھیک ۷ بجے روز کافی شاپ کے دروازہ پر نمودار ہوئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر میری میز پر آکر کرسی بچھ کر بیٹھ گئی۔
”میں کافی پینے آئی ہوں۔ تم سے ملنے نہیں۔“
”جسٹ آنکھوں سے پکڑا جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا تم آؤ گی۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ مگر یہ کون سا بلانے کا وقت ہے۔ میں نانی کے ساتھ کھانا بھی نہ کھا سکی۔ اب بلا یا ہے تو کھانا بھی کھلاؤ۔“ اس کی شکستہ گفتگو پر تھی۔ پھر گھڑی دیکھ کر بولی ”ہمارے پاس ۲ گھنٹے سے بھی کم وقت ہے۔ مجھے ۹ بجے کی گاڑی سے کارڈف جانا ہے۔ کھانے کے لیے ریسٹورنٹ میں وقت ضائع نہیں کروں گی۔ یہیں کچھ منگواؤ۔“
سینڈویچ اور کافی سے فارغ ہو کر ہم لوگ سڑکیں ناپے نکل گئے۔
روز کھلی جا رہی تھی۔

ہمارے گھومنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ہر گزرتے لمحہ کو ساتھ مل کر سمیٹ لیں۔
جنید صاحب نے کہا تھا کہ اگر روز ۷ بجے آگئی تو میرا عکس اس کی آنکھوں میں ہوگا۔ گران مقناطیسی آنکھوں میں بھانکنے کی تاب نہ تھی۔ اتنا ضرور لگا کہ روز کے انگ انگ میں انبساط تھا۔
”روز۔“ میں نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم نے مقناطیسی پہاڑیوں کو جمیل میں کیسے تبدیل کر دیا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”یہ میں نے اسپیشل آرڈر پر بنوائی ہیں تاکہ تم جیسے ندیدے بچہ کو اس میں ڈبو سکوں ورنہ تم ہر گز رومری (Gorcery) سٹور میں کھٹی میٹھی گولیوں کے مرتبان میں ہاتھ ڈال کر اپنے ہاتھ گندے کرتے رہو گے۔“

ان جھیلوں میں ڈوبنے اور ڈوبنے سے بچانے کا اختیار بھی روز نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ ”میں جب چاہوں تم کو ان میں ڈبو لوں۔“ کوئی خود اعتمادی سی خود اعتمادی تھی۔ ”ایسا ڈبوؤں گی کہ بھی باہر نہ نکل سکو گے۔“
ایک دفعہ ان جھیلوں میں ڈوبنے کے بعد کافر کا دل باہر آنے کو چاہے گا۔ مگر بہر حال باہر نکلنے کی تفصیل بتانا بھی ضروری تھا۔

”صرف ایک صورت میں باہر نکل سکتے ہو۔“ وہ صورت یہ تھی ”میں خود تم کو اچھال کر باہر پھینک دوں۔“
یہ موضوع ختم ہوا اب دوسری بات۔
”تم مجھ سے اتنا دور کیوں بھاگ رہے ہو۔ میرے قریب آ جاؤ۔ میری کمر میں ہاتھ ڈالو۔ میں تمہاری کمر میں ہاتھ ڈال کر تمہارے شانے پر سر رکھ کر چلوں گی۔“

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔
فرشتوں کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ عالم بالا سے جھانک کر دیکھ رہے تھے اور میری خوش نصیبی پر رشک کر رہے تھے۔

”ذیشان۔“
”جی حضور۔“
”مذاق مت کرو۔“
”بہت بہتر۔ فرمائیے۔“

”آج میں ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے میں آج ہی پیدا ہوئی ہوں۔“
مجھے خیال ہوا کہ دودھ کی بوتل اور چوٹی خریدنے پر باہمی مشورہ کرنا چاہیے۔ مگر موقع کی نزاکت کے پیش نظر دل کی بات دل میں ہی رہنے دی۔

”لگتا ہے کہ آج میں لندن پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ بلکہ ہر چیز پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“ پھر مجھے کمرۂ امتحان میں بٹھا دیا۔ ”جانتے ہو کیوں؟“
مجھے کیا معلوم تھا کہ کیوں لیکن جواب دینا وقت کی ضرورت تھا۔ ”اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں.....“ میری بات بیچ میں کٹ گئی۔

”دلفنی بننے کی ضرورت ہے نہ ہی مذاق کرنے کی۔“
روز واقعی سنجیدہ تھی۔ ”اس لیے کہ آج میں اور تم ساتھ وقت گزار رہے ہیں۔“
بات میرے دل کو لگی۔ میری حس مزاح گہری نیند سو گئی۔ کیا میرے ساتھ بھی یہی معاملہ نہ تھا۔ کیا میں بھی یہ نہ چاہتا تھا کہ یہ لمحے ہمیشہ کے لیے ختم جائیں۔ زمین کی گردش رک جائے۔ روز کا ساتھ بھی نہ چھوٹے پائے۔
میں انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ روز نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولی ”اچھا وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ ساڑھے ۸ بج چکے ہیں۔ میری گاڑی ۹ بجے جائے گی۔ ہم کو اسٹیشن چلنا چاہیے۔“ اس کی آواز میں افسردگی تھی۔
میں نے ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی روکی۔ ”پید ٹکن اسٹیشن۔“
ہم ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔
راستے میں روز نے کہا ”ذیشان! میں اتنی خود پرست نہیں ہوں۔ اور نہ ہی اتنی شوخ۔ تم کو میری باتیں بری تو نہیں لگیں۔“
روز کی کسی بھی بات کا کسی طور برا لگنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مجھے اس کی ہر بات گوارا تھی۔ دل چاہتا تھا وہ بولتی رہے۔ میں سنتا رہوں۔ میں روز کی طرف دیکھ رہا تھا۔
”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔“ اس نے پوچھا۔
”میں چاہتا ہوں تمہارا وجود اپنی آنکھوں میں سمیٹ لوں۔“ میں نے جواب دیا۔
”تم ندیدے بچے ہو چاہتے ہو ہر میٹھی گولی تمہارے منہ میں گھل جائے۔“
”ہر گولی نہیں۔ بس صرف ایک گولی۔“ میں نے پوری سچائی سے کام لیا۔
ٹرین چلنے میں پانچ چھ منٹ رہ گئے تھے۔ روز سوار ہونا چاہتی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے اپنا منہ میرے آگے کر دیا۔ ”تم میری بہن نہیں ہو کہ میں تمہارے گال پر پیار کر کے تمہیں رخصت کروں۔“
”پھر کیا ہوں۔“ اس نے پوچھا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ ”روز“ میری آنکھوں میں التجا تھی۔ ”اگلی گاڑی سے چلی جانا۔“ میری زبان نے جو کچھ کہا۔ جب اس کو میرے کانوں نے سنا تو ان کو یقین نہ آیا۔ رخصتی کے وقت کی جذباتی باتیں مجھے بری لگتی تھیں۔ جب میری ماں مجھے کہتی ”بیٹا! ایک دن اور رک جاؤ۔“ تو میں بھڑک جاتا۔ ”یہاں بیٹھارہوں یا جا کر نوکری کروں۔“ مگر اس وقت میں خود کسی اور کو بلا مقصد روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بھی شاید صرف ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے۔

میں جب کراچی سے چل رہا تھا تو ماں نے کہا تھا ”ایک گھنٹہ بعد ہوائی اڈے چلے جانا۔“ میں نے پوچھا تھا ”کیوں؟“ تو اس نے کہا تھا ”میری آنکھوں میں ایک گھنٹہ اور ٹھنڈک رہے گی۔“ اس وقت میں نے ماں کے جذبات نہ سمجھے تھے۔

”نہیں۔“ روز نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا ”میں نہیں رک سکتی۔“ اس کی آواز میں عزم تھا۔ ”میں اپنے منگیتر سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔“ پھر شکوہ ”تم مجھ سے ۶ مہینے پہلے کیوں نہیں ملے؟“ سارا قصور میرا نکلا۔ آواز میں عزم تھا مگر آنکھوں کی کہانی کچھ اور تھی۔

دم رخصت وہ چُپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

روز نے بات بنائی چاہی۔ ”میں تم کو اپنا کارڈف کا پتا دیتی مگر اس لیے نہیں دے رہی ہوں کہ تم اگلی صبح کارڈف پہنچے ہو گے۔ ریوینو۔“ پھر اس نے ہولے سے میرے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ ”تم بھی میرے بھائی نہیں ہو۔“ پھر ایسا سوال جس کا نہ میرے پاس کوئی جواب تھا اور نہ ہی میں اس الزام کا ذمہ دار تھا ”تم کو میری زندگی میں پچھل چانے کا حق کس نے دیا تھا۔“ آنکھوں کا کاجل اور پھیل رہا تھا۔ ضبط کے ہنڈن ٹوٹ رہے تھے۔

روز نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ مگر میرے اوپر زندگی میں پچھل چانے کا الزام کیوں۔ پچھل تو خود اس نے چھائی تھی۔ مے ربجے کیوں آئی تھی۔

جنید صاحب نے کہا تھا ”اگر وہ مے ربجے آجائے تو اس کی آنکھوں میں جھانک کر اپنا کس دیکھ لیجیے گا۔“ لیکن جب ننوں میں کاجل پھیل رہا ہو تو کس دھندلا جاتے ہیں۔ میں اگر ان مقناطیسی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ بھی لیتا تو کیسے پتا چلے گا کہ یہ دھندلا ہوا عکس کس کا ہے۔ اور اس کا فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ تو جاری تھی۔

روز نے پلٹ کر میرے کوٹ کے دونوں فلیپ (Flap) اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے ”مجھے جواب دو کیوں آئے تھے میری زندگی میں پچھل چانے۔“

”تم بھی تو آئی تھیں۔“ وہ پھر گئی۔ ”کیا مجھے آنے کا حق نہیں تھا۔ تم آسکتے تھے تو کیا میں نہیں آسکتی تھی۔“ اس کی آواز میں شدت آ رہی تھی۔ ”تمہارے دل نے تمہیں مجبور کیا تم آگے۔ کیا میرا دل مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر تم دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آگے تو یہ شیولری (Chivalry) تھی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آگئی تو یہ کمزوری ہو گئی۔“

”بتاؤ! مجھے جواب دو۔“

میں کیا جواب دیتا۔ میں تو خود پگھل رہا تھا۔ روز نے میرے شانے پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔ ضبط کے سارے بند ٹوٹ چکے تھے۔ سادون بھاؤں برکھا برس رہی تھی۔ میرا کوٹ اس کے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ اس کے بالوں میں میرے آنسو تھے۔ ان پر میرا کوئی بس نہ تھا۔

گاڑی کی آواز آئی ”آل ابورڈ“ (All aboard)

(سب گاڑی پر سوار ہو جائیں)۔

روز بھاگ کر ڈبیاں میں سوار ہو گئی۔ دروازہ کھٹ سے بند ہوا۔ ٹرین حرکت میں آئی پھر پلیٹ فارم سے نکل گئی۔ یہ ٹرین پلیٹ فارم سے نکلی تھی یا میرے وجود سے۔

اس میں میرا قیمتی سرمایہ تھا جو کسی اور کے لیے تھا۔

ایشین سے باہر نکلا تو ہمزاد میرے ساتھ تھا۔ ”اداس ہو؟“ ہمزاد نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ میں اداس ہوں یا یہ احساس زیاں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تمہاری کوئی اپنی شے تھی جس کا احساس زیاں ہے۔“

”نہیں یہ شے نہیں تھی سرمایہ تھا گراں قدر سرمایہ۔“

”اس سرمایہ پر تمہارا کیا حق تھا۔“ ہمزاد نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو کیا پھر غیر کی چیز کو اپنا کہہ کر اس کے لٹ جانے کا سوگ منا رہے ہو۔“

بس ایک نگاہ میں لٹتا ہے قافلہ دل کا
سواں کو اہل تنہا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

”تم نے کیوں اس کو نگاہ بھر کے دیکھا۔“

”یہ اسی نگاہ کی سزا ہے۔“

”عقل کے ناخن لو۔“

ایسے موقعوں پر عقل کے ناخن ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ میرا اور روز کا مشکل سے گل ڈھائی گھنٹے کا ساتھ تھا۔ ڈھائی گھنٹے میں تو ٹھیک سے نفرت بھی نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ لٹ جانے کا احساس کیوں۔ پھر یہ احساس یک طرفہ بھی نہ تھا۔ لٹنے والا خود بھی لٹنے کے احساس سے دوچار تھا۔ عقل کے ناخن جھڑ چکے تھے۔ ان کا کہیں وجود نہ تھا۔

روز اس کا اصل نام نہیں۔ میں نے یہ نام فلم ٹائی ٹینک (Titanic) کی ہیروئن کے نام کی مناسبت سے بدل دیا۔ ٹائی ٹینک کی ہیروئن کا اصل نام کیٹ وینسلیٹ (Kate Winslet) ہے۔ کیٹ میں اور کارڈف کی روز میں دو قدریں مشترک ہیں۔ دونوں برطانوی ہیں اور دونوں برطانوی حسن کا بہترین شاہکار مگر کارڈف والی روز کی شخصیت کا ایک پہلو اور بھی تھا۔ جو تمکنت اور سحر انگیز رہا۔ روز میں تھا وہ مجھے کیٹ میں نہیں ملا یا شاید میرا حسن نکلن تھا۔

خیالات کا دھارا بہتا رہا، میں چلتا رہا یہاں تک کہ ہوٹل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ کل صبح مجھے مونٹریال واپس جانا تھا۔

رات بھر بے خوابی کی کیفیت رہی۔ جب کبھی آنکھ جھپکتی، روز سامنے آکھڑی ہوتی ”بتاؤ! مجھے جواب دو۔“

بتاؤ۔ جواب دو۔ جواب دو۔

میں نے بھی اس سے جواب مانگتے شروع کر دیے ”بتاؤ کیوں بنائی تھیں یہ جھیلیں۔ تم نے خود کہا تھا کہ اس ندیدے سے بچے کو ڈبوؤں گی اور ایسا ڈبوؤں گی کہ باہر نہ نکل سکو گے۔ سوائے اس کے کہ میں خود تم کو اچھال کر باہر پھینک دوں۔ بتاؤ کیوں بنائی تھیں یہ جھیلیں۔ بتاؤ جواب دو۔ مجھے اچھال کے کیوں نہیں پھینک دیتیں۔“ نہ اس کو کوئی جواب ملا اور نہ ہی مجھے۔

صبح اٹھا تو طبیعت مضطرب تھی۔ باہر جانے کا موڈ نہ تھا۔ ۳ ربجے مونٹریال کی پرواز تھی۔ ۱۱ ربجے کے قریب میں ناشتا کرنے چلا گیا۔ واپس آیا تو میرے اندر کا ضدی بچہ جاگ اٹھا۔ ”میں کارڈف جا کر روز کو تلاش کروں گا۔“ ہمزاد سامنے آکھڑا ہوا۔ ”پگل ہوئے ہو؟“

”ہاں میں پگل ہو گیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں نے ہمیشہ عقل کا کہا مانا ہے۔ وہی کیا جو درست اور مناسب تھا۔ آج میں عقل سے ناطہ توڑ لوں گا۔ میں کارڈف جا کر اس کو ڈھونڈوں گا۔ مجھے کون روکے گا۔“ اتنے بڑے شہر میں اس کو کہاں ڈھونڈو گے؟ عقل سے کام لو۔“ ہمزاد نے سمجھایا۔

میں نے بات سنی ان سنی کر دی۔ سوٹ کیس پیک کیا اور باہر نکل آیا۔ ”جیسی۔“ میں نے آواز دی۔ ”جیسی میں داخل ہو کر میں نے کہا ”پینڈنٹن ایشین۔“

”کارڈف کی ٹرین کس وقت جائے گی؟“ میں نے ایشین کے کاؤنٹر پر پوچھا۔

”آدھے گھنٹے بعد۔“

”ایک ٹکٹ دے دیں۔ لندن سے کارڈف۔ ون وے (One Way)۔“

باجی کی ترجیحات کا دلچسپ ماحبرا

بکرے کی ان

کچھ دلائل آگ کیوں لگا دیتے ہیں

انجم فاروق ساحلی

روپے میں۔“ قیمت سنتے ہی ابا جان دھک سے رہ گئے ان کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔
”ابا جان قربانی کرنے کے لیے رقم تو قربان کرنا ہی پڑتا ہے۔ اب ۲۰۰۱۰ ہزار کوئی بڑی رقم نہیں رہی۔ بچوں کی خوشی میں کسی بھی قیمت پر خرید سکتی ہوں۔“ باجی نے ابا جان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔
”لیکن بیٹی اب مہینہ بھر کا بجٹ بھی تو متاثر ہو جائے گا۔“ ابا جان نے فکر مند لہجہ میں کہا۔
”کوئی بات نہیں ابا جان۔ آپ کے علاج و معالجہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دوں گی۔“
”مگر پھر بھی بیٹا اتنے روپے! کبھی ۲۰۰۱۰ روپے میں گائے مل جایا کرتی تھی اور اب ۲۳ سو میں مرغا بھی نہیں آتا۔ اسے اوپر والے رب! تو ہی کچھ رحم کر۔“ ابا جان نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے التجائی کے گھر کے بڑھتے ہوئے اخراجات نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ جب سے انھیں ہارٹ ایکٹ ہوا تھا پر چون کی دکان بند پڑی تھی۔ اب انھیں بیٹھے بیٹھے چکر بھی آنے لگتے تھے۔ لہذا مجبوراً شر ڈاؤن کرنا پڑا تھا۔ میں نے بہت

بکرا دیکھتے ہی مجھے بھول گئے۔ باجی طاہرہ نے ایک تندرست اور بٹے کئے بکرے کو کان سے پکڑا ہوا تھا۔
”مرد بکرا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نئے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ ابا جان تیز بخار کے باوجود بستر سے اٹھ کر محکم میں شریف لائیکے تھے۔ اماں بھی بچن کے دروازے پر نمودار ہو کر پرست انداز سے آگے بڑھ چکی تھیں۔ بکرا خریدنے کا سب گھر والوں کا مطالبہ شدت اختیار کرتا چلا گیا تھا۔
ایسے میں باجی طاہرہ کو اپنی مصروفیت سے وقت نکالنا ہی پڑا تھا۔ بچے خوشی سے بکرا کو گھماتے پھر رہے تھے۔ امی کے اشارے پر بکرا کو ایک جگہ باندھ دیا گیا۔ امی، ابا اور بیٹی قابل تحسین نگاہوں سے بکرا کے جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹولنے لگے، جیسے اپنے اپنے حصے کا گوشت دیکھ رہے ہوں۔“ کتنا خوبصورت اور تندرست بکرا ہے۔“ امی نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے مسرت انگیز لہجہ میں کہا۔
”بس قسمت سے مل گیا۔“ باجی نے کہا۔ ”کتنے ہزار مل ملا؟“ ابا جان نے استفسار کیا۔ ”صرف ۲۰ ہزار

سب

..... (پ)
میں مونٹر یا ل پہنچ چکا تھا۔ روز کی یاد ابھی تازہ تھی۔
وقت کا دھارا بہتا رہا۔
آہستہ آہستہ روز میری یادوں سے دور ہوتی گئی۔
ماں کا اصرار تھا کہ گھر بسا لو۔ ماں نے لڑکی پسند کی۔
میں نے پاکستان جا کر نکاح پڑھوا لیا۔
رضیہ گھر آئی تو گھر میں زندگی کی رونقیں آگئیں۔
رضیہ نے میری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا۔ وہ میرا لباس تھی میں اس کا لباس۔
میری جھولی میں اتنی خوشیاں ڈالیں کہ مجھے شکوہ ہی نہ تھا۔
اماں ہو گیا۔
یہ سچی اور پائیدار خوشی تھی۔
صرف جذبات کا اُبال یا جوانی کا جوش نہ تھا۔
پھر خدا نے مجھے بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ میری زندگی مکمل ہو چکی تھی۔
وقت ہمیشہ ایک سانہیں رہتا۔ میرے ہستے بستے گھر کو نظر لگ گئی۔ رضیہ ٹریفک کے حادثہ میں مجھ سے جدا ہو گئی۔ بیٹا بڑا ہو چکا تھا۔ اس کی پڑھائی ختم ہو چکی تھی۔
اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ اب اس کو میری ضرورت نہ تھی۔
رضیہ کے جانے کے بعد میرے لیے مونٹر یا ل میں کوئی کشش نہ رہی تھی۔ مغرب کی بے معنی چمک دیک والی مادی زندگی سے دل بھر چکا تھا۔ وطن کی مٹی یاد آتی تھی۔
میں پاکستان واپس آ گیا۔
بیٹے کی چھٹیاں تھیں۔ وہ مجھے سے ملنے کراچی آیا ہوا تھا۔ آج اس کی واپسی تھی۔ نیکی دروازہ پر کھڑی تھی۔
”بیٹا!“ میں نے التجائی ”ایک دن اور رک جاتے۔“ وہ جھجھکا گیا ”یہاں رکوں یا وہاں جا کر نوکری کروں۔“
ماضی میری آنکھوں میں ٹھوم گیا۔ ماں کی آواز گونجی ”ایک گھنٹہ بعد جاؤ گے تو میری آنکھیں ایک گھنٹہ اور ٹھنڈی رہیں گی۔“
ماں اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

نکلتے کر میں پلیٹ فارم پر اسی جگہ آکھڑا ہو گیا جہاں میں اور روز کل رات کھڑے تھے۔ فرق صرف اتنا سا تھا کہ آج روز میرے ساتھ نہ تھی۔
کل کا منظر میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔
روز اسی پلیٹ فارم پر ہنستی ہوئی آئی تھی اور روتی ہوئی گئی تھی۔ میرا کوٹ اس کے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔
اس کے بالوں میں میرے آنسو تھے۔ ان پر میرا کوئی بس نہ تھا۔
گاڑی چلنے میں ۱۰ منٹ رہ گئے تھے۔ میں وہ جگہ ابھی نہ چھوڑنا چاہتا تھا جہاں روز کھڑی تھی۔ پھر وقت پورا ہو گیا۔
گاڑی کی آواز آئی ”آل بورڈ۔“
میں نے سوٹ کیس اٹھایا۔ دروازہ کھٹ سے بند ہوا۔ ٹرین حرکت میں آئی۔ پھر پلیٹ فارم سے نکل گئی۔
میں ٹرین کو پلیٹ فارم سے باہر نکلنے دیکھتا رہا۔
یہی ٹرین تھی جو کل روز مجھ سے دور لے گئی تھی۔
روز میری نہ تھی۔ وہ کسی کی مانگ تھی۔
میرا کوئی حق نہ تھا کہ میں دوبارہ اس کی زندگی میں پلچل چانے کا رڈف جاتا۔
میں نے اپنا سوٹ کیس تھاما اور اسٹیشن سے باہر آکر نیکی کو آواز دی۔
نیکی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیور سے کہا ”ہیتھرو“
(Hertrow) (لندن کا ایئر پورٹ)۔
نیکی ہوائی اڈے کی طرف جاری تھی۔
میرا دل کا رڈف میں تھا۔
اگر مجھے یہ حق نہ تھا کہ میں روز کی زندگی میں پلچل پیدا کروں تو روز کو کس نے یہ حق دیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کا کاجل میری آنکھوں میں پھیلائے۔
دل تو اپنا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

کوشش کی دکان چلانے کی لیکن اپنے تحقیقی مزاج اور نرم طبیعت کی وجہ سے بری طرح ناکام ہو کے الگ بیٹھ گیا تھا۔ چرب زبان لوگوں نے ادھار لے کر خسارے میں مبتلا کر دیا تھا۔ باجی میڈسن کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایڈورٹائزمنٹ کے شعبہ کی انچارج بن چکی تھیں۔ لہذا انھیں ایک اچھی تنخواہ ہر ماہ مل جایا کرتی تھی۔

میں کہانیاں لکھ کر تقوڑا بہت کم لیتا تھا۔ گھر میں مرکزیت باجی کو حاصل تھی اور مجھے تو اکثر اوقات آڑے ہاتھوں لیا جاتا تھا۔

”ہر وقت سوچوں میں گم رہنا، نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا، نہ کوئی امنگ نہ ترنگ اور ظاہر لڑکی ہو کر سارے گھر کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، اور تم؟“ ماں کی باتیں میرے سینہ میں سلگتی ہوئی مرچیں بھر دیتیں تو میں کراہ اٹھتا اور اپنی صفائی پیش کرتا، ”دیکھنا اماں ایک دن میرا شمار بھی ملک کے صف اول کے ادیبوں میں ہو گا۔ ناشر میری کہانیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا کریں گے۔ پھر اس گھر کا اندھیرا دور ہو جائے گا۔“ اماں خاموش تو ہو جاتی لیکن اندر ہی اندر کھولتے ہوئے لاوا کو روکنا ان کے بس میں نہ تھا۔ سب کو یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ باجی کی شادی کے بعد اس گھر کا کیا بنے گا۔

میں کتنی دیر سے کھڑا ای اور چھوٹی بہنوں سے چائے بنانے کی درخواست کر رہا تھا، لیکن بکرا گھر بھر کی توجہ کا مرکز اس طرح بنا ہوا تھا کہ کسی نے میری طرف توجہ دینے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ مسلسل دماغ سوزی سے میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔

میں نے خود ہی کچن میں جا کر چائے بنالی اور اسٹڈی روم کی طرف چلا گیا۔ ہاتھ بڑھا کر سوچ گئے آن کیا تو کمرہ روشن ہو گیا لیکن دل اب بھی سا گیا۔ غربت فن کا مذاق اڑا رہی تھی اور باہر باجی کی جب سے نئے نئے رنگ برنگے نوٹ اس طرح اچھل اچھل کر باہر نکل رہے تھے جیسے ان کے پر نکل آئے ہوں۔ عید کی تقسیم ہو رہی تھی اور بچوں کے شور و غل نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مجھ پر اضطرابی

کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے ٹیبل لیپ کی روشنی میں ایک کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ابھی ۲۰۱۵ء میں گزرے تھے کہ اچانک کھلی کھڑکی سے ایک بکرا اور ایک بچہ کا سر نمودار ہوا اور بکرا کی جذباتی صدائے میرا سارا مہم غارت کر دیا۔ میں نے جھنجھلا کر زور دار آواز کے ساتھ کھڑکی کو بند کر دیا۔ اتنے میں میرا چھوٹا بھائی آصف کچہ دیر کے لیے واش روم میں چلا گیا۔ اسی اثناء میں کمرے کے باہر کاریڈور سے گزرتے ہوئے میرے سب سے چھوٹے بھائی سجاد کے ہاتھ سے بکرا چھوٹ کر کمرے میں گھس آیا اور زور سے میری رائٹنگ ٹیبل سے ٹکرایا۔ اور میری کتابیں، رسالے، روشنائی کی کھلی دوات اور دوسری مختلف اشیاء اچھل کر ادھر ادھر جا پڑیں۔ آصف نے غسل خانہ سے جھانک کر دیکھا تو ٹیلی روشنائی کا سیلاب فرش پر بہہ رہا تھا۔ وہ تیزی سے کتابوں کو روشنائی سے دوار دار ہونے سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحہ نامعلوم بکرا نے ایک زور دار ٹکر اس کی کمر پر رسید کی۔ جو اس اچانک حملہ کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ دھکا کھا کر فرش پر لڑھک گیا۔ بکرا کمر کی سیاحت کرتے ہوئے اچھل کر کرنے لگا۔ پھر ایک جگہ دیوار پر آویزاں آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر غضب ناک آواز کے ساتھ ایک ٹکر شیشہ دے ماری۔ آئینہ چور چور ہو گیا۔ سجاد نے اور میں نے بے شکل اس وحشی کو قابو کیا۔ پھر سجاد اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گیا۔ اس نے بچوں کو بھی خوب کھری کھری سنائی اور ایک دو کے کان بھی مروڑے کہ اب تک اس کو باندھا کیوں نہیں گیا۔

عید الاضحیٰ کی نماز ادا کرتے ہی مجھے قصاب کی تلاش میں نکلنا پڑا۔ کیونکہ گھر والے گوشت اور نوکری کھال کی منتظر تھی۔ فقیر دوسرا مسکین بھی دروازہ کے ارد گرد منتظر رہے تھے۔ کیونکہ پڑوسیوں کے دو عدد بکروں کی جذباتی آوازیں انھیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہمارے اور پڑوسیوں کے بکروں میں شاید میانے کا مقابلہ ٹھن گیا تھا۔ پھر اچانک پڑوس کے ایک چھترے کے ذبح ہونے کی

یہ ایک آواز نے ہمارے کمرے کو شدید ہيجان میں مبتلا کر دیا۔ وہ رتی تر دوا کر بھاگنا چاہتا تھا اور سب بچے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پتیلیاں دے رہے تھے۔ میں نے قصاب کی دکان پر پہنچا۔ قصاب صاحب بہت مصروف دکھائی دے رہے تھے اور موہاں پر کسی سیٹھ کو جلد جلد پہنچنے کی یقین دہانی کرا رہے تھے۔ اتنے میں ایک چچا رو قصاب کے قریب آ کر رک گئی۔ قصاب نے چچا رو کو دیکھ کر موہاں بند کر دیا اور چچا رو سے اترنے والے تاجر کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ ”آئیے“ آئیے ملک صاحب! بس میں پہنچنے ہی والا تھا۔ ملک صاحب نے بڑی فرعنیت سے گردن کو خم کر کے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم نے پچھلی بار بھی میرا سارا پروگرام خراب کر دیا تھا۔ چلو! فوراً میری گاڑی میں بیٹھو۔“ اس لمحے گاڑی سے سنار تاجر کا بڑی بڑی مونچھوں والا خوفناک ہاڈی گاڑ اپنی گن کی جھلک دکھا کر قصاب کو گھورنے لگا۔ قصاب محلے داروں سے جان چھڑا کر چچا رو کی طرف بڑھ گیا، اور میں منہ دیکھتا رہ گیا۔ اگرچہ میری بہن ظاہر نے بھی ایک قصاب سے بات چیت کر رہی تھی لیکن وہ بے چارہ بدستی سے ٹرین کے ایک حادثہ میں زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا۔

ای نئے یہ کام میرے ذمہ لگا دیا گیا تھا۔ میں نے بہت نہیں باری اور برابر قصاب کے تلاش میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ادھر ادھر بھٹکتا ہوا اپنی منگیت نادی کی گونجی کے سامنے جا پہنچا جس کا گیت اس وقت کھلا ہوا تھا۔ نادیہ کے والد ظہیر فاروقی صاحب قصاب کو رخصت کر رہے تھے۔ میں فوراً آگے بڑھا۔ یہ سنہری موقع تھا۔ کم بخت قصاب نے ان کے دن وی آئی پی بنے ہوئے تھے۔

اس لمحہ میری منگیت کے والد مجھے دروازہ کے اندر نظر آئے۔ ”السلام علیکم اکل! عید مبارک۔“ میں نے ”آگے“ اشارت سے ہونے کہا۔ ”بیلو فاروق! کیسے ہو عید مبارک۔“ اتنے میں نادیہ جو گوشت کے ڈھیر کے پاس کھڑی تھی اس سے بات کر رہی تھی، میری آواز سن کر تیزی سے

قریب آ گئی۔ میں نے اسے بھی عید کی مبارک باد دی۔ ”خیر مبارک کہتے ہوئے وہ مٹی خیز انداز میں مسمکرائی۔ وہ میک اپ اور عید ڈریس کے بغیر ہی سادگی اور قدرتی حسن کا نمونہ دکھائی دے رہی تھی۔ سرخ و سفید رنگت، روشن چہرہ، گداز بدن، لمبے گھنے سیاہ بال۔ ایک لمحہ کے لیے تو میں چاند ستاروں کی دنیا میں چلا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے اس دنیا سے دور اڑتے چلے جا رہے ہوں۔ وجد اور سرور کا ایک عجیب عالم تھا۔ ہم پھولوں سے سجے ہوئے راستہ پر دوڑتے چلے گئے۔ اچانک اس حسین اور خوبصورت تصور کو قصاب کی موٹر بائیک کی کھاسی نے منقطع کر دیا۔ میں حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا، روح کا گداز ختم ہو چکا تھا۔ نادیہ پوچھ رہی تھی ”پ لوگوں کا بکرا ذبح ہو چکا؟“ ”نہیں اچھی نہیں۔ میں تقریباً ۲ گھنٹے سے قصاب کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں۔“ میں نے مایوس لہجہ میں کہا۔ ”کوئی بات نہیں ابھی لو۔“ نادیہ نے قصاب کو روک لیا۔ ”بی بی جی میرا وقت بہت قیمتی ہے۔“ قصاب نے کھسکا چاہا۔

”وقت کی ایسی کی تھی نور محمد! ان کے ساتھ جا کر ان کا بکرا بھی جلدی سے ذبح کر آؤ۔“ نادیہ نے تمکمانہ لہجہ میں کہا۔ ”بی بی اگلا بکرا تمھارا صاحب کا ہے وہ میری کھال کھینچ لیں گے۔“ قصاب منت ساجت کرنے لگا۔ ”نور محمد! بہانہ نہیں چلے گا، یہ میرا کارڈ لے لو یہ انھیں دکھا دینا۔“

نادیہ نے ”دنیا کرائم رپورٹر“ کا رڈ قصاب کو تھما دیا۔ فاروقی صاحب ایک طرف کھڑے خاموشی سے اس ساری گفتگو کو سن رہے تھے۔

”بی بی جی میں لیٹ ہو جاؤں گا، میں ایڈوانس لے چکا ہوں پلیر آپ ضد نہ کریں۔“ قصاب منمنایا۔

”نہیں نور محمد ابھی اور اسی وقت جاؤ، اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ تمھاری دکان کے نزدیکی تھانہ میں گوشت مہنگا بیچنے والوں کی لسٹ آچکی ہے اور بمشوریت

کے ہمراہ بقر عید کے فوراً بعد چھاپہ پڑنے والا ہے اور ان قصابوں میں تم سر فرہست ہو۔ اگر تم فاروق کے ساتھ نہ گئے تو پھر مجھ سے لحاظ داری کی توقع نہ رکھنا۔“ نادہ نے اسے کھری کھری سنا دیں۔ قصاب ایک لمحہ کے لیے لرز کر رہ گیا۔ وہ بازار کا سب سے مہنگا قصاب تھا۔ چند لمحے وہ متفکر کھڑا اپنی موٹر بائیک کی طرح خود بھی کھانستا رہا۔ پھر بادل خواستہ میرے ساتھ روانہ ہو گیا۔

قصاب تیزی سے اپنا کام سرانجام دے رہا تھا۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار تھے لیکن اسے کام میں مہارت حاصل تھی۔ اس نے فون کر کے اپنے ماتحت کو بھی بلوایا تھا۔ کام ختم کرتے ہی قصاب کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا اپنا معاوضہ وصول کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ اب اہم مرحلہ گوشت کی تقسیم کا تھا۔ امی جان نے چھوٹی بہنوں کی مدد سے جمع شدہ گوشت کے ڈھیر میں سے کچھی، گردے، رانیں، چانپیں اور دوسرا بہترین گوشت الگ کیا اور انھیں لفافوں میں بند کر کے فریزر میں رکھا۔ باقی رہ جانے والا بڈیوں سے بھرا گوشت رشتہ داروں واقف کاروں اور مسالین کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ طاہرہ باجی تسکین اتار رہی تھیں۔ اماں کڑا سی گوشت، بیخ کباب، بریانی، قورمہ اور دوسرے لذیذ پکوان کی تفصیل سے بچوں کے شوق کو دو بالا کر رہی تھیں۔ اوجھڑی ایک جھدار کے لیے شاید لفافہ میں ڈال کر الگ رکھ دی گئی تھی۔ کھال ایک بیوہ کے قبضہ میں چلی گئی تھی، جو امی کی پرانی سہیلی تھی۔ گوشت کی نامناسب تقسیم پر مجھے آگے بڑھنا پڑا۔

میں نے آگے جا کے لفافہ ایک طرف رکھوا دیے۔ بچے حیرت سے اماں کا منہ دیکھنے لگے۔

”امی جان اگر آپ قربانی کے فلسفہ سے واقف ہیں تو آپ کو گوشت کی تقسیم منصفانہ کرنی چاہیے۔ قربانی تقویٰ اور قرب الہی کا ذریعہ بنتی ہے، لیکن اس کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو سارا سال گوشت نصیب نہیں ہوتا، جو قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے، ان میں قربانی کا

گوشت پہلے تقسیم کیا جائے پھر کسی دوسرے مصرف کے بارے میں سوچا جائے۔ لیکن آپ نے تو سارا اچھا کرنا گوشت چھانٹ کے فریزر کی زینت بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس طرح قربانی کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ صرف گوشت خوری کی رسم ادا ہوتی ہے۔“

میرا لکچرسن کرامی جان کا منہ پھول گیا۔ ”فاروق کیسی نادانی کی باتیں کرتے ہو جس نے ۲۰ ہزار روپے خرچ کر کے اہتمام کیا ہے۔ اسے ۲ دن اچھا کھانا بھی نصیب نہ ہو۔ پھر ڈاکٹر نے مجھے بھی گوشت کی کچھی مشورہ دے رکھا ہے۔ آخر ہم اپنی ضرورت کس طرح پوری کر سکتے ہیں اگر صرف دوسروں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیں؟ جو گوشت بیچ گیا ہے وہ لوگوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ تمہیں جو چاہیے وہ لے لو۔“ امی جان نے غصیلے لہجے میں کہا۔ امی لایے ایک ران مجھے دے دیجیے۔ میں اسے نادہ کے گھر دے آتا ہوں۔“ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ران؟ امی نے لفظ کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔ ”فاروق بیٹا تمہیں اچھی طرح معلوم ہے رانیں تمہاری باجی کے ڈائریکٹرز کے گھروں میں بھجوائی جائیں گی جنھوں نے اس عید پر خصوصی بونس دیا ہے۔“ امی جان نے خشک لہجہ میں کہا۔ ”اور امی جان جنھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے قصاب کو باند کر کے ہمارے گھر روانہ کیا وہ ایک ران کے بھی مستحق نہیں!“ امی کے دلائل سن کر میرے سینہ میں آگ سی لگ گئی۔ ”فاروق؟ بیٹا ضد اچھی بات نہیں، پھر لڑکیو! رانیں اٹھا کر فریزر میں رکھو۔“ امی جان نے جھٹکنا لہجہ میں کہا۔

اس وقت میرا بچپن کا جگری دوست ڈاکٹر مصطفیٰ بکرے کی ران لے کر آگیا اور مجھ سے عید مل کر میری سے آگے روانہ ہو گیا۔ میں نے سب کے سامنے بکرے کی تازہ اور فرہ ران کو نمایاں کرتے ہوئے لہرایا اور پھر باجی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ امی جان اور بچے مجھے گھر گھر کر دیکھیں۔ ہم سب کی اپنی اپنی ترجیحات تھیں۔ ورنہ عید تو ہر سال آتی ہے۔

شناخت

بے تاب ممتا کی دستک کی کہانی
سننے والے نے اسے اُن سنا کر دیا ہوتا

غلام سکینہ شیخ

انتخاب: محمد زمان خٹک
کربوٹہ شریف، ہنگو

کبھی زخمی کر دینے والی
یادیں بھی فیصلوں کی
راہ میں آتی تھتی ہیں



مہاراج.....
کرکٹ کے
ساتھ کبڈی
بچپن پر بھی پابندی کا نعرہ دے گئے
یہ پاکستانی کسی نہ کسی کھیل میں
جیتنے کا راستہ نکال لیتے ہیں

ملک صاحب! شکریہ ادا کرتے
ہوئے کوئی نہیں روتا، ضرورت
نے وہاں بھی موبائل فون اور
موٹر سائیکل بند کرادیے ہوں گے



مشر پر یڈیٹ.....!
پلیز جلدی سے بتائیے،
دوسری بار صدر کیسے
بنتے ہیں؟.....؟



میرا معمول تھا۔ میں روزانہ وہاں سے گزرتی تھی۔ اخبار پڑھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ کوئی زمانہ تھا کہ میں اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ یاد بھی کرتی تھی۔ کوئی بھی خبر اگر مجھ سے کوئی پوچھتا تھا تو میں پوری خبر سن دیتی تھی بلکہ یہ بھی بتاتی تھی کہ کس صفحے، کون سے کالم اور کتنی سطروں پر یہ خبر مشتمل ہے۔

لیکن آج کل میں نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے، اس لیے کہ اخبارات میں تو ڈاکوں، چور یوں، قتل و غارت، جنگوں، اغوا، قیدیوں کی آموں، ماتم کرتی ہوئی بیواؤں کی فلک شکاف چیخوں، بھوکے دھاکوں سے بھری ہوئی لاشوں اور سستی سانسوں کے سوار کھا بھی کیا ہے۔

اس قسم کی خبریں پڑھنے کے بعد آنکھیں از خود آسمان پر رب جلیل کی طاقت کو جوش دلانے کے لیے اٹھ جاتی ہیں۔ اف خدا یا! یہ قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس لیے میں نے اخبار نہ پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے اور آج تک اس فیصلے پر قائم ہوں۔

”آج کا تازہ اخبار“ صدائیں لگاتا، گاڑی کے اندر جھانک کر اخبار والا ہاتھ اندر کر کے میری طرف اخبار بڑھاتا ہے تو اس کی اس جرأت پر میں حیران ہونے کے بجائے خوشی سے پرس میں سے پیسے نکال کر اس کی پھٹی برکتھی ہوں اور پیسے لے کر اس کے چہرے پر جو میٹھی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے، بس وہ میٹھی مسکراہٹ دیکھنے کے لیے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں روزانہ اخبار لینے کے لیے ”بابو“ کے سامنے جا کر گاڑی روکتی ہوں۔

اس نے میرے پوچھنے پر مجھے بتایا تھا کہ اس کا نام ”بابو“ ہے۔

دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ دو سال پہلے اس کا ماموں مر گیا جو اس کے والدین کی موت کے بعد واحد سہارا تھا۔ اس کی ممانی کی اتنا پر اخبار والے نے اسے اپنے پاس نوکری دی تھی۔ روزانہ جو ار پیسے کماتا تھا وہ ممانی کی پھٹی پر رکھتا تھا۔ ممانی بھی مختلف گھروں میں جھاڑو پونچھا کرتی

تھی۔ دن بھر کی تھکن دونوں کے پیٹ کی آگ بجھانے ہوئے زندگی کی گاڑی کو آگے کی طرف دھکیل دیتی تھی۔ بابو شکل صورت سے کسی امیر کبیر خاندان کا چشم و چراغ لگتا تھا۔ چہرہ اتنا حسین کہ بیان سے باہر رنگ سفید دودھ کی طرح، بڑی بڑی کالی آنکھیں اس کے چمکتے ہوئے چہرے کا مکمل حسن تھیں۔ میں دیکھ کر اکثر سوچتی تھی کہ بابو کی امیر گھرانے کا ہی چشم و چراغ ہے۔ اس کے چہرے پر غربت والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میں ہمیشہ اسے مسکراتا پاتی تھی۔ ہمیشہ خوش اور مطمئن۔ کبھی کبھی نہادھو کر اچھے کپڑے پہنتا تھا تو بالکل شہزادہ لگتا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ بابو میری کمزوری بن گیا۔ میں بابو کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل سمجھنے لگی۔ جب تک بابو کو نہیں دیکھتی تھی تب تک مجھے جین ہی نہ آتا تھا۔ بابو میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون بن گیا شاید اس لیے کہ میں بے اولاد تھی۔ شادی کو عرصہ گزر گیا، مگر میں اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی۔ بابو کو دیکھ کر میرے اندر کی مانتا جاگ اٹھی۔ یہ حقیقت تھی کہ خاندان کے کسی بھی بچے کو دیکھ کر میرے دل میں کشش محسوس نہیں ہوتی تھی اور بابو دیکھتے ہی میں اپنے بس میں نہیں رہتی تھی۔ اس کا باب شاید بابو کی معصومیت بھری خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

جیسے جیسے دن گزرتے رہے ویسے ویسے بابو میرے بہت قریب آتا گیا، سانسوں اور رگوں سے بھی بہت قریب۔ ایک دن ہمت کر کے بابو کو ہاتھ سے پکڑ کر گاڑی کی سیٹ پر اندر بٹھایا۔ پہلے اس سے اخبار لیا۔ پیار سے اپنے بازوؤں کے حصار میں بھر کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا:

”بابو! تم میرے ساتھ چلو گے؟ میرے ساتھ رہو گے؟“

میرے گھر میں چل کر بالکل میری اولاد کی طرح۔ میں اپنی اتنا پیار دوں گی، اتنا پیار دوں گی کہ تمہارے تصور سے بھی زیادہ۔ میرے پاس دنیا کی ہر نعمت ہے سوائے اولاد کے۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے میری جان، میرے اندر کی مانتا جاگ اٹھی ہے۔ (بابو بغیر کسی تاثر کے سن رہا تھا) اب میں

تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بتاؤ بیٹا! بولو میری جان! تم میرے ساتھ چلو گے؟ میں تمہیں ماں کا پیار دوں گی جو تم سے بچپن میں ہی چھین لیا گیا ہے۔ میں تمہارے ہر زخم پر مرہم رکھوں گی۔ میں تمہاری تمام محرومیاں دور کر دوں گی۔ میں تمہارے قدموں میں دنیا کی ہر آسائش رکھوں گی۔ کہو بیٹا! تم چلو گے میرے ساتھ؟ دیکھو بابو، دیکھو میری جان! انکار نہ کرنا۔ میں بڑی امید سے آئی ہوں، مجھے مایوس نہ کرنا، ہاں کہو بابو، ہاں کہو!

بابو نے عجیب نظروں سے مجھے گھورا اور بیزار ی سے پہلو بدل کر کہا:

”تمہیں بیگم صاحبہ! میں ایک دفعہ پھر اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتا۔ ایک دفعہ پہلے بھی بچپن میں آپ کی طرح ایک امیر بیگم صاحبہ میری ماں کے مرنے کے بعد ممانی سے مجھے زبردستی مانگ کر لے گئی تھیں۔ میں نے اپنی زندگی کے حسین ترین دن ان کے ساتھ گزارے۔ میں ان کے بغیر اور وہ میرے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ ہاں بیگم صاحبہ! ہم دونوں کی ایک دوسری میں جان تھی۔ میں مانتا کا بھوکا تھا اور وہ اولاد کے لیے ترسی ہوئی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ پھر کیا ہوا، ۲ سال کے بعد انہیں اللہ نے اولاد جیسی نعمت سے نوازا اور میری تقدیر نے پلٹا کھایا۔ جیسے جیسے دن گزرتے رہے، میں مانتا کی کوئی گرمی سے محروم ہوتا گیا۔ اپنی اولاد پھر اپنی ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ! میں پرانی اولاد تھا، کب تک، آخر کب تک مجھے کوئی حقیقی محبت دے سکتا تھا؟ آخر ایک دن وہی ہوا جس کا مجھے دور تھا۔ ہاں بیگم صاحبہ! میں اس گھر سے دھکے دے کر نکلا گیا۔ جس گھر میں کچھ دن پہلے میں شہزادوں کی طرح رہتا تھا، جہاں میری خوشیوں کا خیال سانسوں سے بھی زیادہ رکھا جاتا تھا، اب وہاں میرے بچتے ہوئے آنسوؤں کو کسی نے بھی اپنے دامن میں جذب نہیں کیا جو میری بربادی کا ماتم کر رہے تھے۔“

”ہاں بیگم صاحبہ! میں اس گھر سے نکل آیا اور کسی نے مجھے نہیں روکا۔ کسی نے بھی نہیں کیونکہ اب انہیں میری

ضرورت نہیں رہی تھی۔ مجھے عارضی زندگی کی عارضی خوشیاں نہیں چاہئیں کیونکہ آپ امیر لوگ، چند دنوں کی خوشیاں دے کر غریبوں کے جذبات سے کھیل کر پھر دھتکار دیتے ہو۔ جب اللہ آپ امیروں کو اپنی حقیقی اولاد سے نوازتا ہے تو آپ کے اندر کی اصلی مانتا جاگ اٹھتی ہے اور پھر آپ امیر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ آپ کے اس رویہ سے ہم غریبوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ ہمارے اندر کا انسان ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چورے کی طرح اپنی ہستی کھو بیٹھے گا۔ ہماری شخصیت ہمارے لیے ہی اجنبی بن جائے گی۔ ہم اپنے آپ کو ٹھنڈ دکانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ زندہ وجود ہوتے ہوئے بھی لاش بن جائیں گے۔“

”خدا کے لیے!“ بابو نے دونوں ہاتھوں کو ایک اوڑھ کے ساتھ جوڑتے ہوئے کہا:

”بیگم صاحبہ! ہم سے ہماری یہ غربت والی شناخت نہ چھینے۔ ہم غریب ایسے ہی خوش ہیں، بہت خوش۔ ہمیں غربت والی خوشیوں میں ہی رہنے دیں۔ ہمیں امیروں کی طرح مصنوعی خوشیاں نہیں چاہئیں، نقلی اور جھوٹی، پل میں چھنے والی جن کی کوئی گاڑی نہ ہو۔ ہم کیا جائیں ایسی خوشیوں کو۔ ہم ایسے ہی خوش ہیں۔ ہزار بار خوش ہیں۔“

وہ مسلسل کہہ رہا تھا:

”مجھے افسوس ہے بیگم صاحبہ کہ میں آپ کی خواہش پوری کر کے ایک دفعہ پھر اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتا۔“

بابو نے پر وقار طریقے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے خدا حافظ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بابو کی کوئی بھی بات مجھے جھوٹی نہیں لگی۔ اس کا لفظ لفظ سچ تھا، مکھلا سچ۔

”آج کا تازہ اخبار“ بابو مختلف آوازیں دیتا ہوا آنے چاہیواں گاڑیوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔

اس کی چال میں وقار تھا، اس کی آواز میں اعتدال تھا، اس کے چہرے پر اطمینان، سکون اور خوشی کی مسکراہٹ تھی۔ بابو پر آخری نظر ڈالتے ہوئے میری پلکوں پر دیر سے رکے ہوئے آنسو گالوں سے گزرتے ہوئے میری جھولی میں جذب ہو گئے اور میرا سر شرم سے جھک گیا۔

ایک دردمند دل کی پرکار
جسے یہ بے پردی ایک آنکھ نہیں بھاتی

عمر میرے تھکے مگر...

ڈاکٹر منصور احمد مجاہد

اُن بے چاروں کی کثرت کیوں ہے
جنہیں اپنی آزادی چھین جانے کا احساس
ہی بہت تاخیر سے ہوتا ہے

کیا کھانا ہے، کیا پڑھنا ہے، کیا پہننا ہے، کس کے ساتھ جانا ہے، کس کی عزت کرنی ہے، کس سے منہ بنانا ہے، کس کے سامنے جھکتا ہے، کسے جھکا نا ہے، ہمارے تو سارے ہی اہم اور غیر اہم فیصلے عمر بھر دوسرے کرتے ہیں

یوں

تو انسان کی زندگی غلط فہمیوں سے ہی عبارت ہے مگر سب سے بڑی غلط فہمی جس کا شکار وہ تمام عمر رہتا ہے یہ ہے کہ یہ زندگی اس کی اپنی زندگی ہے، عمر اس کی اپنی عمر ہے، خوشیاں اور غم اس کے اپنے خوشیاں اور غم ہیں۔ اپنی مرضی سے تو خیر آج تک کسی کو اس دنیا میں آنے کی توثیق ہوئی نہیں، دنیا میں وارد ہونے کے بعد بھی تا دم مرگ جو کچھ وہ کرتا ہے اس میں بھی اس کا عمل دخل کم ہی ہوتا ہے۔ نومولود تو خیر نومولود

ہوتا ہی ہے کہ جہاں ڈال دیا پڑا رہا جو منہ میں کسی نے ڈالا اس نے لگنا شروع کر دیا کسی نے ہنسا دیا تو ہنس پڑا رلا دیا تو رو پڑا مگر ذرا ہاتھ پاؤں اور دماغ چلانے کی صلاحیت مل جائے تو تیب بھی اس رولٹ کو دوسرے ہی چلاتے ہیں۔ کیا کھانا ہے کیا نہیں کھانا کب سونا ہے کب جاگنا کب کھینا ہے کب پڑھنا ہے کس کا ادب کرنا ہے کس سے بے ادبی سارے فیصلے ارد گرد کے بڑے بوڑھے ہی کرتے ہیں جن کے قابو میں وہ قسمت سے آ جاتا ہے۔ ابھی بمشکل تین سال کا ہوتا ہے کہ ایک اور

ریہوٹ کنٹرول اپنا کام شروع کر دیتا ہے اور زندگی دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔
سکول میں زندگی کو پیچھے کنٹرول کرتا ہے اور گھر میں ماں باپ، دونوں جگہ کوشش بس یہی ہوتی ہے کہ کوئی کام اپنی آزاد مرضی سے نہ کر سکے۔ صبح کتنے بجے اٹھنا ہے ناشتہ کیا اور کیسے کرنا ہے سکول میں کیا لے کر جانا ہے بے گناہ کا بوجھ کتنا ہوگا کون سی کتابوں سے مغر مارنا پڑے گا کن ساتھیوں کے ساتھ کھینا ہوگا کس استاد کے آگے پر نہیں مارنا کس استاد کو پڑھانے نہیں دینا۔ بریک کے دوران کس کینٹین سے کیا اور کتنے میں لینا ہے اس کا فیصلہ بھی سکول والے ہی کرتے ہیں۔ مبادا وہ گھر پہنچ کر سکول کی گرفت سے آزاد ہو جائے اسے اتنا ہوم ورک ضرور دے دیا جاتا ہے کہ جس کی وجہ سے اسے بار بار سکول یاد آتا ہے۔ اس دوران ماں باپ بھی اپنے فرائض بزرگی سے غافل نہیں رہتے، ”بیٹا جلدی سے ہوم ورک کرلو“، ”ٹی وی کے سامنے زیادہ دیر نہ بیٹھو“، ”کھیل کود میں وقت ضائع نہ کرو“، ”فضول چیزیں مت کھاؤ“، ”بڑے بھائی کو تنگ مت کرو“، ”کھیل کود میں وقت ضائع نہ کرو“، ”چھوٹی بہن کے پاس شور مت کرو“، ”جلدی سو جاؤ صبح جلدی اٹھنا ہے“، وغیرہ وغیرہ جانے کتنی ہدایات ہر قدم اور ہر لمحہ جاری ہوتی رہتی ہیں۔
اتفاق سے گھر میں بڑا بھائی اور بہن ایک دو بزرگ ازقم داد، دادی، نانا، نانی یا خالہ پھوپھی بھی ہوں تو پھر کچھ نہیں آتی کہ اتنے زیادہ ڈائریکٹروں کی موجودگی میں زندگی کی فلم چلے گی تو کیسے اور چلے گی تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا۔ بعض اوقات یہ بد قسمتی بھی ہوتی ہے کہ ایک ڈائریکٹر زندگی کو مشرق کی طرف کھینچے کی کوشش میں لگا ہوتا ہے تو دوسرا مغرب کی طرف، کوئی ایکسپلرڈ دبا رہا ہوتا ہے اور کسی نے بڑے بریک پر پاؤں رکھے ہوئے ہوتے ہیں، کوئی سٹریٹنگ کو دائیں طرف گھمانے پر زور لگا رہا ہوتا ہے تو دوسرا بائیں طرف۔ ایک کلچ چھوڑتا ہے تو دوسرا لکیر لگا دیتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی کی گاڑی پٹری

سے اتر کر شال یا جنوب کی طرف نکل کر کسی نہ کسی دلدل میں پھنسی کھڑی ہوتی ہے۔ اور سارے ڈائریکٹر ارد گرد کھڑے لعنت ملامت کر رہے ہوتے ہیں کہ ”ہم نہ کہتے تھے یہ نہ کرو ورنہ وہ ہو جائے گا۔“ ”ادھر نہ جاؤ ورنہ ادھر نکل جاؤ گے۔“ ”باز آ جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔“ ”لو پچھ لو آج مزہ۔“
ہماری رائے میں زندگی کا آزاد ترین دورانیہ کالج یا یونیورسٹی کا ہوتا ہے جب انسان اگر پڑھنے پڑھانے اور ”میں ڈاکٹر بن کر اپنی قوم کی خدمت کروں گا“ یا ”میں انجینئر بن کر بے روزگار پھروں گا۔“ جیسے احمقانہ خیالات اپنے دل سے نکال دے تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں کوئی ایسا الٹا سیدھا کام نہیں ہے جو آپ کرنا چاہتے ہوں اور کالج کی انتظامیہ پروفیسر صاحبان طلبہ تنظیمیں، مذہبی اور سیاسی جماعتیں اس میں داسے دسے سختے امداد نہ کریں۔ اس زمانے میں آپ جی بھر کر وقت ضائع کر سکتے ہیں (اپنا اور دوسروں کا)، ہر سیڈیٹ کو توڑ سکتے ہیں براخلاقی ضابطے کو پامال کر سکتے ہیں۔ زندگی کے یہ سنہری دن انسان کو زریں موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ سارے لوگ خاص طور پر ماں، باپ، بھائی، بہن، بڑے بوڑھے جواب تک اس کی زندگی سے کھیلے رہے ہیں وہ بھی جی بھر کر ان کی زندگیوں سے کھیلے۔ زندگی میں یہ سنہری موقع پھر کبھی نہیں آتا۔ جس نے اسے کھو دیا وہ ساری عمر پچھتا تا ہی رہا کیونکہ عملی زندگی آ کر جب اپنے شکستے سستی سے تو اس میں ادھر ادھر بھاگنا تو کیا، دائیں بائیں لپٹنے کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔
عملی زندگی کے ۲۴ پہلو ہیں شادی اور روزگار اور دونوں کے ضمن میں ہمارے نوجوانوں کو جتنی آزادی حاصل ہے ہم سب اس سے بخوبی واقف ہیں۔ شادی تو خیر دور کی بات ہے کہ وقت سے پہلے ڈولھا کو دلہن دیکھنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی، شادی کے بعد کسی زمانے میں میاں بیوی کو کم از کم بچے پیدا کرنے کی آزادی ہوا کرتی تھی۔ مگر افسوس اب خاندانی منصوبہ بندی کے حکمے نے وہ

بھی چھین لی ہے اور وہی یہ فیصلہ کرتا ہے کون کب اور کتنے بچے Afford کر سکتا ہے؟ زمانہ بعد از شادی کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر خاندانوں کو یہ آزادی بھی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ آزادی کے ساتھ بیوی کی غلامی کر سکیں۔ ماں باپ بھائی بہن عزیز اور رشتے دار اس آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں۔ بعض عقلمند لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ بیک وقت دونوں غلامیوں کا طوق گلے میں ڈالے رکھیں۔ ماں باپ ملیں تو ان کے پاؤں چھوئیں اور بیوی کا سامنا ہو تو اس کے سامنے ناک رگڑ دیں مگر پھر جھگڑا اس بات پر کھڑا ہو جاتا ہے کہ زیادہ غلام کس کا ہے۔ اکثر بیویاں یہ زیادتی کرتی ہیں کہ اپنا غلام تو بتاتی ہی ہیں ”love me & love my dog“ کے مصداق سواری اچھی ہو تو مکمل ہاتھ میں لے کر اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کو بھی ساتھ سوار کرا لیتی ہیں.....

”چل میرے گھوڑے نلک نلک نلک“

جہاں تک روزگار کے مواقع کا تعلق ہے اس کا انحصار

ملک کی اقتصادی حالت پر ہوتا ہے۔ ملک کی اقتصادی حالت کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے اور حکومت کا تعلق..... اس بات کو ہمیں چھوڑنے کے لیے کہ بات ہمیں دور نہ نکل جائے اور روزگار کی طرف پلٹ آئیے۔ خواہش تو ہر نوجوان کی (فلمی) ستاروں پر کندہ ڈالنے کی ہی ہوتی ہے مگر اس کا فیصلہ ہمیشہ ماں باپ اور ان کا روپیہ پیسا اور اثر و رسوخ ہی کرتے ہیں۔ جن کے ماں باپ لمبے ہاتھ مار چکے ہوں ان کی اولاد کے لیے بھی لمبے ہاتھ مارنا آسان ہو جاتا ہے۔ باقی نوجوان اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ جب بھی روزگار کسی اچھے کنارے لگنا چاہتے ہیں حالات کی کوئی نہ کوئی لہرائیں دھکیل کر پھر ساحل مراد سے دور کر دیتی ہے۔ روزگار میں نوکری ہے تجارت ہے اور صنعت نوکری کے بارے میں تو خیر یہ کھلا راز ہے کہ اس میں انسان آتا بھی کسی اور کی مرضی سے ہے رہتا بھی کسی اور کی مرضی سے ہے اور جو کچھ اس دوران کرتا ہے وہ بھی کسی اور کی مرضی سے۔ اور آزادی تو ان بچاروں کو کیا ہوتی ہے ان کے لیے تو یہ فیصلے بھی کوئی اور کرتا ہے کہ امانت کا دامن پکڑنا ہے یا خیانت کا، رشوت لینی ہے یا دینی ہے، یعنی ہے تو کب کس سے اور کیسے لینی

ہے اور کی ہے تو کب کہاں اور کب کس کو اور کیسے دینی ہے اور دی ہے تو اس کا حساب کتاب کب کس کو اور کیسے دینا ہے۔ اس لیے نوکری پیشے سے یہ توقع ہی عبث ہے کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

تجارت اور صنعت کے بارے میں کئی لوگوں کو یہ خوش فہمی ہے کہ شاید ان میں انسان کی اپنی مرضی چل سکتی ہے۔ ہماری رائے میں اس خوش فہمی میں صرف وہ لوگ رہ سکتے ہیں جنہوں نے کبھی بجلی کا بل ادا نہیں کیا، جنہوں نے کبھی کسی کی ”آنیاں جانیان“ نہیں دیکھیں، جنہوں نے کبھی روپے کو سرے بل کرتے نہیں دیکھا، جنہوں نے کبھی کسی لائسنس اور پرمٹ کے لیے درخواست نہیں دی، جنہوں نے کبھی قواعد و ضوابط کی مار نہیں سہی، جنہوں نے کبھی سرخ فیتے کا نظارہ نہیں کیا، جنہوں نے کبھی ٹیکس لگتے نہیں دیکھے، جنہوں نے کبھی ڈیوٹیاں (Duties) چھوٹی نہیں دیکھیں۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لائسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر ہم نے تو ٹھہلنا چھوڑ دیا
جس ملک میں پارک میں داخلے کے لیے دس جھیلے

ہوں جہاں بیوی کے ساتھ کھوٹے میں دس جگہ پوچھ کچھ کا خدشہ ہو جہاں بچوں کو نرسری میں داخلے کے لیے زور اور زر کی ضرورت پڑے جہاں ایک ریڑھی لگانے کے لیے ۱۰۰ کھانوں کو خوش کرنا پڑے، وہاں کوئی شخص اپنی مرضی سے تجارت کر سکے یا کارخانہ لگا سکے؟

اس خیال است و محال است و جنوں

پیسا لگانا ہو تو پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ ”کہاں سے آیا ہے یہ پیسا“ اور اگر کمانا ہو تو سوال کرنے والے سوال کرتے ہیں ”کہاں لے جاؤ گے یہ پیسا“ سو لوگ پیسا لگاتے بھی کسی اور کی مرضی سے ہیں کما تے بھی کسی اور کی مرضی سے ہیں اور جب کمائیں تو پھر کھاتے بھی کسی اور کی مرضی سے ہیں۔

اوپر نیچے سے پیسا بنانے کے لیے عمر کے آخری حصے میں لوگ جس طرح زور لگاتے ہیں اس میں صرف ایک ہی خواہش کو عمل دخل ہوتا ہے کہ میرے بعد میرے بچوں کو کسی کی کا احساس نہ ہو۔ دینا تو خیر دینا ہے کئی لوگ بچوں کے لیے اپنی آخرت بھی برباد کر کے ہی اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

خوشی کیوں.....؟

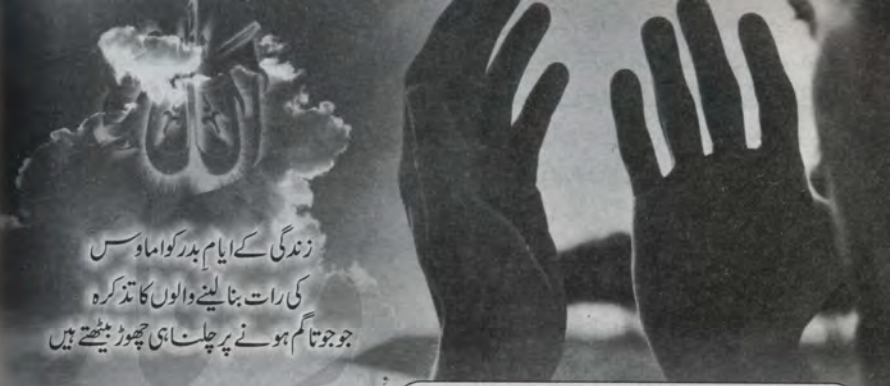
ارسطو نے ایک بار کہا تھا کہ انسان کی بھی چیز سے زیادہ خوشی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر فرد خوش ہونا چاہتا ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگ کھلے عام اس کا اظہار نہیں کرتے یا پھر مختلف الفاظ میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم میں عظیم اکثریت شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی زندگی کا بہترین حصہ خوشی، سکون اور اطمینان کی تلاش میں گزارتی ہے۔

انسان خوشی اور سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس کے لیے وہ ہر چیز کرنے اور ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوتا ہے حتیٰ کہ بسا اوقات وہ گناہ میں بھی ملوث ہو جاتا ہے۔ گناہوں سے انسان کو وقتی لذت حاصل ہوتی ہے مگر خوشی اور سکون نہیں۔

خوشی کیا ہے؟ ہر فرد اس سے آگاہ ہے، تاہم خوشی سے مراد زندگی سے لطف اندوز ہونا اور اچھا محسوس کرنا ہے۔ ہر فرد کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ احساس ہمیشہ اس کے ساتھ رہے مگر یہ دنیا خوشی، آرام اور سکون کے لیے نہیں بنائی گئی۔ دائمی خوشی اور سکون انسان کو جنت ہی میں ملے گا۔

ہمارا قول یہ ہے کہ ۴۰ سال کے بعد انسان صرف اپنے بچوں کے لیے زندہ رہتا ہے اور صحیح معنوں میں اس کے بچے اس کی زندگی گزارتے ہیں۔ کب اٹھنا ہے، کب سونا ہے، کیا پکنا ہے، کیا کھانا ہے، کہاں رہنا ہے، کب تیک رہنا ہے، کہاں سے کیا بچت کرنی ہے، کس چیز پر کیا خرچ کرنا ہے، ہر چیز کا فیصلہ بچوں کی طرف دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ بچے تو خیر زندگی کے مالک بن ہی جاتے ہیں ان کی خاطر اور بھی بہت سوں کو سر پر بٹھانا پڑتا ہے۔ ہم نے بڑے بڑے معتبر لوگوں کو پرائمری سکول کے بیچروں کے آگے منگاتے دیکھا ہے۔ امتحان میں بیٹھے بچے ہیں امتحانات ان کے والدین دیتے ہیں۔ جتنی محنت بچے پیچھے پھسلنے کے لیے کرتے ہیں ان سے دو گنا زور والدین کو انہیں آگے دھکیلنے کے لیے لگانا پڑتا ہے۔ ڈگریوں کا شوق بچوں کو کم ہوتا ہے والدین کو زیادہ، اس لیے ظاہر ہے محنت بھی انہی کو کرنی پڑتی ہے.....

اس نے ہی آخر لگایا زور اور زرتب ملی
باپ کی خواہش تھی بیٹا ہوئی ڈگری چاہیے



زندگی کے ایام بدر کو اماوس
کی رات بنا لینے والوں کا تذکرہ
جو جوتا گم ہونے پر چلتا ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں

خوشیوں کی پٹلیوں سے دکھوں کی تلاش میں رہنے والوں کے لیے

شکر گزار بنیے

رخسانہ بشیر

ہیلن
کیلر کا نام آپ نے سنا ہوگا جسے مارک ٹوئن نے انیسویں صدی کی سب سے دلچسپ شخصیت قرار دیا تھا۔ ہیلن کیلر بینائی، گویائی اور سماعت سے محروم تھی، وہ محض لمس محسوس کر سکتی تھی۔ لیکن اس کے اندر کچھ کر دکھانے کی طلب نے اسے اس مقام پر لاکھڑا کیا، کہ وہ اتنی محرومیوں کے باوجود نامور خاتون بن گئی۔ اس نے اپنی آپ بیتی میں ایک کمال کی بات لکھی۔ ”میں خوش ہوں کہ میرے خدا نے میرے اوپر بڑا کرم کیا۔ اگر یہ ساری چیزیں، یہ ساری نعمتیں..... بینائی، گویائی اور سماعت مجھے ملی ہوئیں تو میں دنیا کی ایک نامور عورت نہیں معمولی سی گھریلو عورت ہوتی۔“

شیخ سعدی کے پاؤں میں جوتا نہ تھا اور یہی بات اندر ہی اندر انہیں ملول کر رہی تھی۔ جنگل میں چلے جا رہے تھے کہ ایک اپاج کو دیکھا جو پیسا سخی کے سہارے چل رہا تھا۔ پاؤں ہی نہ تھے، لیکن پھر بھی وہ شکر گزار تھا۔ شیخ سعدی بہت متاثر ہوئے اور شکر کیا کہ ان کے پیرو تو ہیں سو شکر گزاری سیکھنے کا بہترین طریقہ یہ بھی ہے کہ سر اٹھا کر دیکھنے کے بجائے کبھی سر جھکا کر بھی دیکھ لیا جائے۔

ممکن ہے وہ لوگ نظر آجائیں جو مال و دولت، مرتبہ، تعلیم میں آپ سے کم، لیکن شکرگزاری میں آپ سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

ایک مقولہ مشہور ہے ”جو لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا، وہ اللہ کا شکر گزار کیسے ہو سکتا ہے؟“

اللہ کے بندوں کا شکر گزار ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم وہ بھلائیاں اور نیکیاں یاد رکھیں جو انھوں نے ہمارے ساتھ رکھیں۔ جب دوسروں میں کوتاہیاں اور خامیاں نظر آئیں تو اپنے گریبان میں جھانک لیا کریں؟ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں اپنی کوتاہیاں دوسروں کی خامیاں بیان کرنے سے باز رکھتی ہیں۔ جو لوگ اپنی کوتاہیوں پر نگاہ رکھیں، عموماً وہ دوسروں سے گلہ، شکوہ کم کرتے ہیں۔

کچھ لوگوں کو اپنے حالات، ماحول، خاندان، کم وسائل سے شکوہ ہوتا ہے۔ وہ جب دوسروں کو سبقت لے جاتے دیکھیں تو نامناسب حالات، محدود مواقع اور غیر فائدہ مند خاندانی پس منظر کا گلہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں بہت سی نامور اور عظیم شخصیات ایسی گزری ہیں جن کا تعلق انتہائی عام خاندانوں سے تھا



کچھ لوگ زندگی کے ڈھیر خوشگوار لمحوں میں سے کوئی ناخوشگوار لمحہ ڈھونڈ کر کیلنڈر کی صورت دیوار پر لگا لیتے اور پھر ہر وقت اسے یاد کر کے آپس بھرتے، تقدیر سے گلہ اور ناشکری کرتے ہیں



اس کے لیے رن وے اور پینجر لاؤنجر
بھی بڑے بنانے پڑتے ہیں



ڈبل ڈیکر طیارہ جو ایک ٹرین
کے برابر مسافر لے کر اڑ سکتا ہے

ایئربس A-380

فقیر اللہ خان

کمپنی مختلف سائز اور ڈیزائن کے طیارے تیار کر چکی تھی جن میں A-300، A-310، A-320، A-340 اور A-350 شامل ہیں اور اب ایئربس کمپنی کا آخری شاہکار عوام کی نظروں کے سامنے تھا۔ شہری ہوابازی کی صنعت لاصحد و ترقی کی منازل طے کرنے کی طرف گامزن ہے۔ اسی صنعت کا آخری طیارہ ایئربس A-380 ہے جو اپنے اندر ۸۵۳ مسافروں کو بٹھا کر ہوا کے دوش پر جہاں چاہے اڑنے کے لیے پرتول رہا تھا۔

۱۹۷۰ء سے لے کر ۲۰۰۵ء تک فضائی حکمرانی میں ابھی تک بوئنگ کمپنی کے ۷۴/۷ جیو جیٹ کا طوطی بول رہا

صدی کا آغاز ہوتے ہی شہری ہوابازی کی دنیا میں ایک ایسے پرندے نے آنکھ کھولی کہ اُس کے سامنے بڑے بڑے شہزاد بھی مولے دکھائی دینے لگے۔ سال ۲۰۰۵ء کی صبح پیرس میں ایئر شو کے ایک ہوٹل میں لوگوں کا ٹھانٹھاں مارتا ہوا سمندر ایک ایسے جہاز کو دیکھنے کے لیے اُمٹ آیا تھا، جسے ایئربس A-380 کا نام دیا گیا تھا۔ اس جہاز کو فرانس کی ہی ایک طیارہ ساز کمپنی ایئربس نے متعارف کرایا تھا۔ اس سے قبل ایئربس

ایکسپریس

اللہ! تو ہمیشہ سے مجھ پر مہربان ہے، میں نے جب بھی اس کی طرف ایک قدم بڑھایا تو وہ دس قدم ضرور میری طرف آیا ہے۔“ یہی لوگ ہیں جن کے پاس جوتا تو درکنار پاؤں بھی نہیں ہوتے پھر بھی زبان پر شکوہ نہیں لاتے۔ یہی وہی لوگ ہیں جو ہیلن کیلر کی طرح محرومیوں کو نعمت کہتے ہیں۔ ناخوشگوار لمحوں کو کارٹون بنا کر ان پر رنجیدہ ہونے کے بجائے ہنسنا کا ہنر سیکھتے ہیں۔ آدھا خالی گلاس دیکھ کر پریشان ہونے کے بجائے آدھا بھرا ہوا گلاس دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وقت کے تاریک جنگل سے ملنے والے جگنو جیسے ایک پل کو بھی مٹھی میں قید کر کے ساری زندگی روشن کر لیتے ہیں، زندگی کے تپتے صحرا میں اڑتی ریت کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اکا دکا سایہ فراہم کرتے، درختوں کی بات کرتے ہیں۔

یہی لوگ ہر کھن لحو میں اپنے آپ سے بہت دھیرے سے پُریقین انداز میں کہتے ہیں: ”جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اور اللہ جو کرتا ہے، صحیح کرتا ہے۔“

یہی مقصودِ فطرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ اسی لیے جب ان کے سینے بکھریں اور ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں دل میں ترازو ہوں تو وہ فکارِ دل اور چھلنی جگر کے ساتھ بھی چہرے پر مسکراہٹ سجانے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں۔ وہ چپکے چپکے اللہ سے کہتے ہیں ”اگر تو اس بات میں راضی ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں۔“

سوال یہ ہے کہ پہلی قسم کے لوگوں سے نکل کر دوسری صف میں کھڑے لوگوں میں شامل ہونا ہمیں کب آنے گا؟ گلے، شکوے، شکایات، ناشکری اور بے جا نقائص سے نکل کر شکر گزار اور تسلیم و رضا کے مرحلہ میں ہم کب داخل ہوں گے؟

یہ وہ سوالیہ نشان ہیں جن پر سوچنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم نعمتوں کا ادراک اور اعتراف کر سکیں۔ کیونکہ قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے۔ ”اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہارے لیے نعمتوں کو بڑھادوں گا۔“

کچھ لوگ آدھا خالی گلاس دیکھ کر پریشان ہونے کے بجائے آدھا بھرا ہوا گلاس دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وقت کے تاریک جنگل سے ملنے والے جگنو جیسے ایک پل کو بھی مٹھی میں قید کر کے ساری زندگی روشن کر لیتے ہیں

دیتے ہیں۔ محرومی کے چھوٹے نقطے کو پھیلا کر زندگی کے ایام بدر کو بھی اماؤں بنا لیتے ہیں۔

ان ہی کی نظریں شیشے پر چسپاں مری مکی پر جا ٹھہرتی ہیں، لیکن شیشے کے اس پار تاحد نگاہ سے پھیلا حسن و جمال محسوس نہیں ہوتا۔

یہ وہی لوگ ہیں جو خوشیوں کی پوٹلی میں سے چھانٹ چھانٹ کر دکھ نکالتے ہیں اور پھر انہیں تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیتے ہیں۔

یہی لوگ زندگی کے ڈھیر سارے خوشگوار لمحوں سے کوئی ناخوشگوار لمحہ ڈھونڈ کر کیلنڈر کی صورت دیوار پر لگا لیتے اور پھر ہر وقت اسے یاد کر کے آپس بھرتے، تقدیر سے گلہ اور ناشکری کرتے ہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہیں دھوپ میں کھڑا کیا جائے یا چھاؤں میں ان کے دل کا پیانا شکر گزاری اور احسانِ مندی کے جذبات سے لبالب رہتا ہے۔

ان کی خزاں زدہ زندگی میں بہار کا ایک معطر جھونکا بھی بہت معنی رکھتا ہے وہ اس جھونکے کو ساری زندگی یاد کر کے اپنی جس زدہ زندگی مہر کا تے رہتے ہیں۔

خوشی کا ایک لمحہ عطا ہونے پر بھی کہتے ہیں ”میرے

اوپر والی منزل میں پہنچا جاسکتا ہے۔ A-380 کی دونوں منزلوں میں ڈیوٹی فری شاپس کے کاؤنٹر بھی بنائے گئے ہیں۔ جہاں مسافر اپنی من پسند گھڑیاں، سگریٹ، فینسی طرز کے بال جن اور دوسرے سوویتیز خرید سکتے ہیں۔ طویل فلائٹ کے پیش نظر مسافروں کو ناشتا، لچ، ڈنر اور ڈرنکس مختلف وقفوں سے پیش کیے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ A-380 ایئربس کی لمبی پروازوں میں عملے کی کوشش ہوتی ہے کہ مسافر کم سے کم بوریت محسوس کریں۔ مسافروں کی نشست پر ٹی وی، سی ڈیز کی سہولت کے علاوہ لیپ ٹاپ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ایئربس A-380..... ایک نظر میں

لمبائی		۲۳۹ فٹ
اونچائی		۷۹ فٹ
پروں کا پھیلاؤ		۲۶۲ فٹ
دائرہ پرواز		۱۵۳۰۰ کلومیٹر
مستعمل تاروں کی لمبائی		۵۳۰ کلومیٹر
تاروں کا وزن		۵۸۰ ٹن
اکانومی نشستوں کی تعداد		۸۵۳
رقبہ فی گھنٹہ		۹۰۰ کلومیٹر
انجن (رولس راس)		۴
تیل کی گنجائش		۳۲۰۰۰ گیلونز
قیمت		۳۶ ارب روپے

جس طرح کہا جاتا ہے کہ اگر بڑے بڑے راجوں مہاراجوں سے یاری لگنی ہو تو اپنے گھروں کے دروازے نہ صرف بڑے بلکہ اونچے رکھنے پڑتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جن ملکوں کی فضائی کمپنیاں ایئربس A-380 استعمال کر رہی ہیں، انھوں نے اپنے ہوائی اڈے، رن وے اور پیچھے لاؤنجر بھی وسیع اور کشادہ کر لیے ہیں تاکہ جہاز کو لینڈنگ اور ٹیک آف کے وقت کوئی دقت پیش نہ آئے۔

ذروغ کی۔ Qantas (آسٹریلیئن فضائی کمپنی) نے ۱۹ ستمبر ۲۰۰۸ء کو اپنی پہلی پرواز میلبورن سے لاس اینجلس تک چلائی اور ملائشین ایئر لائن نے جولائی ۲۰۱۲ء کو کوالالمپور سے لندن تک نان شاپ پہلی پرواز کا آغاز کیا۔

۲۰۰۸ء کے آخر تک ایئربس A-380 کی پروازوں میں ۸ لاکھ مسافر سفر کر چکے تھے اور ۲۲۰۰ پروازوں کے ۳۱۰۰۰ گھنٹے فضا میں ہی گزرے۔ A-380 میں بورڈنگ کے وقت مسافروں کو ان کی نشستوں پر بٹھانے کے لیے صرف ۳۴ منٹ درکار ہوتے ہیں جبکہ جمبو جیٹ ۷۷ کے ایئربس A-380 سے بہت چھوٹا جہاز ہے، اُس میں مسافروں کو سوار کرانے کے لیے کم از کم ۳۵ منٹ کا وقت درکار ہوتا ہے۔

اس طرح کے عظیم الجثہ اور دیوبہیکل جہاز بنانے کا خیال اس سے قبل بوئنگ کمپنی کو بھی آیا تھا، لیکن نہ جانے کون خدشات کے پیش نظر بوئنگ کمپنی نے یہ منصوبہ ۱۹۹۲ء میں ختم کر دیا لیکن یہ ایئربس کمپنی ہی تھی جس نے آج بڑا مسافر طیارہ بنانے کے خواب کو تعبیر دی۔ اس A-380 جہاز میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو ہر ۳ منٹ بعد ہلنا تازہ یہ تازہ ہوا مل جاتی ہے، جس سے مسافروں کو اپنی منزل پر اترتے وقت بہت کم تھکان کا احساس ہوتا ہے۔ اس جہاز کی دونوں منزلوں کے اطراف میں ۲۵۲ سے بڑی کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جن سے وافر مقدار میں قدرتی روشنی جہاز کے اندر پہنچتی ہے۔ جہاز کی پہلی منزل پر آگے اور پیچھے ۲ سیڑھیاں ہیں جن کے ذریعے

۱۲ نیچے والی منزل میں اور ۸ اوپر والی منزل میں اپنی اپنی ڈیوٹیاں نبھالے کھڑے ہوتے ہیں جبکہ کاک پٹ میں ایک پائلٹ اور ایک اسٹنٹ پائلٹ بیٹھتا ہے۔ جب ۲۰۰۵ء میں ایئربس کمپنی نے اپنا یہ جہاز متعارف کرایا تو اس کی کارکردگی دیکھ کر اکثر فضائی کمپنیوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ان فضائی کمپنیوں میں سب سے پہلے جنوبی ایشیا کے چھوٹے سے جزیرے سنگاپور کی ایئر لائن نے ایئربس کی پیشکش کو قبول کیا اور پھر سنگاپور ایئر لائن نے ۲۰۰۷ء میں ایئربس A-380 کو اپنے فضائی بیڑے میں شامل کر لیا۔ اس طرح سنگاپور ایئر لائن پر جمبو جیٹ A-380 کو خریدنے والی پہلی کمپنی بن گئی۔ اس کے بعد تو گویا ایئربس انڈسٹری کے پاس A-380 کے آرڈرز کی لائن لگ گئی۔ ابھی اگست ۲۰۱۲ء تک دنیا کی ۲۵۷ فضائی کمپنیوں نے A-380 خریدنے کا آرڈر دے دیا ہے اور ان کمپنیوں میں A-380 کی سب سے بڑی خریدار امارات ایئر لائن ہے جس نے ۹۰ (A-380) جہاز خریدنے کا آرڈر دیا ہے۔

ایئربس A-380 کی پیداوار شروع ہونے سے لے کر ستمبر ۲۰۱۲ء تک ۸۱ جہاز دنیا کی فضائی کمپنیوں نے خرید لیے ہیں اور بڑی کامیابی سے وہ جہازوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ان میں سنگاپور ایئر لائن، ایئربس (امارات)، قسطاس (Qantas)، لفتھانسا، ایئر فرانس، کورین ایئر لائن، ملائشین ایئر لائن اور چائنا ساؤدرن ایئر لائن شامل ہے۔ ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۰ء تک پہلے ۳ سال ڈیڑھ کروڑ مسافران جہازوں میں سفر کر چکے ہیں۔ سنگاپور ایئر لائن نے ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو A-380 سے اپنی پہلی پرواز کا آغاز سنگاپور سے سڈنی کے لیے کیا۔ ایئربس دوسری فضائی کمپنی تھی جس نے دہلی سے نیویارک کے لیے اپنی پہلی نان شاپ پرواز اگست ۲۰۰۸ء میں

تھا۔ ۲۰۰۵ء میں ایئربس کمپنی نے ایک ایسا طیارہ متعارف کرایا کہ سول ایویشن میں ایک زبردست انقلاب آگیا۔ دنیا کی تمام فضائی کمپنیوں اور مسافروں نے اس طیارے کو دل و جان سے خوش آمدید کہا اور اس پذیرائی کا نتیجہ حقائق اور ہندسوں کی شکل میں نہایت چونکا دینے والا ہے۔ اس لیے اس جہاز کو مہر جمبو جیٹ کا بھی نام دیا گیا ہے۔

۱۔ یہ ۲ منزلہ جہاز ہے، جس میں نشستوں کی کل تعداد ۸۵۳ ہے۔ پہلی منزل میں ۵۳۸ اور دوسری منزل میں ۳۱۵ نشستیں ہیں جو کہ سب کی سب اکانومی کلاس کے لیے ہیں۔

۲۔ اگر جہاز کی دونوں منزلوں میں تینوں مروجہ یعنی فرسٹ کلاس، بزنس کلاس اور اکانومی کلاس کی نشستیں بھی لگائی جائیں تو مجموعی نشستوں کی تعداد ۵۲۵ ہے جو کہ بوئنگ جمبو جیٹ ۷۷ سے ۱۰۰ نشست زیادہ ہے۔

۳۔ ایئربس A-380 کے پرواز بھرتے اور اترتے وقت جمبو جیٹ ۵۷۰ فیصد کم شور سنائی دیتا ہے۔

۴۔ ایئربس A-380 کا زیادہ سے زیادہ فضا میں دائرہ پرواز ۱۵۴۰۰ کلومیٹر ہے یعنی یہ جہاز آرام سے نیویارک سے پرواز کر کے ہانگ کانگ تک بغیر کہیں رُکے اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے جبکہ نیویارک سے ہانگ کانگ کا فضائی فاصلہ ۱۲۹۸۳ کلومیٹر ہے۔

یہ جہاز اتنا عظیم الجثہ ہے کہ اس کے آس پاس کھڑے ہوئے جہاز بھی اپنا دامن، منہ اور دم چھپانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ ایئربس سیریز کا کافی الحال آخری جہاز ہے۔ ابھی آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ گویا اب یہ ایئربس A-380 پوری ۱۰ یوگیوں والی ٹرین کی سواریاں اٹھا سکتی ہے۔ اگر ہم اسے ایک فضائی ٹرین بھی کہہ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس جہاز کی دونوں منزلوں

میں ۸۵۳ مسافروں کی دیکھ بھال کرنے والے عملے کی تعداد ۲۰ ہے۔ جن میں



کمر درد سے کیسے بچیں

کیا غیر معمولی تھکاوٹ یا سردی لگنے کے باعث یہ درد آپ کو اپنا شکار بنا سکتا ہے؟

ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)

ایک

اندازے کے مطابق ۸۰ فیصد

سے بھی زیادہ لوگ اپنی زندگی

کے کسی نہ کسی حصے میں کمر درد

کا شکار ہو جاتے ہیں جو زیادہ تر

سرد موسم میں ہوتا ہے۔ یہ کمر درد عام طور پر معمولی نوعیت کا

ہوتا ہے اور ایک سے لے کر ۳ دن تک معمولی آرام اور

عام دوائی، دردش مرہم، ہلکی ماش یا گرمائش سے ٹھیک ہو

جاتا ہے۔ یہ درد غیر معمولی کام کی تھکاوٹ، کام کرتے

ہوئے کمر کی ہڈی پر جھکا، سوتے ہوئے غیر مناسب

جسمانی حالت یا کمر سے کپڑے کے بٹے رہنے کی وجہ سے

کمر کے مسلسل سردی میں رہنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایسے

درد کا شکار فرد اگر غور کرے اس کو ان اسباب میں سے اگر

کوئی ہو تو یاد آ جاتا ہے اور یہ معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔

اگر درد ۳ دن سے زیادہ رہے یا شروع میں ہی

شدید ہو جائے اور وجہ معلوم نہ ہو تو دیکھنا چاہیے کہ درد کے

ساتھ ساتھ پیٹ کا کوئی حصہ تو متاثر نہیں پیٹ کو ہاتھ

لگانے سے درد تو نہیں ہو رہا۔

ہلکے نبض میں کوئی بے ترتیبی، کمزوری، ہلکے پریش میں

کمی یا غیر معمولی جسمانی کمزوری تو نہیں ہے۔ ایسا خون کی

تالیوں میں کسی نقص کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

☆ اگر مریض کی عمر ۲۰ سال سے کم ہے اور کمر کی

ہڈی پر کوئی سوجن یا چھوٹے ہوئے درد کا احساس ہوتا ہے

تو یہ کسی بڑی تکلیف کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔

☆ اگر عمر ۴۰ سال سے کم ہے اور درد آرام کرنے

سے بڑھے اور حرکت کرتے ہوئے کم ہو جائے تو ایسا

(Ankylosing Spondilitis) یا کسی ایسی ہی

بیماری کے باعث ہو سکتا ہے۔

☆ ۵۰ سال کی عمر کے بعد درد کا بغیر کسی وجہ سے

ہونا بھی احتیاط کا معاملہ ہے کیونکہ ایسا درد جسم کے کسی عضو

کی بیماری کے سبب کمر کی ہڈی تک کے پھیلاؤ کے باعث

ہو سکتا ہے۔ پروٹینٹ کا کینسر اس کی ایک وجہ ہے۔

☆ عام نوعیت کا درد آرام کرنے سے یا جسم کو کسی

خاص پوزیشن پر رکھنے سے کم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی بھی

پیشہ کوئی نہ ملے تو یہ گردے یا مثانہ میں پتھری کے سبب

ہو سکتا ہے۔

☆ رات کو آرام کرتے ہوئے کمر درد کا شروع ہو

جانا یا بڑھنا بی بی کینسر کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔

☆ درد کا کوہوں تک ہونا یا گھٹنوں یا گھٹنوں سے نیچے

تک پھیلنا مریضوں کے درمیان Disc کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔

☆ اگر کسی درد کو ۳ دن کے آرام اور عام دوائی سے

بہتر نہ ہو تو پیشاب ٹیسٹ، کمر کے ۲ ایکس رے اور پیٹ کا

اساؤڈ کرنا چاہیے۔ خاص حالات میں ایم آر آئی

(MRI) سے درد کی نوعیت سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اگر ان تمام باتوں کا جائزہ لے کر اس بات کا ذرا بھی

شک ہو کہ یہ درد کسی بڑی بیماری کے باعث ہے تو فوراً کسی

پیشہ سے رجوع کرنا چاہیے۔

لیکن اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ یہ درد پٹھوں کی

تھکاوٹ اور کام کی زیادتی وغیرہ سے ہو رہا ہے اور اگر کوئی

خاص کی تصدیق بھی کر دے تو بھی غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

کمر درد سے بچاؤ کی تدابیر

☆ کمر سیدھی رکھیں ☆ کمر گرم رکھیں

☆ کمر درد سے بچاؤ کے سنہری اصول ہیں

کمر سیدھی رکھیں

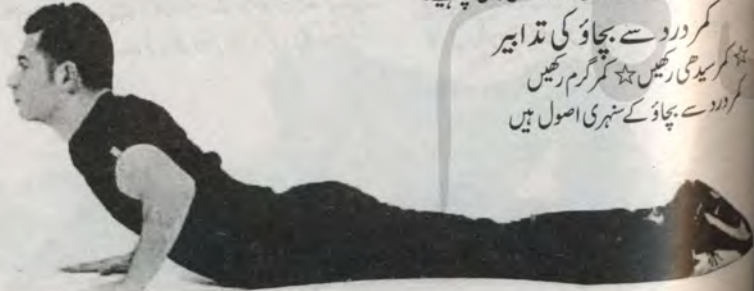
کمر درد کے مریض کو کوشش کرنی چاہیے کہ اپنا سر اونچا، کندھے اوپر اور سیدھے اور سینہ ابھار کر رکھے۔ اس طرح اس کی پوری کمر سیدھی رہے گی اور درد میں بھی کمی رہے گی۔ اگر اس کی کمر ڈھیلی اور جھکی ہو تو کمر درد دوبارہ شروع ہو سکتا ہے اور بڑھ بھی سکتا ہے۔ اس لیے ہر حالت میں کوشش کریں کہ کمر سیدھی رہے۔

کمر گرم رکھیں

ہمیشہ لمبی شرٹ ہی استعمال کریں۔ چھوٹی شرٹ اوپر اٹھ جاتی ہے، جس سے کمر کو ہوا لگ جاتی ہے اس سے درد دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ رات سوئے وقت بھی لمبی شرٹ استعمال کریں۔

کہاں لیٹنا چاہیے

کمر درد کے مریض کو زمین پر نہیں لیٹنا چاہیے کیونکہ ایک تو زمین پر مناسب موٹائی کا بستر نہیں بچھایا جاتا اور دوسرے زمین پر لیٹتے اور اٹھتے وقت بھی دقت ہوتی ہے۔ آج کل جو میٹرلیں والے بیڈ ہیں ان پر لیٹنا چاہیے۔ بیڈ کا میٹرلیں اور تختہ ہموار اور ٹونا پھوٹا نہیں ہونا چاہیے، پرانے زمانے کی لکڑی کی چارپائی ہموار بھی نہیں ہوتی اور ڈھیلی بھی ہو جاتی ہے۔ لوہے کی ہموار تخت اور موٹے بستر





رکھ کر آگے جھک کر بیٹھیں اور کسی سہارے کو پکڑ لیں۔

ہر انسان کو اپنی عمر کے مطابق ورزش ضرور کرنی چاہیے۔ دنیا میں اس وقت ورزش کے بہت سارے طریقے موجود ہیں۔ نماز کے بے شمار فوائد میں سے ایک فائدہ پورے جسم کی ایک ایسی ورزش ہے۔ جو ایک بچے سے لے کر انسان کی ہر عمر کے لیے ضروری ہے۔ بتائے گئے مناسب طریقے سے وضو، قیام، رکوع، سجود اور قعود اگر مکمل ذہنی یکسوئی کے ساتھ کیا جائے تو یہ یوگا اور ورزش کا بہترین امتزاج ہے۔ نماز کی ہر کیفیت میں اپنے جسم کو متوازن رکھنا اور سلام پھیرتے ہوئے کندھے، گردن اور کمر کو سیدھا رکھ کر ایسے سلام پھیرنا کہ نظر کندھے پر ہو۔ سارے جسم کی بہترین ورزش ہے لیکن شدید درد کی حالت میں اگر نماز پڑھتے ہوئے مریض کو تکلیف ہو تو اجازت ہے کہ وہ آفس چیئر پر بیٹھ کر اشاروں کے ساتھ نماز ادا کرے۔ کمر درد کے مریض کو اپنا وزن، عمر اور قد کے مطابق رکھنا بہت ضروری ہے۔ دیکھیے ۱۸ سال کی عمر میں انسان کا جو وزن ہوتا ہے، اُسے اٹھانے کے لیے اس وقت اس کی ہڈیاں بہت مضبوط ہوتی ہیں لیکن ۴۰ سال کی عمر میں انسان کی ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں اور انسان اس پر چربی اور بالٹوں کا کتنا ہی وزن ڈال دیتا ہے۔ اس لیے زیادہ وزن والے مریضوں کی ہڈیاں زیادہ ہی احتیاج کرتی ہیں۔ اس لیے اپنے وزن کو کنٹرول کریں۔

پیٹ

پیٹ چھوٹا کریں۔ ایک عام کلیہ ہے کہ اگر کسی انسان

کا پیٹ اس کے سینے سے ۴، ۵ انچ چوٹا ہے تو وہ صحت مند ہے۔ اگر کسی انسان کا پیٹ اس کے سینے سے بڑھا ہوا ہے۔ اتنا ہی اس کو شوگر، بلڈ پریشر اور کمر درد کی تکالیف کا خطرہ بڑھتا جاتا ہے۔ بڑھا ہوا پیٹ جب اس کے جسم سے آگے کو نکلتا ہے تو اس کا سارا وزن ہر وقت اس کی کمر کی ہڈی پر پڑتا ہے۔ جس سے وہ کمر درد کا شکار بھی ہو جاتا ہے تو آرام بھی مشکل سے آتا ہے۔ اس لیے کمر کا سینے سے چھوٹا رہنا بہت ضروری ہے۔

کمر درد کا علاج

کمر درد شروع ہوتے ہی اگر مریض کوئی درد کش گولی کھالے، زمین پر فوم بچھا کر یا بیڈ پر الٹا لیٹ جائے اور کسی مددگار سے (جو اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر گرم کرنے کے بعد) زیتوں کے تیل کی مالش کرے یا کوئی درد کش مرہم لگوائے یا مناسب گرم مالش والی ریڑ کی پانی کی



لیں۔ بیسن پر کھڑے ہو کر منہ ہاتھ دھوتے، برش کرتے وقت احتیاط کریں۔ بہتر ہے کہ ایک ہاتھ بیسن پر رکھیں اور گھٹنوں کو ذرا خم دے لیں، وضو کرنے کے لیے مسئلہ چوکی کا استعمال کریں۔

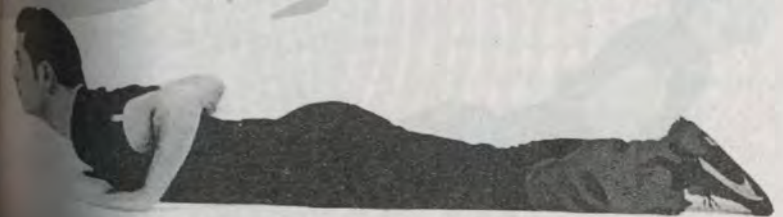
نیم گرم پانی سے نہائیں

اگر آپ موثر سائیکل پر سفر کرتے ہیں تو اپنے جسم کا وزن اپنے دونوں پاؤں اور ہاتھوں پر رکھیں۔ دونوں گھٹنوں کو پٹرول کی ٹینگی سے چپکا لیں موثر سائیکل کی سیٹ پر بہت کم وزن ڈالیں اپنے سر کو آگے کی طرف جھکا لیں جیسے ریس کے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے اس کا جبلی کرتے ہیں۔ اس سے کمر پر دباؤ بھی نہیں پڑتا اور ہوا کی مزاحمت بھی کم ہوتی ہے۔ سپیڈ بریکر اور گڑھوں سے گزرتے ہوئے احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کمر درد کا مریض موثر سائیکل کی پچھلی سواری ہے تو اس کو زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔ موٹر گاڑی کی سیٹ ہموار اور آرام دہ ہونی چاہیے۔ گاڑی ویگن یا رکشہ میں سفر کرتے ہوئے ہمیشہ کمر سیدھی

والی چارپائی استعمال کی جاسکتی ہے۔ یا ان پر لکڑی کا تختہ لگا کر میٹریس یا روٹی کا موٹا گدار کھا جاسکتا ہے۔

بیڈ پر لیٹنے وقت کمر سیدھی رکھ کر گھٹنوں اور کولہوں کو جھکا کر بیڈ پر بیٹھنا چاہیے اور پھر کروٹ کے بل کہنی کی مدد سے لیٹنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے درد کی لہر نہیں اٹھتی اگر سیدھا لیٹ کر درد کا احساس ہو تو دونوں گھٹنوں کو اوپر اٹھا کر ان کے نیچے چھوٹا تکیہ رکھ لیں یا کوئی کرسی یا میز لے کر اس کے اوپر اپنے پاؤں رکھ لیں۔ یا کروٹ کے بل لیٹ کر دونوں گھٹنوں کو اٹھا کر ان کے درمیان چھوٹا تکیہ یا دونوں ہاتھ جوڑ کر رکھ سکتے ہیں اس سے درد میں کمی ہو جاتی ہے۔ بستر پر لیٹتے ہوئے لمبا سویٹر وغیرہ تکیہ کے نیچے رکھ لیں اور صبح یا کسی بھی وقت اٹھتے ہوئے فوراً پہن لیں تاکہ کمر ایک دم ٹھنڈی نہ ہو۔ بستر سے اٹھ کر چند منٹ تک کمرے کے گرم ماحول میں چہل قدمی کریں۔ بستر سے اٹھنے کا طریقہ بھی بستر پر لیٹنے جیسا ہی ہونا چاہیے۔ بیٹھنے کے لیے آفس چیئر کا استعمال کریں اور پیچھے ہو کر بیٹھیں تاکہ کمر سیدھی رہے اور اس کو سہارا ملا رہے۔ اٹھتے بیٹھتے ہر حالت میں کمر سیدھی رکھیں اور گھٹنوں اور کولہوں کے جوڑ استعمال کریں۔ میز یا زمین سے کوئی چیز اٹھاتے ہوئے اپنا ایک پاؤں آگے کر لیں اور کمر سیدھی رکھ کر ویسے ہی گھٹنوں اور کولہوں کے بل ایک ہاتھ سے کسی میز وغیرہ کا سہارا لے کر کھلیں۔

ہاتھ روم میں اپنے آپ کو سردی سے بچائیں۔ ہاتھ روم جانے سے پہلے ہاتھ روم کے روشن دان بند کر لیں۔ اگر زیادہ ٹھنڈک ہے تو ہاتھ روم ہیٹر وغیرہ لگا کر گرم کر



۱۴۰۰ ارکتابیں
ہر ایڈیشن ۳ ہزار کا
۳۰ ملکوں میں برائیں

دنیا کے بہترین کاغذ پر نوبل قرآن کی
۳۰ لاکھ کاپیاں چھاپنے کا اعزاز ملا ہے



جوارہ ایک بار کر لیا اُسے بدلائیں

آپ بیتی عبدالملک مجاہد

میں حرم میں جا کر دیانت دار اور باصلاحیت
انصارِ دین کارملنے کی دعا کرتا ہوں

ہمیشہ یہ چاہا کہ آنحضرتؐ کی سیرت کو موتوں کی طرح ہمیشہ کروں
صحاح ستہ ایک ہی جلد میں ۷۷۲ صفحات پر چھپی ہوئی کسی کو یقین نہیں آتا

قرآن پاک کی کتابت سے فیض پانے والے
ایک کی گرافری حیرت افزا داستان
جس کی ہمت، ذہانت، واضح مقصد، مسلسل محنت اور اللہ سے
مگرے تعلق نے اُسے ۳۰ ملکوں میں قائم عالم اسلام کے
سب سے بڑے پبلشرنگ ہاؤس کا خالق اور سربراہ بنا ڈالا

تحریر و تہذیب
اختر عباس



ہتھیلیاں زمین پر رکھ دیں۔ اب دونوں گھٹنوں کو ملا کر بغیر
پاؤں اٹھائے پنڈولم کی طرح ۱۵،۱۰ بار دائیں بائیں
حرکت دیں۔

ورزش نمبر ۲: لٹے لیٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں
گردن کے برابر زمین پر رکھ لیں اور اس کے بعد اپنے چہرے
اور سینے کو اوپر اٹھاتے جائیں جہاں تک ممکن ہو سکے۔ جیسے
آپ اپنی سامنے کی دیوار کو دیکھ رہے ہیں۔ چند سینکڑے بعد
پہلی حالت میں آجائیں یہ ورزش ۵، ۱۰ بار کریں۔

یہ ورزشیں دن میں ۳، ۴ بار دہرائی جاسکتی ہیں۔
جب کمر درد کا مریض ٹھیک ہو جائے تو بعد میں بھی ان
ورزشوں کو جاری رکھنا چاہیے اور کمر درد سے بچاؤ کی تدابیر
پر بھی عمل کرنا چاہیے۔ بکرے کی پشت (پٹھ) کا گوشت
کھانا کمر درد کے لیے مفید ہے۔ مٹی و ٹانم کی گولیاں بھی
استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ چند ایک مشورے ہیں جو میں اپنے مریضوں کو
اپنے چھوٹے سے کلینک میں دیتا ہوں۔ اکثریت اس سے
فائدہ اٹھاتی ہے۔ بہتری کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ مجھے
آپ کی رہنمائی اور درودوں کا انتظار ہے۔

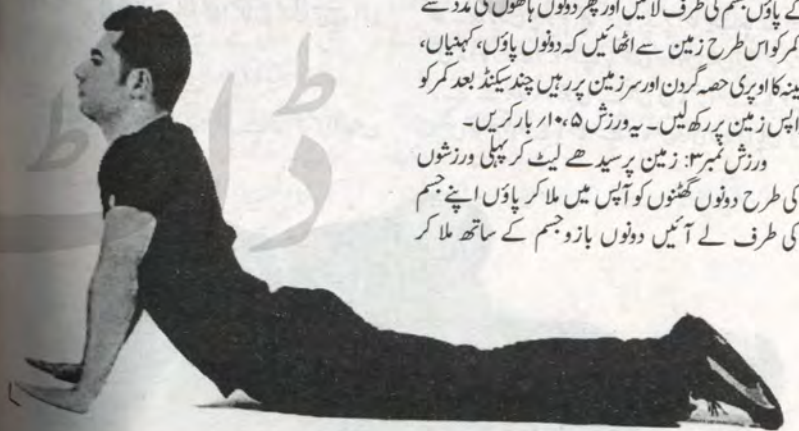
گرم بوتل کپڑے میں لپیٹ کر کمر کو گرمائش دے تو اکثر
اوقات ان تدابیر سے ہی درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کو
اس کے بعد بھی ساری احتیاطی تدابیر اور کمر کی بتائی گئی
ساری یا چند ایک ورزشیں کرنی چاہئیں ہم کمر درد کی صرف
وہی ورزش بتا رہے ہیں جو آسانی سے ہو جاتی ہے اور اکثر
اتنی ورزش ہی کافی ہو سکتی ہے۔

کمر درد کی ورزش

کمر درد کی ورزشیں زمین پر روئی کا گدیا پتلا ہموار
فوم بچھا کر کرنی چاہیے۔ ورزش سے پہلے کمر کی ہلکی مالش
کر کے اس کو گرم کر لیں زیتون کا تیل استعمال کر سکتے ہیں۔
ورزش نمبر ۱: زمین پر روئی کا گدیا فوم بچھا لیں دونوں
گھٹنوں کو اکٹھا کر کے پاؤں اپنے جسم کے نزدیک رکھ لیں
دونوں ہاتھوں سے ایک گھٹنے کو پکڑ کر اپنے پیٹ کی طرف
زور سے پھینکیں۔ چند سینکڑے بعد اس گھٹنے کو واپس کر کے
دوسرے گھٹنے کو بھی ایسے ہی اپنے پیٹ کی طرف پھینکیں۔
کسی مددگار کی مدد سے بھی جو گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر پیٹ کی
طرف دبائے، فائدہ ہوتا ہے۔ ۵، ۱۰ بار کریں۔ اس
طرح پچھلے نرم اور درد میں افادہ ہوتا ہے۔

ورزش نمبر ۲: پہلی ورزش کی طرح گھٹنوں کو اکٹھا کر
کے پاؤں جسم کی طرف لائیں اور پھر دونوں ہاتھوں کی مدد سے
کمر کو اس طرح زمین سے اٹھائیں کہ دونوں پاؤں، کہنیاں،
سینہ کا اوپری حصہ گردن اور سر زمین پر رہیں چند سینکڑے بعد کمر کو
واپس زمین پر رکھ لیں۔ یہ ورزش ۵، ۱۰ بار کریں۔

ورزش نمبر ۳: زمین پر سیدھے لیٹ کر پہلی ورزشوں
کی طرح دونوں گھٹنوں کو آپس میں ملا کر پاؤں اپنے جسم
کی طرف لے آئیں دونوں بازو جسم کے ساتھ ملا کر



بنیادی طور پر کیلی گرافر ہوں جسے اردو میں خطاط کہا جاتا ہے۔ کیلی گرافر کی خوش بختی یہ ہوتی ہے کہ اس کا قلم جب بھی لفظ لکھتا اور اٹھاتا ہے تو قرآن مبین کا ہوتا ہے۔ میری زندگی کی ساری خوشیاں اور کامیابیاں اسی عظیم کتاب سے جڑی ہوئی ہیں۔ بطور کاتب جو پہلا سبق میں نے سیکھا وہ تھا ”گرمی خوانی“ کہ باشی خوش نویں می نویں و می نویں و می نویں (اگر تو چاہتا ہے تو خوش خط ہو جائے) (پھر لکھتے رہو، لکھتے رہو) جب سے دارالسلام میری زندگی کی پہلی ترجیح بنا تو یہ سبق یوں بدل گیا کہ اگر تو کامیابی چاہتا ہے تو خلوص نیت اور مستقل مزاجی کے ساتھ کرتے رہو۔ کرتے رہو۔

میں نے ۳۲ سال پہلے پاکستان سے سعودی عرب جانے کا فیصلہ کیا اور وہاں کئی سال وزارت دفاع میں ملازم رہا۔ کام اور تعلقات دونوں کو نبھانے میں، میں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ آپ کو حیرت ہو گی کہ جب نوکری چھوڑ کر میں نے طباعت، نشر و اشاعت میں آنے کا فیصلہ کیا تو ہمارے افسر اعلیٰ نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے تب تک انتظار کرنا پڑا جب تک ان کی ٹرانسفر نہیں ہو گئی۔ نئے افسر سے گزارش کی تب جا کر مجھے اجازت ملی۔

”دارالسلام“ میرا خواب تھا۔ ریاض میں اس کی تعبیر سامنے آئی۔ کتاب و سنت کی ترویج و اشاعت کے لیے دنیا کی سب سے بہترین طباعت و اشاعت کا ادارہ، اللہ رب العزت نے اسباب ہی فراہم نہیں کیے عمدہ اور اعلیٰ درجے کی ٹیم بھی فراہم کر دی۔ آج دارالسلام عالم اسلام کا سب سے نمایاں ادارہ قرار دیا جا رہا ہے، ہم ۱۴۰۰ھ سے زائد ٹائٹل چھاپ چکے ہیں۔ ۱۵۵۰ انگلش میں اور ۳۳۰ اردو میں۔ بانی عربی میں۔ ۳۰ ممالک میں ہماری فرنیچر کمز کام کر رہی ہیں۔ ۱۰۰۰ نئی کتابیں آنے والی ہیں۔ ہماری ہر کتاب کا ایڈیشن ۳ ہزار کا ہوتا ہے۔

یہ بھی ایک نئی روایت ہے کہ ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن آچکے ہیں۔

لوگ پوچھتے ہیں آپ کی کامیابی کی وجہ کیا ہے؟ اللہ کی رحمت اور کرم کے بعد میری والدہ، ان کی دعائیں، صدقہ خیرات بھی بہت کرتی تھیں۔ میری اہلیہ میرے کئی کاموں میں مشاورت میں شامل ہوتی ہیں۔ میرے بچے جو ہر حال میں میرے قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ میرا شاف، آپ کو حیرت ہو گی ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو سفر کے آغاز سے میرے ساتھ ہیں۔ میں نے ان کی خبر گیری میں کوتاہی نہیں کی۔ ان کی عزت، مرتے، سہولت اور تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کے علم میں اضافے کی پوری طرح سعی کرتا ہوں۔ اپنے شاف کو تنخواہ ہم ڈالیں

اب تک ۲۵ زبانوں میں قرآن پاک چھاپ چکے ہیں

دیتے ہیں تاکہ مہنگائی کا بہت زیادہ اثر ان پر نہ ہو۔ اچھے لوگوں اور اچھی ٹیم پر میرا یقین اور جو میرا ہمیشہ فوکس رہا ہے۔ آج پرائیویٹ سطح پر آپ کو اتنے عالم کی ایک ادارے میں اکٹھے کام کرتے کم ہی نظر آئیں گے۔ جو ایک بار دارالسلام آ جاتا ہے وہیں نہیں جاتا۔ مشن سمجھ کر وابستہ ہو یا نوکری جان کر آئے۔ اسے جلدی ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ”دین بھی ہے اور دنیا بھی“۔ پھر جہاں عزت نفس کے ساتھ کام کی آزادی ہو وہاں کوئی کیوں نہیں کام کرنا چاہے گا؟

سچ تو یہ ہے کہ یہ اب ایک افراد ساز ادارے کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ عالم یہاں آ کر ریسرچ کاربن رہے ہیں۔ تحقیق و جستجو کے جدید اور قدیم اصولوں کو یکے ہیں اور پھر ہر کتاب کو، تحریر کو ان اصولوں کی بنیاد پر لکھتے

ہیں، جانچتے ہیں۔

عالم کی خوبی صرف اس کی ذات تک ہوتی ہے۔ ہم نے علماء کو سکالربے اور اپنانے کا پلیٹ فارم بنا دیا ہے۔ کتاب کے مواد کی پیش کش تو خوبصورت اور پرکشش ہونا ہی چاہیے ہم نے مواد کو مستند ترین حوالوں سے پرکھنے کی طرح ڈالی ہے۔ علماء کو اردو ادب پڑھنے کی تربیت دی ہے زبان و بیان کے رموز سکھائے ہیں۔ اس وقت ۵۰ ہفتہ وقتی علماء ہمارے ساتھ لاہور آفس میں وابستہ ہیں۔ ان میں ۹۰ فیصد وہ ہیں جو پہلے دن سے ہماری ٹیم کا حصہ ہیں۔ ہمارے ہاں وزٹ کے لیے آنے والے حیران ہوتے ہیں کہ ایک ہی جھٹ تلے اتنے علماء جمع ہیں اور اس قدر عمدگی سے کام کرتے ہیں۔

دارالسلام کے آغاز کی ایک وجہ بے شک تجارت بھی ہے مگر ہم سارے ہی اسے عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ ہمارے ریاض آفس میں مختلف زبانوں کا علم رکھنے والے، مترجم اور ایڈیٹر ہیں۔ ان کی تعداد ۱۰۰۰ سے زائد ہے۔ سعودی عرب میں ہماری ۱۰ برانچیں ہیں، نیویارک، بوٹمن، لندن، شارجہ، آسٹریلیا، ملائیشیا سمیت ۳۰ ممالک میں شاخیں ہیں۔ ساتھ میں اسلامک سپر مارکیٹ کا تصور دے رہے ہیں۔

مولانا صفی الرحمن مبارک پوری کے ساتھ کام عالم اسلام کی مقبول کتاب الرجن الختم جسے رابطہ عالم اسلامی نے شاہ فیصل ایواڈ سے نوازا تھا کے نامور مصنف ایڈیٹر آخری عمر میں دارالسلام میں قائم ریسرچ سنٹر کے ”رسالہ تک سربراہ رہے۔ ان کی وجہ سے ہمیں بہت تقویت ملی۔ وہ مدینہ یونیورسٹی میں سیرت حبیب کے سربراہ تھے۔ جب میں نے ان سے اپنے ہاں آنے کی گزارش کی تو لوگ حیرت سے پوچھتے تھے۔ مولانا صفی الرحمن مبارک پوری آپ کے ہاں کام کرتے ہیں تو میں پورے یقین سے کہتا تھا میں عبدالملک ان کے پاس کام کرتا ہے۔

نوبل قرآن۔ ۳ ملین کا پیاں

ہماری سب سے بڑی سعادت نوبل قرآن کی تیاری اور اشاعت ثابت ہوئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ کرنے والی شخصیت ڈاکٹر محمد حسن خان صاحب پنجاب کے شہر قصور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایم بی بی ایس کر کے دل کے امراض کے ماہر بنے۔ پھر برطانیہ چلے گئے اور وہاں سے سعودی عرب، ننگ عبدالعزیز السعود کی بادشاہت میں وزارت صحت سے وابستہ ہوئے۔ ۱۵ سال اسی وزارت میں



وزیر اسلامی امور شیخ صالح بن عبدالعزیز دارالسلام (ریاض) آمد کے موقع پر

رہے، زیادہ وقت طائف میں گزارا۔ شاہ خالد کے عہد میں ان کو سعودی عرب کے پہلے جیسٹ ہسپتال کا ایم ایس بنایا گیا۔ اُن کو خواب میں آنحضور ﷺ کی زیارت ہوئی، خواب میں ہی استعفا دیا اور پھر حضور ﷺ کے کہے لفظوں کی حفاظت اور خدمت پر لگ گئے۔ انتہائی وجہیہ، سرخ و سفید رنگت اور پُرکشش شخصیت کے حامل۔ انھوں نے قرآن پاک کا انگریزی میں بہت عمدہ اور معیاری ترجمہ کیا۔ میں ان سے اجازت لینے گیا۔ ان کی سیرت اور صورت دونوں نے موہ لیا۔ میں نے ترجمے کی راہنمائی کا پوچھا۔ بولے راہنمائی لے لی تو قیامت کے روز آنحضور ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ نوبل قرآن کے ترجمہ والا یہ منصوبہ بہت بڑا تھا۔ راہبواں شوگر ملز کے

یوسف سیٹھی صاحب کو اللہ نے چن لیا۔ انھوں نے بہت کھلے دل کے ساتھ اس پر رقم خرچ کی۔ ہدف یہ تھا کہ نسخہ صحت کے اعتبار سے بہترین ہو۔ ۱۹۹۳ء میں اس کا پہلا ایڈیشن چھپا۔ الحمد للہ اب تک ۳ ملین (۳۰ لاکھ) کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔

نوبل قرآن آج دنیا کا سب سے معروف اور مقبول انگریزی ترجمہ مانا جاتا ہے۔ احادیث کی روشنی میں اس میں مختصر حواشی بھی ہیں۔ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مدینہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے بھی اس پر بہت کام کیا۔ سعودی گورنمنٹ اور علماء کے بورڈ نے منظور کیا تب یہ طبع ہوا۔ میرا خواب یہ تھا کہ دنیا میں بائبل سب سے عمدہ ۵۶ گرام کاغذ پر اور پاکٹ سائز میں چھپتی ہے۔ نوبل قرآن کو ویسی ہی کوئی سے چھاپا جائے۔ اٹلی میں پریس تھا۔ میں وہاں پہنچا ان کے پاس نئی سال کی بکنگ تھی۔ میں نے ان سے بکنگ کی تاریخ لی۔ کاغذ وہ صرف خاص کارخانے سے لیتے ہیں جو صرف بائبل کے لیے ہی بنایا

جب صحاح ستہ ایک جلد میں چھپ کر میرے ہاتھوں میں آئی تو وہ زندگی کا خوشگوار ترین لمحہ تھا۔ تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا اور میرے ہاتھوں ہوا تھا

جاتا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے عمدہ، باریک اور دیر پا کاغذ ہے۔ میں وہاں پہنچا، ان سے کاغذ کی بات کی۔ اس پریس سے جہاں ہمیشہ بائبل چھپی، پہلی بار قرآن پاک شائع ہوا۔ ۱۰ ہزار کا پہلا ایڈیشن چند دنوں میں امریکا میں فروخت ہو گیا۔ ہم وہاں سے ۱۲ ایڈیشن اوطیع کرائے۔ ابھی بہت آدرز تھے مگر انھوں نے انکار کر دیا کہ ہمارے پالیسی سازوں نے منع کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں صرف بائبل چھاپیں گے۔ میں اس فیئری میں پہنچا

مدارس کا نصاب بدلنے میں ۱۵ ارسال

ہمارے ہاں جو کبھی مدارس کے لیے جدید نصاب ترتیب دے رہی ہے۔ وہ وفاق المدارس کے خطوط پر پرکام کر رہی ہے۔ پروفیسر محمد یحییٰ صاحب اس کے چیئرمین ہیں۔ ۶ کتابیں آچکی ہیں۔ ۱۵ سال لکھیں گے سارا سلیبس بدلنے اور مدارس کے نظام میں جوہری تبدیلیاں لانے میں۔ تب پورا سٹرکچر بدل جائے گا۔ عصری تعلیم کی طرف رجحان کافی ہو چکا ہے۔ امید ہے اس سے مدارس کا کام اور موثر اور بہتر ہو جائے گا۔

اور پوچھا کہ آپ کاغذ اور کون کون چھاپتا ہے بھر نہیں دوسرے اچھے پریسوں کا بھی پتا چل گیا جہاں اسی کاغذ پر طباعت ہوتی تھی۔ یوں عمدہ ترین کاغذ پر نوبل قرآن کی ایک نہ ختم ہونے والی طباعت کا سلسلہ چل پڑا۔ اس کے بعد ہم نے مختلف زبانوں میں قرآن پاک چھاپنے کا آغاز کیا۔ اب تک ۲۵ زبانوں میں قرآن چھاپ چکے ہیں۔

صحاح ستہ کا ۱۰۰ ارسال بعد ترجمہ

ہدف یہ تھا کہ صحت اور اسناد کے اعتبار سے احادیث اور سیرت پر بہترین کام ہو۔ ہندوستان کے مولانا صفی الدین مبارک پوری علمی کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ وہ احادیث کے خدا داد کمپوٹر تھے۔

صحاح ستہ کا انگریزی ترجمہ ۳۸ جلدوں میں چھپا ہے۔ اللہ والہ المرجان (یعنی بخاری اور مسلم کی مشفق علیہ احادیث کا مجموعہ) کا بھی ترجمہ کرا لیا ہے۔ صحاح ستہ کا ترجمہ کوئی ۱۰۰ ارسال پہلے ہوا تھا۔ مشکل الفاظ پر پرانی زبان، تشریح کی بھی ضرورت تھی۔ علماء اور شیوخ الاحادیث جمع کیا اور اس بڑے منصوبے پر کام کا آغاز کیا۔

سنن ابو داؤد (۴ جلدوں میں) سنن نسائی (۵ جلدوں) سنن ابن ماجہ (۵ جلدوں) شائع ہو چکی ہیں۔ یہ مختلف سائز میں ۱۴۴۰ صفحات سے ۱۹۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر محسن صاحب نے صحیح بخاری کا پہلا

ترجمہ کیا اور یہ ۹ جلدوں میں طبع ہوا۔

صحاح ستہ ایک جلد میں بھی اٹلی سے چھپوائی گئی۔ ۲۷ صفحات A/4 سائز اور ۲۰ گرام پیپر پر۔ تین ہزار کاپیاں چھپوائی گئیں۔ میں ۱۰ دن وہیں اٹلی کے پریس میں بیٹھا رہا۔ یہ میرا دیرینہ خواب تھا۔ اس کی تکمیل کا لمحہ لمحہ اپنے سامنے تکمیل پاتا دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ پروف ریڈنگ کرتا رہا۔ جب صحاح ستہ ایک جلد میں چھپ کر میرے ہاتھوں میں آئی تو وہ زندگی کا خوشگوار ترین لمحہ تھا۔ تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا اور میرے ہاتھوں ہوا تھا۔ مجھے مارے لمحے یاد تھے۔ ساری نیم دن رات کام کر رہی ہوتی۔ صبح وشام کھانا پینا تک دارالسلام کی طرف سے تھا کہ کسی سکارلر، عالم کو ہمیں ذرا سی دیر کے لیے بھی جانا نہ پڑے۔ مدد و رہنمائی کے لیے ہندوستان سے

دارالسلام کی ترقی کا راز

میری اور دارالسلام کی دنیاوی ترقی میں اگر کوئی ایک راز پنہاں ہے تو وہ یہ ہے کہ جو ادارہ ایک بار کر لیا، اسے بدلا نہیں۔ اس کو بخیر انجام تک پہنچانے کے لیے سوچنے، وسائل بہم پہنچانے سے لے کر بہترین کام کے بندے ڈھونڈنے اور کام پر لگا دینے تک چھوٹی بڑی ہر چیز کا دھیان رکھتا ہوں۔ آپ کو تجب ہوگا مگر یہ سچ ہے کہ میں روزانہ اپنے ادارے کے لیے نیک صالح، دیانت دار اور باصلاحیت افراد کار کے ملنے کی دعا کرتا ہوں۔ جو میرے ساتھ کام کرتے ہیں ان کی دل سے خیر خواہی چاہتا ہوں۔ کئی بار تو حرم میں جا کر بھی اللہ سے التجا کرتا ہوں تب کام کے آدمی ضرور ملتے ہیں۔

میں نے زندگی سے یہ سیکھا کہ بہترین ایمان کا تقاضا یہ ہے انسان صلہ رحمی میں کوتاہی نہ کرے۔ مجھے ہمیشہ اپنے خاندان اور اہل خاندان کا خیال اور دھیان رکھنا، درگزر سے کام لینا عزت نفس کا خیال رکھنا، حفظ مراتب کا خیال رکھنا عزیز رہا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں کے ”فتح الباری“ (بخاری کی شرح) مخطوطات منگوائے گئے۔ میں طبع شدہ صحاح ستہ کی کاپیاں لے کر ریاض پہنچا۔ تب وہاں ایک بہت بڑی نمائش چل رہی تھی۔ صحاح ستہ وہاں مرکز نگاہ بنی رہی۔ کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی کتاب ایک ہی جلد میں کیے آسکتی ہے۔

شروع دن سے طے کیا کہ کتابوں کی طباعت و اشاعت میں کبھی معیار پر کچر و ماز نہیں کریں گے

۴ مئی ۱۹۹۴ء دارالسلام لاہور کا قیام

اُردو بازار غزنی سٹریٹ لاہور میں میری ایک دکان موجود تھی۔ میں نے اپنے بھائی عبدالعظیم (جو میرے دوست، مخلص نائب اور میرے بچوں کے ماموں بھی ہیں) سے جو علوم دین کی تعلیم مکمل کر کے فارغ ہوئے تھے اور سعودی عرب آنے کے خواہش مند تھے۔ ان سے کہا کہ آپ یہاں دارالسلام کا کام شروع کرو۔ کتابیں میں سعودی عرب سے بھجواتا ہوں۔ یوں ۱۹۹۴ء میں پہلا کنٹینر لاہور آیا۔ جسے خود انھوں نے کریم بلاک میں اپنے ہاتھوں سے اتر دیا۔ یہ قرآن و حدیث کے حوالے سے مختلف معروف اور مستند عربی کتابیں تھیں۔ اللہ نے اس قدر برکت دی کہ وہاں سے ہم لوہڑ مال پہ جہاں قومی پریس تھا منتقل ہوئے۔ وہاں پورا فلوور لے لیا۔ ۷ سال وہاں رہے پھر سیکرٹریٹ شاپ کے ساتھ اپنا پریس لگایا اور دارالسلام سپر مارکیٹ بنائی۔ یہ ۳ منزلہ بلڈنگ ہے۔ یہاں ریسرچ سنٹر کا آغاز فروری ۱۹۹۵ء میں ہوا۔ کتاب و سنت کی اشاعت آسان نہیں ہے۔ صحت کا خیال رکھنا، اصل مراجع اور مصادر سے لے کر ہر تحریر کو غلطیوں اور شبہات سے پاک رکھنا۔ اس کام کے لیے بہترین دماغ درکار تھے۔

آغاز حافظ صلاح الدین یوسف سے کیا گیا۔ شریعت کورٹ کے ایڈوائزر رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ٹیم بنی گئی۔ یہیں ہم نے پروف پڑھنے کا ایک باقاعدہ شعبہ بنایا۔ ایک بہترین شعبہ ڈیزائن قائم کیا۔ ہم نے شروع دن سے طے کیا کہ کتابوں کی طباعت و اشاعت میں کبھی معیار پر کپور و مائز نہیں کریں گے۔ کوئی نہ صرف ریسرچ کی بلکہ طباعت و اشاعت کی ہر صورتوں میں ترجیح اول رہے گی۔ بہت لوگوں نے کہا کتابیں بہت اچھی ہیں۔ سستا ایڈیشن بھی چھاپیں۔ ہم نے بات نہیں مانی۔ ہماری ۳۰ فیصد کتابیں ۴۰ رکر ہو چکی ہیں۔ بہترین اور عمدہ کاغذ پر ان کی طباعت ہوئی ہے۔ آنے والا دور ۴۰ رکر کتابوں کا ہے۔ ہم نے ابھی سے اپنی ہر کتاب کو ۴۰ رکر کرنے کا عمل شروع کر دیا ہے۔

ہمارا سالانہ ٹرن اوور ۴۳ ملین ریال ہے۔ ہم نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا ٹلٹ یعنی ۳۳ فیصد حصہ فی سبیل اللہ خرچ کریں گے۔ اس پر عمل پیرا ہیں۔ سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ ابن باز کے میں تو انھیں اس دور کا حاتم طائی کہتا ہوں۔ ان کے ہاں دو وقت امیر و غریب کے لیے دسترخوان سجا رہتا ہے۔ کیا آدمی تھے۔ ان کو ویسا ہی ہونا چاہیے کھلے ہاتھ والا۔ انہیں مل کر ویسا بننے کی آرزو ہو جاتی تھی۔

اصل اسلامی سپرٹ تو یہی ہے

یہی سوچ کر ہم نے پاکستان میں باقاعدہ ٹرسٹ بھی بنا دیا ہے۔ دینی اور تعلیمی ادارے بنانے کے ساتھ ساتھ، مساجد بنا رہے ہیں۔ ڈسپنسریاں قائم کر رہے ہیں۔ خوشی کے ایام میں تحائف تقسیم کرتے ہیں۔ یہاں پاکستان میں عبداللطیف اسد سارا نظام بحسن و خوبی دیکھ رہے ہیں۔ دو زون بنا رکھے ہیں۔ زون ۱۔ حافظ آباد میں، اسے محمد طارق شاہد دیکھتے ہیں زون ۲۔ واربرٹن شیخوپورہ، پروفیسر امان اللہ بھی دیکھتے ہیں۔ ننگران سٹی عمران ناصر صاحب اور شریچورٹی محمود الحسن بڑی صاحب، خیر کے ان کاموں میں

کیلانی سپراور کیلیانوالہ گاؤں

ضلع گوجرانوالہ میں قادر آباد ہڈیریاں پر جانے والی سڑک پر کیلیانوالہ گاؤں واقع ہے اور اس میں رہنے والا ہمارا خاندان کیلانی سپرا کہلایا۔ بارہویں پشت میں جو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں حکیم حاجی محمد عارف یہاں آئے۔ چھٹی پشت کے بزرگ فیض اللہ نے اپنے بیٹے ہدایت اللہ کے لیے دو قلمی نئے چھوڑے، کیلانی اور منہجہ المصلیٰ۔ ماضی میں علمی خاندانوں میں ہمیشہ روایت برہی ہے کہ باپ اپنے بیٹوں کے لیے کتابیں لکھتے ان کی علمی، عملی اخلاقی معاشی تربیت بھی ہوتی۔ فیض اللہ جہانگیر کے عہد میں جامع مسجد دہلی کی امامت و خطابت پر فائز رہے۔ کتابت کے رموز خاندان کے ہر فرد نے سیکھے کتابت بطور پیشہ بہت زیادہ معروف تب ہوئی جب مشنی طباعت کا آغاز ہوا اور کتابتیں پریس میں چھپنے لگیں۔ یہ زمانہ چھٹی پشت میں محمد دین، امام دین اور سلطان احمد محمد دین کے بڑے بیٹے محمد مصطفیٰ میرے دادا تھے۔ ان کے والد محمد بخش ۱۸۱۴ء میں کیلیانوالہ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے کتابت کے رموز سیکھ کر فن کمال کو پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ تیر اندازی کی مشق کے دوران انھوں نے دور سے تیروں کی مدد سے دیوار پر چپاں ایک کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی۔ انھیں کسی نے ۱۸۶۱ء میں زہر دے کر راہی ملک عدم کر دیا۔ ان کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ میرے دادا محمد مصطفیٰ انہی کے بیٹے تھے۔ میرے والد محمد یونس کے تین بیٹے تھے محمد ایوب، محمد طارق اور عبدالملک مجاہد۔ میرے والد کو کتابت میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ اچھے خطاط اور باعمل انسان تھے۔ ۵۵ سال کی عمر میں حافظ آباد میں فوت ہوئے۔

ہمارے دست و بازو ہیں۔

دارالسلام حفظ و مڈل سکول سسٹم

دارالسلام حفظ و مڈل سکول سسٹم، واربرٹن

پرائمیری پاس بچوں کو انٹری ٹیسٹ کے بعد داخلہ دیا جاتا ہے اور تین سال میں حفظ کے ساتھ ساتھ مڈل کی ریکورڈ تعلیم دی جاتی ہے۔ مڈل کا مکمل نصاب پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کا پڑھایا جاتا ہے۔ مڈل کی تعلیم کا طریقہ کار اس طرح ہے کہ چھٹی اور ساتویں کلاس میں تین مضمون (انگلش، ریاضی، اردو) ریکورڈ پڑھائے جاتے ہیں۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اردو اور انگلش خوشخطی پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے ہر روز ۲۰ گھنٹے سکول کی کلاس ہوتی اور ایک گھنٹہ ہوم ورک کے لیے۔ یہ ایک بورڈنگ سکول ہے جس میں حفظ القرآن اور دینی تربیت کے ساتھ فل ٹائم سکولنگ کرائی جاتی ہے۔

دارالسلام ٹرسٹ کے زیر انتظام عرصہ ۵ سال سے واربرٹن سٹی میں اس سسٹم کے تحت تین مساجد (جامع مسجد ریاض الاسلام، مسجد فاران اور مسجد ریاض الجنۃ) میں کام ہو رہا ہے۔ ان مساجد میں چھ کلاسیں اور ۱۲۰ طلباء حفظ و مڈل کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اب تک ۵۷ طلباء حفظ و مڈل کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

دارالسلام حفظ و مڈل سکول سسٹم کے تحت شیخوپورہ سٹی، ننگران سٹی اور شریچورٹی میں ابتدائی طور پر اسکول شروع کیا گیا ہے۔ یہ منصوبہ بڑا منفرد اور تربیتی اعتبار سے عظیم الشان ہے۔

الرحمۃ انسٹیٹیوٹ

داربرٹن سابقہ ضلع شیخوپورہ اور موجودہ ضلع ننگران کا

جدید ترین پریس لگانے کا خواب

میں نے ۱۹۹۴ء میں ایک ایسا جدید پریس لگانے کا خواب دیکھا تھا جو صرف قرآن و سنت کی ترویج و اشاعت کا کام کرے۔ اللہ نے اس کا بھی اہتمام کر دیا ہے۔ لاہور میں شیخوپورہ روڈ سمروے پر کونٹ عبدالمالک انٹرچینج کے بالکل ساتھ ۵۵ ایکڑ میں دارالسلام پرنٹنگ کمپلیکس تیار کیا جا رہا ہے۔

اس کا فرٹ ۵۰۰ رتھ ہے۔ یہ اسلامی دنیا میں بہترین قرآن پاک کی طباعت اور دینی کتب کی اشاعت کا مرکز ہو گا ان شاء اللہ۔ جرمنی سے جدید ترین مشینری آ رہی ہے جو ”آٹو بائڈری“ ہوگی۔ یہاں ۵۰ رتھ سے زائد زبانوں میں قرآن پاک کے ترجمے کے لیے ریسرچ سنٹر قائم کر رہے ہیں۔ یہ لوڑ مال سے صرف ۱۴ کلومیٹر پر ہے۔ انجینئر کاشف شہزاد باجوہ نے ہمارے ساتھ ہی ۵۵ ایکڑ کا پلاٹ لیا ہے۔ وہ سائنسی ایجادات کو قرآن کی رہنمائی میں بطور پراڈکٹ بنانے اور مارکیٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ایک تاریخی قصبہ ہے جو ہر مذہب و مسلک سے وابستہ لوگوں کا مسکن ہے۔ تمام مذاہب و مسالک کے لوگ اپنے اپنے اسلوب کے مطابق دینی و تبلیغی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ اس قصبے میں خالص کتاب و سنت کے حاملین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جو شروع ہی سے انفرادی



ڈاکٹر ذاکر ناہیک
دارالسلام ریاض آفس میں

طور پر تعلیم و تعلم اور دعوت و تبلیغ کا کام کر رہے تھے۔ اسی دعوت و تبلیغی سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے دسمبر ۲۰۰۲ء میں واربرٹن کے چند مخلص احباب نے پروگرام بنایا کہ ۲۰۰۹ء میں طلبہ کے لیے بھی ریلوے اسٹیشن واربرٹن کے عقب میں چھوٹی سی مسجد ریاض الجنۃ کے اندر ”الرحمۃ ٹرسٹ“ کے زیر انتظام ”الرحمۃ انسٹیٹیوٹ“ کے نام سے شعبہ علوم اسلامیہ کا آغاز کر دیا جائے۔ چنانچہ اب الحمد للہ ”روشنی جنرل ہسپتال“ واربرٹن کے عقب میں ایک شاندار عمارت میں اسے منتقل کر دیا گیا ہے۔ ”الرحمۃ انسٹیٹیوٹ“ کو اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی سے بڑی اچھی شہرت سے نوازا ہے۔ اس وقت انسٹیٹیوٹ سے صوبہ پنجاب اور صوبہ خیبر پختونخوا کے دور دراز علاقوں کے طلبہ بھی فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ان تمام تعلیمی اداروں میں ۳۰۰ بیرونی طلبہ و طالبات رہائش پذیر ہیں جن کے قیام و طعام اور علاج معالجہ کا انتظام نہایت احسن انداز میں کیا جا رہا ہے۔ یہاں میٹرک سے ایم۔ اے تک تعلیم کا بندوبست ہے۔

دارالسلام۔ امت کا اثاثہ

آج میں پوری دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ دارالسلام جو ایک گیلی گرافر کا خواب تھا۔ اب امت کا اثاثہ بن گیا ہے اور اس اثاثے کا اصلی سرمایہ ہمارے سکارلز اور علماء ہیں۔ پروفیسر یحییٰ صاحب ۵۷ سال کی عمر میں جب یہ کہتے ہیں کہ یہاں آکر تھکاؤٹ نہیں ہوتی روزانہ بے حد خوشی ہوتی ہے۔ ان جیسے اہل علم کا اکرام اور احترام مجھ پر اور میری پوری ٹیم پر واجب ہے۔ سارے کام کرنے والوں کی پذیرائی اور عزت افزائی ہمیشہ میرے پیش نظر رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں دارالسلام کی کامیابی میں اس رویے کا بھی ضرور دخل رہا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا ”مسلمان نرم طبیعت اور نرم خو ہوتا ہے۔“ ہمارے ہاں کسی ایک مکتبہ فکر کے عالم نہیں ہیں۔ مولانا تقی عثمانی صاحب کے شاگرد مفتی عبدالمسیح بھی ہیں جنہوں نے ان سے شخص کیا۔ میں نے اپنے لیے منبر کے بجائے رہنما کا رول پسند کیا ہے۔ اس

چینی منبر کا قبول اسلام

مسلمانوں میں تعلیم برائے تربیت کی سوچ کبھی بہت پیچھے چلی گئی ہے۔ ساری تعلیم برائے معیشت، نوکری اور پیسے کے لیے ہو رہی ہے۔ اسی لیے وہ خوشی اور برکت سے خالی ہے اور تاثیر نہیں اڑ گئی ہے۔ میں جب پہلی بار چین گیا۔ مختلف لوگوں سے ملا۔ اداروں کے ورث کیے پھر اپنا آفس وہاں کھولا۔ اب ہماری کتابیں جہاں اٹلی، بیروت سے باقاعدگی سے چھپ کر آتی ہیں۔ وہاں چین سے بھی بڑی تعداد سے چھپ کر آتی ہیں۔ وہاں کے ہمارے چینی آفس منبر کو ہمارا کام اور کلام دونوں اچھے لگے اور الحمد للہ مسلمان ہو گئے۔ ان کا نام یونس پول ہے۔ بہت بخشنے ہیں۔ انھیں بھی اسلام کا یہ پہلو بہت اچھا لگتا ہے کہ تعلیم برائے تربیت ہو۔ ہم نے دارالسلام کے تعلیمی اداروں میں اس کا بطور خاص اہتمام کیا ہے۔

آنے والے دنوں میں ہماری ہر کتاب کی سوفٹ کاپی نیٹ پر دستیاب ہوگی۔ Embided پر ۲۰ روپے کتابتیں آچکی ہیں۔

بلیک بیری اور نوکیا کی Application پر کافی کام ہو چکا ہے۔ ایسے ہر کام میں تعلیم کے ساتھ تربیت ہمارا منظر ہے۔

لیے سفر و حضر میں سوچنے، نئی نئی راہیں تلاش کرنے اور بہترین وسائل مہیا کرنے کی فکر رہتی ہے۔

میرے اہل خانہ

اللہ نے مجھے ۶ بیٹے اور دو بیٹیاں دی ہیں میرا بڑا بیٹا عکاشہ مجاہد اب انٹرنیشنل مارکیٹنگ دیکھ رہا ہے۔ دوسرا بیٹا حافظ عبدالغفار مجاہد، میرے تمام ذاتی معاملات اور مینجنگ دیکھتا ہے۔ تیسرا بیٹا حافظ طلحہ آئی ٹی کا ماہر ہے۔ پورا شعبہ قائم کر دیا ہے۔ عبداللہ، عبدالرحمن اور محمد ابھی پڑھ رہے ہیں۔

میری اہلیہ حافظہ اہلبہ فردوس عالمہ اور مبلغ ہیں۔ وہ ریاض میں الصلحی انٹرنیشنل سکول چلاتی ہیں جو فیڈرل بورڈ اسلام آباد سے ملحق ہے۔ ۷۰۰ بچے، بچیاں وہاں پڑھ رہے ہیں۔ وہ ریاض میں خواتین کے قرآن و سنت کی تعلیم کے ۲۲ حلقے بھی چلا رہی ہیں جہاں وہ ہفتہ وار درس دیتی ہیں۔

میرے شوق اور احساس

مجھے تاریخ پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ دو اڑھائی سو سے زائد کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ سیرت پر لکھی گئی کتابیں بہت چاہت سے پڑھتا ہوں۔ یوں تبھی کتابوں کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ جس ملک میں جاؤں وہاں اسلام سنٹر اور بک سنٹر پہلے ڈھونڈتا ہوں۔ آفس سے آ کر مغرب تا تار ۹ بجے تک لکھنے کا کام کرتا ہوں۔ اب تک ۱۵ کتابیں لکھ چکا ہوں۔ سعودی عرب کے مقبول اردو اخبار میں کالم بھی لکھتا ہوں۔

میں اپنے رب کا بہت شکر گزار ہوں۔ بہت اچھی اور بھرپور زندگی کی نعمت ملی ہے۔ ریاض میں ہونے کی صورت بچوں کے ساتھ شام کو واک پر بھی جاتا ہوں اور باہر کھانا بھی کھاتے ہیں۔ میری مصروفیات کے باعث بچوں کی تعلیم اور کیریئر سارا اہلیہ کے ذمے تھا۔ ۳۲ رسالہ کل ریاض میں رہتے ہوئے جب دارالسلام ہمارے چھوٹے گھر کے کچن سے شروع ہوا تھا کیونکہ اس کا دروازہ باہر کو کھلتا تھا۔ میری اہلیہ نے وہ میرے حوالے کر دیا تھا اور خود بچوں دوسری جگہ شفٹ کر لیا۔ میں نے وہاں کیونٹر رکھ کر کمپوزنگ سے کام کا آغاز کیا تھا۔

میں تنہائی میں رو دیتا تھا اور دعا کرتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی صورت اور سیرت کو موتیوں کی طرح پیش کروں کہ دیکھنے پڑھنے والے اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اب جب دنیا بھر کے ممالک میں دارالسلام کا پیغام اور کام لیے پھرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے اللہ نے میری دعائیں لی ہے۔

(معلومات کے لیے جناب عبدالعظیم اسد، پروفیسر محمد یحییٰ، عکاشہ لہو اور محترمہ اہلبہ فردوس کا شکریہ)

میوزک کے بغیر بابا سلام اور ڈیجیٹل قرآن چند سال قبل جدہ کے ایئر پورٹ پر میں اپنے چھوٹے بیٹے محمد کے ساتھ شاپنگ ایریا میں گھوم رہا تھا جب اس نے ایک خوب صورت اور مین موہنا کھلونا اٹھایا۔ اس نے جو بٹی بن دیا کھلونے نے حرکت شروع کر دی۔ ساتھ ہی میوزک کی آواز آس پاس نکھرنے لگی، میں نے آگے بڑھ کر کھلونے کا بٹن بند کرنا چاہا۔ بچے نے مزاحمت کی اسے کھلونا اور اس سے آتی آوازیں اچھی لگ رہی تھیں۔ بار بار سمجھانے، پکارتے پر بھی وہ کھلونا واپس کرنے پر آمادہ نہیں ہوا تو میں نے اسے متبادل دینے کے لیے مختلف کھلونے دیکھنے شروع کیے۔ ہر کھلونا شکل سے مختلف تھا مگر ایک سا میوزک اور گانے اس کا حصہ تھے۔ اس لمحے میں نے پہلی بار سوچا کتنے ہی والدین اور بھی ہوں گے جو یہاں وہاں اپنے بچوں کی فرمائش پہ ایسے کھلونے ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے جن میں میوزک نہ ہو۔

یہی لمحہ تھا جب میں نے سوچا متبادل یہ مجھے ہی کام کرنا ہوگا۔ وہاں سے میں چین گیا اور ان لوگوں سے ملا، جہاں ان سارے کھلونوں میں میوزک فیڈ کیا جاتا ہے، ۲۰۰۳ء وہ سال ہے جب دارالسلام کی طرف سے ”بابا سلام“ کے نام سے ایک خوب صورت پراڈکٹ بھی سامنے آگئی۔ کھلونے کو ہم نے یوں مسلمان کیا کہ اس میں قرأت کے علاوہ دعائیں اور اذکار ڈال دیے۔

اس کے بعد ہم نے عالم اسلام کا پہلا ڈیجیٹل قرآن بھی چین میں ہی تیار کیا جسے آپ قلم کی مدد سے پڑھنے اور ساتھ ہی قاری کی قرأت سنتے جاتے ہیں۔ یہ بے حد خوب صورت اور متاثر کن پیش کش ہے اور انسان کو حیران کر دیتی ہے۔ اس قلم کی مدد سے آپ کوئی بھی آیت ڈھونڈ سکتے ہیں اور مختلف قراء کی آواز میں قرأت سن سکتے ہیں۔

دینی و عصری تعلیم کی شمع

اسے مزید روشن کرنے میں ہمارا ساتھ دیں

محترمی و مکرمی جناب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

■ کیا آپ کے پاس ایک قرآن مجید ہے؟

تمام مسلمان بہن بھائیوں اور خصوصاً آپ سے التجا ہے کہ آپ کے پاس اگر ایک سے زیادہ مترجم قرآن مجید، قاعدے، سپارے، بخاری شریف یا حدیث کی کوئی کتاب یا دیگر اسلامی کتابیں موجود ہوں تو ضائع نہ کریں بلکہ ادارہ آمنہ جنت کی لائبریری کو عطیہ کریں۔ جب تک طالبات ان کو پڑھتی رہیں گی، ثواب آپ کو ملتا رہے گا اور یہ صدقہ جاریہ بھی ہے۔

■ اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے؟

ادارہ کو تفاسیر قرآن کریم، کتب حدیث اور دیگر اسلامی کتابیں خود تشریف لا کر پہنچا دیں یا ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرمادیں۔ ہم تفسیر قرآن کریم بازار سے لے کر رسید آپ کو بھیجوا دیں گے ان شاء اللہ

■ دعوت

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ماسوائے اتوار کے کسی بھی دن کسی بھی وقت جس میں آپ کو آسانی ہو ادارے کا وزٹ فرمائیں۔ ہمارے کام تعلیم القرآن و عصری تعلیم کو چیک کریں۔ اگر دل گواہی دے کہ کام احسن طریقے سے ہو رہا ہے تو پھر تفاسیر قرآن کریم و کتب حدیث عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

■ نوٹ:

منی آرڈر یا کتابیں بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ وقتی دیتے وقت ادارے کی رسید وصول کریں۔ شخصی نام پر ہرگز ارسال نہ فرمائیں شکریہ۔ نیز ادارے کو دیے جانے والے عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

رضیہ پروین

(ایم۔ اے عربی، ایم۔ اے اردو۔ وفاق المدارس)

آمنہ جنت فاؤنڈیشن گرلز ماڈل سکول رجسٹرڈ

چونیاں سٹی ضلع قصور (۵۵۲۲۰)

Ph: 0300-4735932 / 0333-4935205



2050ء سکول اور کلاس روم کا
روایتی تصور ختم ہو جائے گا

ولی زاہد۔ پروفائل



ولی زاہد معروف کنسلٹنٹ، سپیکر، لیڈر شپ ٹرینر اور ایگزیکٹو کوچ ہیں۔ وہ Skill City کے چیف ایگزیکٹو ہیں۔ وہ جنوب مشرقی ایشیا، مشرق وسطیٰ، مشرقی افریقہ، یورپ کے مختلف ممالک میں اپنی صلاحیت کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ گزشتہ ۱۵ برسوں میں بے شمار نیچر اور بزنس لیڈران کی ٹریننگ سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ ولی زاہد خود اپنی ٹریننگ اور تعلیم کے لیے امریکا، کینیڈا اور کئی دیگر ممالک میں جا چکے ہیں۔ ولی زاہد آئی بی اے اور Szabist جیسے بڑے اداروں میں MBA لیول کے کورس پڑھاتے رہے ہیں۔ وہ ۷ سال برٹش کونسل میں مینجمنٹ ڈیولپمنٹ کے ہیڈ رہے۔ برٹش کونسل سے پہلے دی نیوز کے سنی ایڈیٹر رہے۔ اس سے پہلے ڈان اور نیشن میں کام کیا۔ نیوز پیپر سے نکلنے کا فیصلہ Deadline اور ذہنی دباؤ کے کچھر سے نکلنے کے لیے کیا۔ ۲۰۵۰ء ان کا خاص موضوع ہے۔ وہ مدیر محترم سے ملنے تشریف لائے تھے جہاں ان سے اس حوالے سے ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔

ان ۲ ممالک کے درمیان Service Centra کے طور پر بھی موجود ہو تو اس سے پاکستان کی معیشت پر اچھے اثرات ہوں گے۔ اگر اس سے بڑھ کر وہ Value added چیزوں کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کی ترقی کا عمل تیز ہو جائے گا۔

اگر ٹیکنالوجی کی بات کی جائے تو اس شعبے میں تیزی

”پاکستان ۲۰۵۰ء میں دنیا کی بڑی معاشی طاقتوں میں شامل ہوگا“

سے تبدیلیاں آئیں گی۔ مستقبل کے لوگ ہر چیز فوری حاصل کرنے کے عادی ہوں گے۔ فیس بک اور یوٹیوب کے آنے سے دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ معلومات Gather کرنے کی رفتار میں اضافہ ہوگا۔ 3D پرنٹرز وجود میں آجائیں گے۔ ٹیکنالوجی کی بدولت موجودہ آفس کا تصور بھی ختم ہو جائے گا۔ Meetings بھی مختصر اور چھوٹی ہو جائیں گی۔ ایک دن کے کام کے گھنٹے بھی کم ہو جائیں گے۔ تعلیم کے میدان میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں آئیں گی۔ اسکول

س: ۲۰۵۰ء کے معاشی مستقبل کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟
۲۰۱۰ء کی عالمی معاشی طاقتوں میں امریکا، یورپ کا علاقہ، چین، جاپان اور جرمنی شامل تھا۔ امریکی بینکنگ فرم Goldman Sachs کی ۲۰۱۲ء کی رپورٹ میں مستقبل میں ۲۰۵۰ء کی عالمی معاشی طاقتوں میں چین، امریکا، انڈیا، یورو کا علاقہ اور برازیل شامل کیے گئے ہیں۔ اس امریکی فرم کو دنیا کا پرنیمیر انویسٹمنٹ بینک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد ۱۸۶۹ء میں رکھی گئی تھی۔ ۲۰۱۲ء کی اس رپورٹ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مستقبل کی ۲۰ بڑی معاشی طاقتوں میں پاکستان بھی شامل ہے۔

اس رپورٹ کے مطابق ۲۰۵۰ء میں بھارت اور چین مستقبل کی ۵ بڑی معاشی طاقتوں میں باہر ترقی پیلے اور تیسرے نمبر پر موجود ہیں۔ یہ حقیقت کہ بھارت اور چین، پاکستان کے ہمسایہ ممالک میں شامل ہیں، پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے بھی بڑی خوش آئند ہے اگر پاکستان

”۲۰۵۰ء میں بھارت اور چین مستقبل کی ۵ بڑی معاشی طاقتوں میں شمار ہوں گے“

ولی: سماجی حوالے سے بات کی جائے تو دنیا مجموعی طور پر صحت مند اور خوشحال ہوگی۔ مغرب میں مسلمانوں کی آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس سے ۲۰۵۰ء کے یورپ کا ثقافتی نقشہ کافی مختلف ہوگا۔ مغرب کی طرف مسلمانوں کی Migration بڑھے گی۔

Toffler Associates نے ۲۰۱۰ء میں اگلے ۴۰ سال کی پیش گوئیاں کی ہیں۔ اس ادارے کی بنیاد ایلیون ٹوکلر نے رکھی تھی۔ اس نے اپنی کتاب Future shock کے حوالے سے عالمگیر مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس نے ۷۰ کی

اور کلاس روم کا روایتی تصور ختم ہو جائے گا۔ اسکول استاد کے بغیر Teacher Less ہونگے۔ پی ایچ ڈی کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ فون پر بات کرتے ہوئے زبان کا Barrier ختم ہو جائے گا۔ ایک غیر ملکی سے آسانی سے بات کی جاسکے گی اور ترجمے کی سہولت سے وہ آسانی سے آپ کی بات سمجھ جائے گا۔ شاپنگ کرنے میں بھی آسانی پیدا ہوگی۔ Global Positioning System آپ کے ہونے کے اندر ہوگا۔

س: ۲۰۵۰ء میں کیا سماجی تبدیلیاں ممکن ہوں گی؟

”۲۰۵۰ء میں گھروں کو آسانی سے موو (Move) کیا جاسکے گا“

نارویجیئن زبان میں بڑا کام

اسلامک کلچرل سنٹر ناروے کے احباب
اس کامیابی پر بے پناہ خوش ہیں

ارشاد محمود - اوسلو - ناروے

میں انجام پذیر ہوا۔ اس تقریب میں اوسلو یونیورسٹی شعبہ
مندیات کے پروفیسر Oddbjorn Leirvik نے پانے
خطاب میں ہر زمانہ اور معاشرے کے مطابق قرآن پاک کے
ترجمہ کی ضرورت پر نہایت محققانہ گفتگو کی۔ ۶۰ ویں دہائی کے
ترجمے کا وقت اور برصغیر کا ماحول اور اب ۲۱ ویں صدی کے
یورپ کے ماحول اور تقاضوں میں مفسرین اور مترجمین کو درپیش
سوالات اور چیلنج خاص طور پر خواتین کے حقوق اور دیگر معاشرتی
مسائل پر انھوں نے بطور خاص بات کی۔

جلداول کی تمام کاپیاں ایک مہینے کی مدت میں فروخت
ہو گئیں۔ گزشتہ دوں ۲۳ ستمبر کو جلد دوم سورۃ المائدہ
تاسورۃ التوبہ کی تقریب رونمائی پبلشر Kolofon Forlag
کی جانب سے نارویجیئن اکیڈمک حلقے کے لیے لٹریچر ہاؤس
میں ادا کی گئی۔ Kolofon Forlag کے ذریعے اشاعت کا
ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہ ترجمہ تمام ناروے میں دستیاب
ہوگا۔ اس تقریب کے میزبان مقرر Alf Egil Bergli کے ساتھ بہت
مطابق ترجمے کی اشاعت ان کے لیے اعزاز کے ساتھ بہت
بڑا چیلنج بھی ہے۔ اسلامک کلچرل سنٹر کے ناروے کے سبھی
احباب اس کامیابی پر بے حد خوش ہیں۔

زبان میں اللہ نے ہمیں ایک بڑا کام
کرنے کی سعادت بخشی ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی مشہور زمانہ
تفسیر تفسیر القرآن اپنی اشاعت کے
بہری سے متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس کا برصغیر کی
زبانوں کے علاوہ اہم یورپین زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے۔
اسلامک کلچرل سنٹر ناروے نے اپنی مرکزی عمارت کی تعمیر
کے علاوہ ضروری اور اہم لٹریچر کا نارویجیئن زبان میں ترجمہ اپنی
زحمات میں شامل رکھا ہوا ہے۔ ان کتابوں میں سید ابوالاعلیٰ
مودودی کی دینیات (Islams Fundamenter) اور
مودود عبدالحامی (Hammudah Abdulati) کی تعریف
الاسلام (Islam i Fokus) کے علاوہ تمام بنیادی اسلامی
معلومات کو نارویجیئن زبان میں فراہم کر دیا گیا ہے۔

سرمال قبل تفسیر القرآن کے ظفر اسحاق انصاری کے
انگریزی ترجمے Towards understanding the Quran
کا نارویجیئن زبان میں ترجمہ نور مسلم طور احمد سے کرایا گیا۔ لیکن
نظر ثانی کے بعد محسوس ہوا کہ اہل زبان اور اعلیٰ تعلیم ہونے کے
باوجود ترجمے کی زبان میں روانی اور مفہوم کی ادائی میں کافی
خامیاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ترجمہ نے سید ابوالاعلیٰ کی
ترجمانی کے ساتھ ساتھ اپنا ذاتی فہم اسلام بھی شامل کر دیا ہے۔
لہذا ۲۰۰۷ء میں تمام ترجمے کو ضیاء الحسن، کامران مجید،
نور احمد شکیل، طاہر ریاض، طیب ریاض اور شان سلمان ڈار پر
مشتمل کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جن کی تمام تعلیم ناروے
میں ہوئی اور جنھیں نارویجیئن زبان پر عبور حاصل تھا۔ کمیٹی کو کسی
انھن میں کمیٹی اسلامک کلچرل سنٹر کے امام و نائب امام مولانا
نجم الرحمن اور حافظ میاں محمد طیب سے راہنمائی حاصل کرنا
تھی۔ ان کے رسالوں میں عبدالستار طاہر، ارشد خدو الدین محمد اور
اسلام احمد نے بطور پروجیکٹ مینیجر اپنی ذمہ داریاں انجام دے
کر کمیٹی کا کام آسان کر دیا۔

سورۃ فاتحہ سے سورۃ النساء جلد اول کی طباعت کا تمام کام
پاکستان سے کرایا گیا۔ اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ کے ڈائریکٹر
محمد مناظر احسن کے ہاتھوں ایک نہایت سادہ لیکن باوقار تقریب

ہوں اور اپنی Skill کا لیول بڑھاتے رہیں۔
اپنے گول سے اپنی توجہ نہ ہٹائیں اور اپنی تمام
توانائی اس کے لیے استعمال کریں۔ Flow کا نظریہ باہر
نفسیات چک سینٹ مہالی نے متعارف کرایا اس کے
مطابق جب آپ کسی کام میں ایسے مگن ہوں کہ وقت
گزرنے کا احساس ختم ہو جائے تو آپ Flow کی کیفیت
میں ہوں گے۔ اس نظریے کے مطابق جب تک Job میں
بہاؤ Flow جیسی کیفیت نہ ہو اس سے حقیقی خوشی حاصل
کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مستقبل میں طالب علموں کو
Numeracy اور Language Skill دینے کی ضرورت ہو
گی۔ ہمارے ہاں کارپوریٹ دنیا میں کام کا تصور بدل رہا
ہے۔ نئی کمپنیاں اپنے منہج
سے کہہ رہی ہیں کہ وہ ایک
دن گھر سے کام کریں اس
سے ان کی Productivity
بڑھ رہی ہے۔
س: آگے بڑھنے اور ترقی
کرنے کے خواہش مند نوجوان

کی آپ کیا رہنمائی کریں گے؟
زندگی میں اپنے لیے وہ کام منتخب کریں جس میں آپ
کارحجان Interest ہو۔ پھر اس میں قابلیت پیدا کیجیے۔
زیادہ سے زیادہ دولت کماتے جانے کی اہلیت کا تعلق
آپ کے Curious ہونے سے ہے۔ بل گیس اس کی واضح
مثال ہے۔ ہمیں علم نافع مانگنے کی دعا سکھائی گئی ہے یعنی علم
(Means to an end) ہے۔ بذات خود مقصد نہیں۔
مستقبل میں ان میں سے بہت تبدیلیاں حقیقت بن
جائیں گی لیکن ایک چیز کبھی نہیں بدلے گی اور وہ ہے
Human Interaction کی۔ مستقبل میں ہماری
ضرورت اپنی جگہ رہے گی کہ ہم اپنے دوست کے ساتھ
بیتھیں گپ شپ لگائیں اور اپنی کئی سی ڈیجیٹل ڈیوائس
کی خامیوں پر بات کریں۔

دہائی کا مطالعہ کیا اور مستقبل میں ہونے والی تبدیلیوں کے
حوالے سے بات کی۔
Toffler Associates کی حالیہ پیش گوئیوں کے مطابق
مسلمانوں کی مغرب کی طرف Migration بڑھے گی اور اس
کی سماجی اور سیاسی زندگی میں زبردست تبدیلیاں ہوں گی۔
فرانس اور جرمنی میں مسلمان اکثریت میں ہوں
گے۔ مغرب میں اسی لیے مسلمانوں کے حوالے سے سخت
رویوں اور پالیسیوں کی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔
شاہد ملک برطانیہ کے پہلے مسلمان منسٹر نے ایک مرتبہ کہا
تھا کہ اگلے ۳۰ برسوں میں برطانیہ میں ایک مسلمان
وزیراعظم بن سکتا ہے۔ یاد رہے کہ پاکستانی نژاد سعیدہ
دارنی برطانیہ کی پہلی مسلمان
خاتون منسٹر رہ چکی ہیں۔ وہ
کنزرویٹو پارٹی کی شریک بانی
بھی رہی ہیں۔
مستقبل کے گھر بھی ایسے
ہوں گے کہ انھیں آسانی سے
Move کیا جاسکے گا۔ مستقبل

کی گاڑیاں بھی Multimode ہوں گی ایک ہی گاڑی پانی
اور سڑک دونوں پر استعمال کی جاسکے گی۔
خواتین مضبوط کرداروں میں نظر آئیں گی اور عالمی
سطح کے فیصلوں پر اثر انداز ہوں گی۔ ہم اس رجحان کو
آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کو کئی بڑی کمپنیوں
Fortune ۵۰۰ کی چیف ایگزیکٹو خواتین نظر آئیں گی۔
س: آج ان رجحانات سے کیسے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟
ولی: مستقبل کی ان تبدیلیوں کے عمل سے ہم ابھی سے
فائدہ اٹھانا شروع کر سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ
آپ پر واضح ہو کہ اگلے ۵۰ سال میں کیا حاصل کرنا چاہتے
ہیں اور بڑے خواب دیکھ جائیں اس سلسلے میں ۵ چیزیں
اہم ہیں۔ Energy, Focus, Skill, Will, Flow۔
مستقبل کا لیڈر بننے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کا
Goal واضح ہو۔ آپ اسے حاصل کرنے کا جذبہ رکھتے

سلیم کوثر

حوالہ
میری
پسند کا

سلیم کوثر ۱۹۳۷ء کو ہندوستان کے شہر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد جھنگ میں ان کی ریل آکر رکی اور ان کا خاندان جھنگ میں آباد ہو گیا۔ وہاں سے خانیوال چلے گئے، ہائی اسکول وہاں سے پاس کیا۔
۱۹۷۰ء میں کراچی آئے اور وہیں کے ہو رہے۔ اخبار کی ملازمت سے زندگی کا آغاز کیا اور پھر ۱۹۷۵ء میں ٹیلی ویژن میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۲۰۰۷ء کو وہاں سے ریٹائر ہوئے۔ سلیم کوثر نے زندگی جدوجہد سے گزاری اور پھر اردو دنیا میں اللہ کے فضل سے جو نام پیدا کیا وہ اپنی جگہ مثال ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں زبان زد خاص و عام ہوئیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں، ”خالی ہاتھوں میں ارض و سما“، ”یہ چراغ ہے تو جلا رہے“، ”ذرا موسم بدلنے دو“، ”محبت ایک بھر ہے“ اور ”دنیا میری آرزو ہے“ شامل ہیں۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں شاعری کے حوالے سے سفر کرتے رہتے ہیں۔ ان کے کام میں فحش، گہرائی، وسعت اور نئے خیالوں اور جذبول کا اظہار ہے جو انہیں سب سے الگ کرتا ہے۔

غزل

یہ ابرگر یہ غبارِ عصیاں کو، دھو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
کوئی کہیں چھپ کے رونا چاہے تو رو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
جسے ہواؤں کی سرکشی نے بچا لیا دھوپ کی نظر سے
وہ ابر آوارہ دامن دل بھگو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
یہ میں ہوں تم ہو، وہ اپنی ہے، غلام ہیں اور وہ راستہ ہے
اب اس کہانی کا کوئی انجام ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
ترے لیے حسن جاگتا ہے ترے لیے عشق جاگتا ہے
سوا ب تو چاہے تو اپنی مرضی سے سو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
نئی مسافت کے رُت جکوں کا خمار کیا چڑھا ہوا ہے
سلیم کوثر یہ نشہ تم کو ڈبو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی



مختلف ادوار میں مختلف وقتوں میں، مختلف شاعروں کی مختلف شاعری مختلف طرح سے اچھی لگتی رہی ہے، پوری غزل ڈراما شکل لگا سے ملتی ہے۔ ہاں جستہ جستہ اشعار میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں ان میں سے بہت سے اشعار بڑی شاعری کی مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں مگر اچھی شاعری مجھے نثر سے پاؤ ہے اور یہ بھی کہ ایسے زمانے کی پڑھی سنی شاعری ہے جو حافظے میں محفوظ رہے۔ نئی شاعری کہیں نہیں اچھی لگتی ہے مگر یاد کا حصہ نہیں بنتی، اب یہ بڑھتی ہوئی عمر کا تقاضا ہے یا شاعری کی اپنی تاثیر۔ اچھا شعر آج بھی اگر مجھ تک پہنچتا ہے یا میں کہیں پڑھتا ہوں تو پھر اپنے آس پاس اور دور دراز دوستوں کو ضرور سناتا ہوں۔

میر، غالب اور اقبال ہماری شاعری کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ یہ تینوں اپنی شاعری کے اسلوب، بیان اور لب و لہجے اور فکری طرز احساس کی جداگانہ فصاحت رکھتے ہوئے بھی بڑوں میں شامل ہیں کہ اندر کہیں شاعری کی دیوی ان پر بہت مہربان رہی ہے، فکر و خیال کی گہرائیاں، وجدان کی کرم فرمائیاں، مشاہدے کی کرشمہ سازیوں مطالعہ اور علم کی آمیزش، طرز سخن کی انفرادیت، زبان و بیان کی حسن آفرینی، کیا کچھ نہیں ملتا ان کے ہاں۔ عظیم شاعروں میں تمام خوبیاں یکجا ہو جاتی ہیں۔

عاشقانِ رسول (ﷺ) توجہ فرمائیں

سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں مختلف حکمرانوں کے نام خطوط ارسال کیے۔ یہ تمام خطوط انتہائی خوبصورت انداز سے معروف محقق، دانشور علامہ عبدالستار عاصم کی عنقریب شائع ہونے والی کتاب ”مکتوباتِ محمد ﷺ“ میں شامل ہیں۔ اور ساتھ ہی ان صحابہ کرام کے حالات زندگی بھی شامل ہیں جو یہ خطوط مبارک لے کر جاتے رہے۔ آپ اپنی ذاتی لائبریری، گہری دفتر کے لیے آج ہی اپنی کا پی بک کروالیں۔ یاد رکھیں جس گھر میں رحمت اللعالمین ﷺ کے خطوط مبارک موجود ہوں گے وہ گھر دنیا کے بابرکت گھروں میں شامل ہوگا۔

رابطہ: رضویہ ریسرچ سوسائٹی کراچی مارکیٹ ماڈل ٹاؤن لاہور۔

فون نمبر: 0423-5855537 0333-4393422

نئی کتابیں

400/-	پیش دہتیاں..... از ڈاکٹر وحید قریشی
900/-	تحریکات پاکستان..... از پروفیسر نذیر احمد تشہ
600/-	اردو ضرب الامثال..... از پروفیسر نذیر احمد تشہ
2000/-	حمید اختر..... از علامہ عبدالستار عاصم
500/-	پاکیزہ زندگی..... از علامہ عبدالستار عاصم
400/-	چغاب کی لوک کہانیاں..... از پروفیسر غلام مرتضیٰ
600/-	سفر آرزو..... از ملک مقبول احمد
600/-	50 نامور ادبی شخصیات..... از ملک مقبول احمد
600/-	سیاحت نامہ ترکی..... از ملک مقبول احمد
500/-	پانی سے علاقت..... از ملک مقبول احمد
3000/-	کمانڈر، ایک محب وطن پاکستانی کی جی داستان..... از اے حمید
0323-4393422	0423-37324164
	مقبول انکیزی چوک اردو بازار لاہور

میر تقی میر



اسد اللہ غالب



اقبال



عبد اللہ علیم



میر صاحب ہماری شاعری کا وہ روشن ستارہ ہیں جس کی کرشمیں ہر عہد کے افق پر اپنے ہونے کی گواہی ثبت کرتی رہی ہیں۔ یہ تصدیق اعتراف کے طور پر یہی کہ ان کا اعتراف خود ان کو محترم بناتا ہے اور یہی مسافت کا حسن ہے کہ آپ اپنے پیش روؤں کو یاد رکھیں اور پھر یوں بھی ہوا کہ انہی راستوں پر چلتے ہوئے یا گریز کرتے ہوئے بہت سے شاعروں نے اپنے لئے گفتگو کے نئے دائرے دریافت کیے اور کامیاب رہے کہ مختلف ہونا ہی زندہ رہ جانے کا، پانی رہ جانے کا راستہ ہے۔ حالات و واقعات کی تبدیلی نے شاعری کے مزاج کو ہی بدل کر رکھ دیا، مگر وہ جو میر صاحب کے شعر کی چاشنی ہے، رچاؤ ہے، بہاؤ ہے اور جو جمالیاتی حسن ہے یہ تحریریں اس کا کچھ نہیں بگاڑیں۔ میر صاحب کے ہاں زندگی کے پھیلے ہوئے ابر آلود غبار آلود صحراؤں میں، درد بھری آواز کے سائے، ذات و کائنات کے اسرار اور ان کی پراسراریت کے علاوہ بہت کچھ پایا جاتا ہے۔

غزل

جس سر کو غور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زندان میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفٹ سری کا
کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دست نگر پیچہ مڑگاں کی تری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہ شیشہ گری کا
تک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

غالب نے اپنی راہ الگ بنائی۔ وہ بدلتی ہوئی قدروں کے تسلسل میں ایک زوال آمادہ معاشرہ کا عہد آخری شاعر ہے اور یوں بھی حقیقی بڑے شاعروں کا عہد بھی ختم نہیں ہوتا۔ ہر بڑی تخلیق وقت سے اپنا مقدمہ خود لڑتی ہوئی آنے والے زمانوں کی سرحدوں کو عبور کرتی رہتی ہے۔ غالب ہماری شاعری کے افق پر ایک افسانوی کردار کی طرح چھا گیا ہے۔ اس کی شاعری ہمارے سماجی، سیاسی، روحانی، جذباتی اور ذاتی رویوں میں ایسی رچ بس گئی ہے کہ اپنی مشکل پسندی کے باوجود وہ ہمارے درمیان بڑی آسانی سے موجود ہے۔ اقبال کی طرح غالب ہر زمانے کا شاعر ہے۔ اور گزرتے وقت کے ساتھ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مڑگاں کیے ہوئے
پھر گرم نالہ ہائے شر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے
پھر پُرسش جرجرجت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا
جاں، نذر و فرسہی عنوان کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوں
زلف سیاہ رخ پہ پریشان کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دھن مڑگاں کیے ہوئے

اقبال کی شاعری ہماری قومی آبرومندی کا استعارہ ہے۔ وہ ہماری تاریخی، سماجی، روحانی اور جذباتی قدروں کا مثبت اشارہ ہے۔ اقبال نے نظریہ کو شاعری کی بنیاد بنایا اور پھر اس شاعری کو نظریے کے طور پر ارفع و اعلیٰ مقام پر لاکھڑا کیا۔ وہ بڑے شاعر ہی نہیں ایک عظیم فلسفی اور دانشور، بکے مسلمان اور سچے عاشق رسول ﷺ تھے۔ اقبال اپنے عہد میں بڑے سوالوں سے ہمہ آزار رہے۔ اختلاف و اعتراف کے حسن کو دانش کی سطح پر، مکالمے کی رسم کے ساتھ یا خط و کتابت کے زمرے میں لاتے ہوئے ایک بڑا خزانہ نثر بھی ہمارے لئے چھوڑ گئے جو اپنے اندر حکمت و آگہی کی روشنی رکھتا ہے۔ اقبال کے ہاں شاعری کا جو کن ترتیب پاتا ہے وہ بے مثال ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں خیال و فکر کی جمالیاتی آمیزش نے ان کی شاعری کو دنیا کی بڑی شاعری کی صف میں لاکھڑا کیا ہے۔

غزل

اگر کج رو ہیں انجم آسمان تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا
اے صبح ازل کی انکار کی برأت ہوئی کیوں کر
مجھے معلوم کیا وہ راز داں تیرا ہے یا میرا
محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں تر جہاں تیرا ہے یا میرا
اسی کو کب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

عبد اللہ علیم زندگی کے سبھی رنگوں میں شاعر تھا۔ شاعری کے آئینہ خانے میں حسن و جمال کے عکس جو اس نے اپنے خون دل سے کشید کیے ہیں، آج بھی روشن ہیں۔ وہ عشق کی مہذب قدروں کا بے پناہ شاعر تھا اس کے ہاں عشق ہر دو صورتوں میں اپنے اسرار کھولتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے عہد میں اس کی شاعری کے اثرات موجود رہے ہیں، وہ ایک محبوب اور مقبول شاعر کے طور پر جانا پہچانا جاتا ہے، وہ اپنے شاعر ہونے پر نہ صرف فخر کرتا بلکہ شاعری اور شاعر کا مقدمہ ہمہ وقت لڑتا دکھائی دیتا تھا۔ بے خوف، نڈر اور بے باک اور یہ سب موسم اسے اس کی شاعری نے عطا کیے تھے۔ اس کی شاعری جذبول کی صداقت، جمالیاتی و فور اور ذاتی تجربوں کی مہک سے ایک ایسی دنیا کا پھیلاؤ ہے جہاں اس کی آواز کے سائے پڑھنے سننے والوں کو روکتے ہیں۔ اس کے تین مجموعہ ہائے کلام ”چاند چہرہ ستارہ آنکھیں“، ”ویران سرانے کا دیا“ اور ”نگار فوج کی امید میں“ شائع ہو چکے ہیں۔

غزل

عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی سنبھل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے
ٹپے ہیں یوں تو بہت آؤ اب ملیں یوں بھی
کہ روح گرمی انفاس سے پکھل جائے
محبوتوں میں عجب ہے دلوں کو دھڑکا سا
کہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے
زہے وہ دل جو تمنائے تازہ تر میں رہے
خوشا وہ عمر جو خواہوں ہی میں بھل جائے

10 موجدوں کی دورانِ ایجاد موت

زندگی کی خوبصورتی، آسانی اور ترقی کی بنیادیں اینٹوں پر نہیں انسانی عقل و دانش فہم اور متربانیوں پر اُٹھی ہیں آج ہر جس متدرخوشی سے ہنسی ایجاد کی حسین کرتے اور اسے قبول کر کے زندگی آسان کر لیتے ہیں، ہمیشہ سے ایسا آسان نہیں ہے۔ سائنسدانوں اور اہل علم کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے، جس کے لیے عام حالات میں شاید کوئی بھی تیار نہ ہو ہم آپ کے لیے ۱۰ اوقات کی گواہی لائے ہیں

علا سحاب

ہنری ونسٹلے (Henry Winstale)

ہنری ایک بہت ہی مشہور ماہر تعمیرات اور انجینئر تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ ایڈیسن روشنی منار تعمیر کیا تھا۔ ہنری روشنی منار کی قوت جاننے کے لیے ایک طوفان کے وقت روشنی منار کے ساتھ موجود رہا۔ لیکن طوفان اتنا شدید تھا کہ روشنی منار تباہ ہو گیا اور اس کے ساتھ نہ صرف ہنری کی موت واقع ہوئی بلکہ ۵۰ لوگ اور بھی مر گئے۔

الیکزنڈر بگدونو (Alexander Bogdonov)

الیکزنڈر ایک بہت ہی مشہور روسی ماہر فزیشن، فلاسفر، معیشت دان اور انقلابی شخص تھا۔ اُس کے بہت سارے سائنسی تجربات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انتقال خون کے عمل کے ذریعے انسان کو دوبارہ جوان کیا جاسکتا ہے۔ بہت سارے مشہور و معروف لوگوں کو انتقال خون کے ذریعے جوان کیا گیا۔ الیکزنڈر نے خود کو بھی ایک شخص کے خون کے ذریعے جوان کرنا چاہا مگر خون کی عفونت (Infection) کی وجہ سے مر گیا۔



کو پرفیس کولز (Cowper Phipps Coles)

کو پرفیس کولز کا ایک مشہور کپتان تھا جس نے جنگ کریمیا کے دوران بحری بیڑے پر استعمال ہونے والا ایک

میرا کلام میرا یہ تحفہ قبول کر
دریا لے ہوئے ہے یہ قطرہ قبول کر

بہت اداس ہو دیوار دور کے جلنے سے
مجھے بھی ٹھیک سے دیکھو جلا تو میں بھی ہوں

خلیل رام پوری

رئیس فروغ

خلیل رام پوری ادبی حلقوں میں جانے پہچانے شاعر تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ ان کا کلام پاک وہند کے بھی رسائل کی زینت بنا۔ وہ جدید حسیت کے والہانہ شاعر تھے۔ وہ تھلویں صحراؤں کے علاقے بھٹکر میں آباد تھے۔ بڑے آدمی تھے روایت کی پاسداری میں گندھے ہوئے، غزلوں کی بنت میں اپنا ایک خاص انداز رکھتے تھے۔ جدید غزل کو سنوارنے میں ان کا بھی حصہ نمایاں ہے۔ بڑے شہروں کی مرکزیت سے دور صحراؤں کی وسعت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے خلیل رام پوری کو آپ پڑھیں گے تو لگے گا کہ وہ آپ کے دل کے کسی کونے میں پہلے سے آباد تھے بس آپ کو یاد نہیں آرہے تھے۔ وہ کہنہ مشق شاعر تھے۔ نئی لفظیات کے ساتھ نئی غزل کو سنوارتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ”چراغِ پانی میں“ ۱۹۸۳ میں شائع ہوا تھا۔

غزل

میرا کلام میرا یہ تحفہ قبول کر
دریا لے ہوئے ہے یہ قطرہ قبول کر
مجھ کو یہ خضر ہے کہ ترا ترجمان ہوں
جو سامنے ہے وہ بھی تماشا قبول کر
کیا مانگتے ہیں ننگے سگلتے پہاڑ سن
کیا چاہتے ہیں ریت کے دریا قبول کر
جو لوگ مانتے نہیں میرے وجود کو
ان کو دماغ دے مرا ہونا قبول کر
وہ بھی ہیں لوگ جن کے لیے دن بھی رات ہے
ان کی نماز ان کا بھی روزہ قبول کر

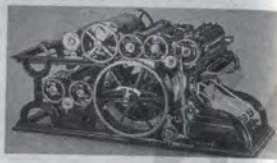
رئیس فروغ ریڈیو پر ملازم تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو پاکستان کراچی کی چار دیواری میں شعرو ادب سے جڑے ہوئے اہم لوگ موجود تھے۔ عزیز حامد مدنی، حمید نسیم، سلیم احمد، قمر جمیل، محشر بدایونی، برار نوری، اقبال فریدی، رضی اختر شوق، وجد چغتائی، ارشاد الحق قدوسی اور بہت سے نام جو ان سے پہلے تھے یا ان کے بعد، ایک طویل فہرست ہے، اسی فہرست میں رئیس فروغ بھی شامل تھے۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ اپنی ذاتی شناخت رکھتے تھے۔ رئیس فروغ نے بے شمار نمونے تحریر کیے، بچوں کی نظمیں لکھیں، نثری اور پابند نظموں کے جال پھیلایے، مقبول گیت لکھے اور شاندار غزلیں تخلیق کیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار زبان زد عام ہوئے اور پڑھنے والوں نے انہیں اپنے درمیان ایک خوبصورت شاعر کے طور پر ہمیشہ محسوس کیا، وہ اپنی بات کو نئے زاویے سے کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ رئیس فروغ نے شاعری میں اپنی انفرادیت کو اپنی پہچان بنایا۔

غزل

کسی کسی کی طرف دیکھتا تو میں بھی ہوں
بہت بڑا نہیں اتنا بڑا تو میں بھی ہوں
بہت اداس ہو دیوار دور کے جلنے سے
مجھے بھی ٹھیک سے دیکھو جلا تو میں بھی ہوں
زمیں پہ شور جو اتنا ہے ہے صرف شور نہیں
کہ درمیاں میں کہیں بولتا تو میں بھی ہوں
عجب نہیں جو مجھی پر وہ بات کھل جائے
برائے نام سہی سوچتا تو میں بھی ہوں
میں دوسروں کے چہنم سے بھاگتا ہوں فروغ
فروغ اپنے لیے دوسرا تو میں بھی ہوں

ولیم بُلُوک (William Bulloch)

یہ ایک امریکی موجد تھا جس نے ۱۸۶۳ء میں گھونے والی چھاپہ مشین ایجاد کی جس کی وجہ سے چھاپی کی دنیا میں انقلاب آیا۔ ایک مرتبہ وہ مشین ٹھیک کر رہا تھا اور پاؤں سے مشین کی ایک پٹی کو ٹھوکر لگائی جس کی وجہ سے پاؤں شدید زخمی ہو گیا اور پاؤں کے آپریشن کے دوران اُس کی موت واقع ہو گئی۔



جے جی پیری تھامس (J. G. Parry Thomas)

یہ ایک انجینئر اور موٹر سائیکل ریئر تھا۔ اُس نے ہمیشہ سے مل کالم Malcolm کا ریکارڈ توڑنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے ایک کار ایجاد کی۔ کار میں بہت ساری خوبیاں تھیں۔ ایک مٹی چین کے ذریعے چاروں پہیے انجن سے ملحق تھے۔ ۲۷ اپریل ۱۹۲۶ء کو اُس نے مل کالم Malcolm کا ریکارڈ توڑ دیا۔ ایک سال بعد ۱۹۲۷ء میں مل کالم Malcolm نے پھر سے نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ پیری نے بھی اپنا ریکارڈ پھر سے قائم کرنے کے لیے ریس لگائی۔ جس کے دوران کار کی چین ٹوٹ کر اُس کی گردن میں پیوست ہو گئی جس کے سبب وہ مر گیا۔



تھامس میڈ گلے جے آر (Thomas Midgley JR)

یہ ایک امریکی کیمیا دان تھا جس نے Leaded Petrol اور CFCs ایجاد کیا۔ اپنی زندگی میں وہ اس نام سے مشہور ہوا، ”ایک ایسا شخص جو اپنی ایجادات کی وجہ سے تاریخ میں سب سے زیادہ اموات کا ذمہ دار بنا۔“ اُسے پولیو ہوا اور جسم میں زہر بھر گیا اور معذور ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو بستر سے اٹھانے کے لیے ریسوں کی مدد سے پٹی تیار کی۔ ایک دن بستر سے اٹھتے ہوئے پٹی کے پھسلنے کی وجہ سے اُس کی موت واقع ہوئی۔



میری کیوری (Marie Curie)

یہ ایک فرانسیسی فزکس اور کیمیا دان تھیں۔ اُس نے ریڈیم اور پولونیم کے عناصر دریافت کیے۔ اس کے علاوہ Theory of Radioactivity اور Isolation of Radio Isotopes بھی پیش کیں۔ اُس نے ۱۹۰۳ء میں اپنے خاوند کے ساتھ مل کر نوبل انعام بھی جیتا۔ ۴ جولائی کو وہ Radiation کا عمل کر رہی تھی جس کے دوران اُس کی موت واقع ہوئی۔



کارل سوئیک (Karel Soucek)

کارل ایک مشہور کینیڈین کرجب باز تھا۔ جس نے اپنا کرجب دکھانے کے لیے ایک بڑا اُبھرا ہوا ڈھول نمائین (ڈرم) ایجاد کیا۔ اس تماشہ کے لیے ایک کمپنی نے پیسا لگایا، ڈرم کو اوپر سے نیچے تک لڑھکتے ہوئے آنا تھا اور کارل نے اُس ڈرم کے اندر موجود ہونا تھا۔ اس کام کے لیے ۱۸۰ میٹر بلند آبنار کا انتظام کیا گیا۔ کارل نے غلطی سے ڈرم کے سنٹر میں ٹھوکر مارنے کے بجائے سائیڈ والے پول پر ٹھوکر لگائی جس کی وجہ سے ڈرم غلط سمت چلا گیا۔ کارل زیادہ زخمی ہوا اور دوسرے روز مر گیا۔ نیویارک کے میوزیم میں وہ ڈھول نمائین آج تک نمائش کے لیے رکھا ہوا ہے۔



فرانز ریچلٹ (Franz Reichlet)

یہ ایک بہت مشہور درزی تھا اور بہت ہی انوکھے اور منفرد قسم کے اوور کوٹ بناتا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ کوٹ کو پہننے والا شخص اس کی مدد سے اُڑ بھی سکتا ہے۔ اُس نے وہ کوٹ پہن کر بہت سارے تماشائیوں کے سامنے ابلٹل ٹاور سے سیدھا نیچے کی طرف چھلانگ لگائی اور موقع پر ہی مر گیا۔

اوٹو لیلی تھول (Otto Lilienthal)

یہ وہ شخص تھا جس نے انسان کی سب سے پہلی اُڑان کو ممکن بنایا اور بغیر انجن کے اُڑنے والا شہنشاہ کہلایا اور اُس نے اس طرح یعنی بغیر انجن کے کئی اُڑائیں بھریں۔ اُس نے عوام اور سائنس کے نظریے کے خلاف یہ بات ثابت کر دی کہ انسان بغیر انجن کے اُڑ سکتا ہے۔ ۹ اگست ۱۸۹۶ء کو وہ ایک اُڑان کے دوران گر گیا جس کے باعث اُس کی موت واقع ہوئی۔



قبائلی اور بنگالی

انگریز سرداروں کے ذریعے ہی بلوچستان پر حکومت کرتے رہے۔ گو وقتاً فوقتاً بعض بلوچ سرداروں نے انگریز راج کو لاکھارتا تاہم مجموعی طور پر وہ ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔ چنانچہ انگریزوں کی مدد سے سرداروں نے اپنے قبائل پر گرفت مزید مضبوط کر لی۔ حتیٰ کہ اس مسئلے نے جنم لیا! ”سردار کے حکم کی پاس داری قبیلے کے ہر فرد کا اولین فرض ہے۔“ جنگ ہو یا صلح، سردار کا حکم حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ قبائل اپنے سردار کی خوشنودی کے لیے جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں زمین داری نظام منہدم کرنے کے بعد بنگال میں انگریزوں نے چابجا اسکول کھولے۔ مدعا یہ تھا کہ بنگالیوں میں اپنا نظام معاشرت و سیاست متعارف کرایا جائے۔ ان اسکولوں میں عام بنگالیوں نے بھی داخلہ لیا۔ یوں ہندوستان میں سب سے پہلے بنگالی ہی جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی کے نظریات سے آگاہ ہوئے۔ لہذا بنگال میں ہی ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں اقوام کی اوپن سیاسی تحریکوں نے جنم لیا۔ بنگال میں تعلیم عام ہونے کا فائدہ یہ پہنچا کہ بنگالی عوام اپنے حقوق و فرائض سے آشنا ہو گئے۔ دوسری سمت بلوچ سردار اپنے علاقوں میں اسکول کھولنے کے سخت مخالف تھے۔ انھیں علم تھا کہ اگر بلوچ عوام تعلیم یافتہ ہو کر اپنے حقوق سے آگاہ ہوئے، تو ان کی آمریت کا سورج غروب ہو جائے گا۔ اسی لیے وہ تعلیمی ادارے کھولنے کی مخالفت کرتے رہے۔ آج بھی بلوچستان کے دیہی علاقوں میں اسکول بمشکل ہی کھل پاتے ہیں۔

سردار قبائل زمین رکھتے اور صنعت حرفت کی وجہ سے دولت کے بھی حامل ہیں۔ چنانچہ ان کا اثر و رسوخ بلوچ معاشرے میں سب سے زیادہ ہے۔ باغی بلوچوں کی اکثریت کا تعلق تین سردار قبائل مری، بگتی اور مینگل ہی سے ہے۔ متوسط قبائل کھیتی باڑی، باغبانی اور گلہ بانی سے پیٹ پالتے ہیں، جب کہ زیروست قبائل درج بالا قبیلوں کی نوکری چاکری کرتے ہیں۔

عام طور پر سردار کا بڑا بیٹا ہی اس کی وفات کے بعد باپ کی گدی سنبھالتا ہے، تاہم ولی عہدوں کے مابین خانہ جنگی بھی ہو سکتی ہے مثلاً آج کل اکبر بگتی کے ۳۳ پوتے..... براہمدار بگتی، میر عالی بگتی اور شاہ زین بگتی دادا کی جائیداد حاصل کرنے کے لیے آپس میں دست و گربیان ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ نواب خیر بخش مری جب رخصت ہوئے، تو ان کی اولاد بھی جائیداد کی خاطر لڑ پڑے گی۔

سرداری نظام کی خوبیاں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ فوری انصاف مہیا کرتا، نیز غریبوں کو تحفظ دیتا ہے۔ لیکن اس کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ سردار انصاف پسند، غریب دوست، رحمدل اور شریف ہو۔ لہذا ایک آمر سردار

رہے۔ لیکن ان کے دور میں اس سرداری یا قبائلی نظام کو گزند نہ پہنچی بلکہ وہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہو گیا۔

آبادی کی تقسیم

بلوچستان اور مشرقی پاکستان کے حالات میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر علاقہ کل پاکستانی رقبے کا ۴۲ فیصد رقبہ رکھتا ہے۔ تاہم یہ لحاظ آبادی وہاں صرف ۴ فیصد پاکستانی آباد ہیں۔ جب کہ مشرقی پاکستان میں کل پاکستانی آبادی میں سے ۵۲ فیصد لوگ آباد تھے۔ مزید برآں مشرقی پاکستان کی ۹۵ فیصد آبادی بنگالیوں پر مشتمل تھی۔ جب کہ بلوچستان میں بلوچ اکثریت نہیں رکھتے، اس پاکستانی صوبے میں تقریباً ۸۰ لاکھ افراد بستے ہیں۔ ان میں سے ۵۰ لاکھ لوگ پشتون، برہوئی اور مکرانی نسل کے ہیں۔ نیز انہی میں بڑا بنگالی و سندھی آباد کار بھی شامل ہیں۔

بلوچستان میں ۳۰ لاکھ بلوچ آباد ہیں۔ یہ کم و بیش ۵۵ فیصد قبائل میں تقسیم ہیں۔ قبائل کے تین طبقے ہیں..... سردار قبائل، متوسط قبائل اور زیروست قبائل۔

مشرقی پاکستان سے بلوچستان تک

بلوچستان کا مسئلہ

گڈ گورنس کی عدم موجودگی ہے

سہولتیں دے کر بلوچوں کو اپنا بنایا جاسکتا ہے؟

سید عامر محمود

ہے۔ آئیے تاریخ و حقائق کی روشنی میں ان دونوں پاکستانی علاقوں کا جائزہ لیں جہاں علیحدگی کی تحریکوں نے جنم لیا۔

قوم اور معاشرہ

مشرقی پاکستان میں سرداری نظام عنقا تھا۔ جب انگریزوں نے بنگال پر قبضہ کیا، تو انھوں نے ٹیکس لگا لگا کر بڑے زمین داروں کو اتنا بچوڑا کہ وہ نیست و نابود ہو گئے۔ صرف شہروں میں ان کی باقیات رہ گئی۔ ماضی کے نوابوں کی یہ اولاد بھی مالی طور پر مستحکم نہ تھی، لوگ صرف معزز خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث ان کی عزت و احترام کرتے تھے۔

دوسری سمت سرداری نظام بلوچ معاشرے کا سب سے مضبوط ستون ہے۔ (یہ اب آکر کچھ کمزور ہوا ہے) وہاں جس قبیلے کا سردار نہ ہو، اسے عزت و وقار کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ عجیب بات یہ کہ ۱۸۴۵ء میں انگریزوں نے بلوچستان پر قبضہ کیا اور پھر ۱۹۴۷ء تک حکومت کرتے

میں بلوچستان کے سابق وزیر اعلیٰ سردار اختر مینگل دہلی سے اسلام آباد پہنچے۔ وہ دہلی میں جلا وطنی کی پُر آسائش زندگی گزار رہے تھے۔

موصوف مسئلہ بلوچستان کے سلسلے میں سپریم کورٹ میں بیان دینے پاکستان آئے۔ سپریم کورٹ میں اور پاکستانی سیاست دانوں سے ملاقاتوں کے دوران بھی انھوں نے چھ مطالبات دہرائے۔ سردار مینگل نے اپنے مطالبات کو ”حبیب الرحمن“ کے ”چھ نکات“ سے ملتا جلتا قرار دیا۔ اس بات نے قومی سطح پر خاصی ہلچل مچائی اور یہ سوال اٹھا کہ کیا بلوچستان میں مشرقی پاکستان جیسی شورش اور بغاوت کے تانے بانے تو نہیں بنے جارہے؟

حالات کے مطالعے سے افشا ہوتا ہے کہ سردار مینگل اپنے مطالبوں کو ۶ نکات سے تشبیہ دے کر محض محبت وطن پاکستانیوں کو خوفزدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ مشرقی پاکستان اور بلوچستان کی شورش میں زمین آسمان کا فرق

قذیفہ والوں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ تاریخ کا جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ بلوچ سرداروں کی اکثریت ظالم و جابر رہی ہے۔

شورش کی وجوہ

قیام پاکستان کے بعد جلد ہی بلوچستان بھی شورش کا نشانہ بن گیا۔ وجہ یہ ہے کہ جب بڑے سرداروں نے دیکھا کہ جمہوری نظام ان کا اثر و رسوخ اور بادشاہی محدود کر سکتا ہے، تو انھوں نے صوبائی خود مختاری کا نعرہ بلند کر دیا۔ گویا انھوں نے اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی خاطر حکومت پاکستان سے جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں بلوچ عوام کا کوئی کردار نہ تھا، لیکن سرداروں کی رعایا اور ناخواندہ وفادار ہونے کے باعث انھیں بھی مجبوراً بغاوت میں حصہ لینا پڑا۔ بلوچستان میں گیس کی رائلٹی کا معاملہ بھی وفاقی حکومت اور سرداروں کے مابین وجہ نزاع بنا۔

بنیادی طور پر سری، مینگل اور بگٹی قبائل کے سردار بغاوت میں پیش پیش تھے۔ آج بھی انہی کے علاقوں مثلاً کوہلو، خضدار اور سبی میں باغیوں کا زور زیادہ ہے۔ ان کی تعداد ۲۰ سے ۵۰ ہزار کے مابین بتائی جاتی ہے۔ یہ بھی پیارے اپنے سرداروں کے انتہائی وفادار اور ان پر جان نثار کرنے والے ہیں۔

غرض مشرقی پاکستان میں بغاوت کو اس لیے کامیابی ملی کہ بنگالی عوام نے اسے بہت پذیرائی بخشی جب کہ بلوچستان میں بغاوت کا مرکز چند بڑے سردار اور ان کے زر خرید غلام ہیں۔ ورنہ بلوچوں اور پشتونوں کی اکثریت ”عظیم بلوچستان“ قائم کرنے کا خواب نہیں دیکھتی۔ اسی لیے بلوچستان کا پاکستان سے علیحدہ ہونا ناممکن ہے۔

بھارت کا کردار

بھارتی حکومت شروع سے پاکستان کو سالم برصغیر کا حصہ سمجھتی ہے۔ لہذا حکمران طبقہ پاکستان کے خلاف سازشیں کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ

بھارتی فوج ہی نے مشرقی پاکستان کے باغیوں کو جنگی تربیت دی اور اسلحہ فراہم کیا۔ اگر مشرقی پاکستان اور بھارت کی سرحدیں نہ ملی ہوتیں، تو شاید بغاوت ناکام ہو جاتی۔ باغی بلوچ سردار اکثر بھارت میں چلے اور تقارب منعقد کرتے اور وہاں تقریروں میں پاکستان کے خلاف زہر لگاتے ہیں۔ مزید برآں ۲۰۰۲ء کے بعد افغانستان میں بھارت کا اثر و نفوذ بڑھا، تو بھارتیوں کے لیے بلوچستان تک پہنچنا آسان ہو گیا۔ چنانچہ خود پاکستانی حکومت کا دعویٰ ہے کہ باغی بلوچ افغانستان میں قائم بھارتی فوجی اڈوں میں جنگی تربیت پاتے اور پھر بلوچستان آ کر تشدد آمیز کاروائیاں کرتے ہیں۔ بھارتیوں کا باغیوں کو جنگی تربیت اور اسلحہ فراہم کرنا..... شاید مشرقی پاکستان اور بلوچستان کی بغاوتوں کے مابین یہ واحد مماثلت ہے۔

امریکا کی غرض و غایت

افغانستان (اور پاکستان کی بھی) جغرافیائی ترقیاتی اہمیت کے باعث امریکا یہاں سے جانا نہیں چاہتا، یہ علاقہ قدرتی وسائل سے مالا مال خطے کے قلب میں واقع ہے۔ نیز یہاں سے تین بڑی طاقتوں چین، روس اور بھارت کی سرحدیں ملتی ہیں۔ امریکا چاہتا ہے کہ چین اور روس کا مقابلہ وہ بھارت کے ساتھ کرے۔ اسی لیے امریکیوں کی خواہش ہے کہ پاکستان جنوبی ایشیا میں بھارت کی بالادستی قبول کرے۔

لیکن پاک فوج یہ حکم تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اسی لیے امریکا کی تمنا ہے کہ علاقائی جنگیں چھیڑ کر پاک فوج کو کمزور کیا جائے۔ اس پالیسی کے تحت بعید نہیں کہ کسی آئی اے اور راکے ایجنٹ بلوچستان، خیبر پختون خواہ اور سندھ میں قتل و غارت کر رہے ہوں۔ مثلاً بلوچستان میں وہ ہزارہ نسل کے افراد اور پنجابی و سندھی آباد کاروں کو ٹارگٹ کرتے رہے ہیں تاکہ مختلف پاکستانی نسلوں کے مابین دشمنی ابھاری جائے۔ اسی طرح کراچی میں بھی غیر ملکی طاقتوں کے ایجنٹ فساد میں ملوث ہو سکتے ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ باغیوں کے موجودہ سردار یورپ میں پُر آشائش زندگی گزار رہے ہیں۔ انھیں زندگی کی ہر سہولت میسر ہے۔ جب کہ ان کی نام نہاد فوج کے سپاہی پہاڑوں میں چھپ اور خاندان کے کٹ کر بڑے بڑے ٹھکان حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر دم ان کے سروں پر موت کا خطرہ منڈلاتا رہتا ہے۔ انھیں یہ بھی احساس ہے کہ وہ اپنے حقوق کی خاطر نہیں سرداروں کی حکومت بچانے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ انہی احساسات کے باعث باغیوں میں بددیہی پھیل رہی ہے۔

عالمی طاقتوں کے کھیل کی ایک جہت ایران سے بھی وابستہ ہے۔ بلوچستان کے تاریخی خطے کا ایک حصہ ایران میں شامل ہے۔ باغی بلوچ پاکستانی و ایرانی حصوں کو ملا کر ”عظیم بلوچستان“ نامی آزاد مملکت بنانا چاہتے ہیں۔ فروری میں بعض امریکی ارکان کانگریس نے اس مملکت کے قیام کی حمایت کی۔ مدعا ایران پر دباؤ ڈالنا بھی تھا جو امریکی استعمار کے خلاف نبرد آزما ہے۔

آخر مینگل کے نکات

اب آئیے شیخ مجیب الرحمن اور اختر مینگل کے چھ نکات کا جائزہ لیں۔ شیخ صاحب کا ۶ نکاتی منصوبہ کچھ یوں تھا:

- ۱۔ وفاق پاکستان کو مضبوط بنایا جائے اور پارلیمنٹ کی بالادستی قائم کی جائے۔
- ۲۔ وفاقی حکومت صرف دفاع اور امور خارجہ اپنے ہاں رکھے، بقیہ محکمے ریاستوں (صوبوں) کے مابین تقسیم کر دیے۔
- ۳۔ مشرقی پاکستان کے لیے علیحدہ کرنسی اور اسٹیٹ بینک تشکیل دیا جائے۔
- ۴۔ گیس لینے کا نظام ریاستوں کو ملنا چاہیے۔
- ۵۔ مشرقی پاکستان کے لیے غیر ملکی زرمبادلہ کا الگ اکاؤنٹ کھولا جائے۔

۶۔ اسی طرح ریاست کے لیے ملیشیا نیم فوجی دستے ملنے سے بنائے جائیں۔

اختر مینگل نے مسئلہ بلوچستان حل کرنے کی خاطر براہم گورٹ اور وفاقی حکومت کے بھی سامنے یہ ۶ نکات پیش کیے:

- ۱۔ بلوچستان میں قبائل کے خلاف تمام خفیہ و عیاں آپریشن ختم کیے جائیں۔
- ۲۔ جتنے بھی کشیدہ لوگ سیکورٹی فورسز نے گرفتار کر رکھے ہیں، عدالتوں میں لائے جائیں۔
- ۳۔ آئی ایس آئی اور ایم آئی (ملٹری انٹیلی جنس) کی رہنمائی میں جتنے بھی خفیہ قاتل سکواڈ کام کر رہے ہیں، وہ ختم کیے جائیں۔

- ۴۔ تمام بلوچ سیاسی جماعتوں کو اجازت دی جائے کہ وہ آزادی سے اپنی سرگرمیاں انجام دیں۔ خفیہ ایجنسیاں ان کے کام میں مداخلت نہ کریں۔
 - ۵۔ بلوچ رہنماؤں اور کارکنوں کے قاتل اور تشدد میں جو بھی لوگ ملوث ہیں، انھیں عدالتی کمرے میں لایا جائے۔
 - ۶۔ متنازعہ علاقوں سے ہجرت کرنے والے ہزار ہا بلوچوں کو مناسب طریقے سے آباد کیا جائے۔
- شیخ مجیب الرحمن اور اختر مینگل کے ۶ نکاتی منصوبوں سے عیاں ہے کہ اول الذکر واضح طور پر علیحدگی کی راہ پر چل رہے تھے۔ جب کہ اختر مینگل نے وہی مطالبات پیش کیے جو قومی سیاسی جماعتیں بھی سامنے لا چکی ہیں۔ ان نکات سے شاید ہی کوئی باشعور فرد اختلاف کرے۔

اچھے انتظامات کی عدم موجودگی

ہمارا پیارا صوبہ بلوچستان لہذا پھلوں، خوبصورت دست کاروں، قیمتی قدرتی وسائل اور حسین باشندوں کا خطہ ہے۔ جو کچھ عرصہ کسی بلوچ شہر میں گزار دے وہ پھر علاقے کے فطری حسن کو بھول نہیں پاتا۔ افسوس کہ پچھلے ایک عشرے سے اس دلکش خطے کو گہن لگ گیا۔ اب وہاں سے خوفناک خبریں ہی آتی اور دل دہلا جاتی ہیں۔

حمود الرحمن کمیشن

رپورٹ 29 سال تک کیوں منظرِ عام پر نہ آ سکی؟

کمیشن کے مطابق یحییٰ خاں کی سب سے بڑی غلطی کیا تھی؟

علامہ اسحاق

جنرل بے اور ۱۹۵۴ء میں ڈھاکا ہائی کورٹ کے جج بننے پر ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے سے استعفیٰ ہو گئے۔ ان کے صاحبزادے اقبال حمود الرحمن اسلام آباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس رہے۔ نومبر ۲۰۰۷ء میں پرویز مشرف نے ملک میں ایمر جنسی نافذ کی تو انھوں نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ مارچ ۲۰۰۹ء میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے بحال ہونے کے بعد لاہور ہائیکورٹ سے کام شروع کیا۔

جسٹس حمود الرحمن ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک ڈھاکا ہائی کورٹ کے جج اور ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ وہ کراچی یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم بھی دیتے رہے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ سپریم کورٹ آف پاکستان

حمود الرحمن یکم نومبر ۱۹۱۰ء میں بھارت کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے گریجوایشن کی

اور یونیورسٹی آف لندن سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ حمود الرحمن نے اپنا کیریئر ایک وکیل کے طور پر ۱۹۳۸ء میں کلکتہ ہائی کورٹ سے شروع کیا۔ وہ ۱۹۴۰ء میں کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں کلکتہ کے ڈپٹی میئر بنے۔ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۷ء وہ بنگال کی جونیئر لیڈنگ کونسل کے ممبر رہے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد وہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کے شہر ڈھاکا چلے آئے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ مشرقی پاکستان کے ایڈووکیٹ

جسٹس



بھٹو نے چیئرمین کمیشن کو خط کیوں لکھا؟

انٹر مینگل نے وہی مطالبات پیش کیے جو قومی سیاسی جماعتیں بھی سامنے لا چکی ہیں۔ ان نکات سے شاید ہی کوئی باشعور فرد اختلاف کرے

میں نفرت پھیلانے کا بھی سبب بنتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے سانحہ مشرقی پاکستان پر مرحوم حبیب جالب نے کہا تھا۔ محبت گولیوں سے بو رہے ہو وطن کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے یقین مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

حاصل کلام

حقائق و حالات سے عیاں ہے کہ مشرقی پاکستان اور بلوچستان میں بغاوت کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ اول الذکر میں عوام بغاوت کا حصہ تھے۔ لیکن آخر الذکر میں شورش کا محور صرف چند بڑے سردار ہیں۔

دوسرا امر یہ ہے کہ بلوچ بغاوت کو اکثر بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ خصوصاً جب سپریم کورٹ حکومت وقت کے خلاف سرگرم ہو، تو اچانک بلوچستان میں فساد بڑھ جاتا ہے۔ تب پریس بلوچ بغاوت کی طرف متوجہ ہوتا اور اس کے متعلق خوب خبریں دیتا ہے۔ اس ہنگامے میں حکومت کے خلاف سپریم کورٹ کی سرگرمی دبی جاتی ہے۔

بہر حال ضروری ہے کہ مسئلہ تدبیر و صبر سے سلجھایا جائے۔ جب مشرقی پاکستان میں طاقت استعمال ہوئی تو حالات مزید بگڑ گئے اور پھر قابو میں نہ آئے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ پاک فوج بلوچ عوام کے لیے مختلف خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس نے وہاں تعلیمی ادارے اور ہسپتال تعمیر کرائے نیز ملازمتیں فراہم کرنے والے ترقیاتی منصوبے شروع کیے۔ بلوچ عوام کو ان کے حقوق دے کر ہی انھیں محبت وطن بنایا جاسکتا ہے۔

البتہ بلوچ عوام کا کہنا ہے کہ سہولتیں دے کر اور جانیں لے کر کسی کو اپنا کیسے بنایا جاسکتا ہے!.....

بلوچستان کا ایک بڑا مسئلہ اچھے انتظام یا گڈ گورننس کی عدم موجودگی ہے۔ اب موجودہ صوبائی حکومت ہی کو لیجیے۔ اس کے وزیر اعلیٰ سال کا بیشتر عرصہ اسلام آباد میں رستے اور قیمتی گاڑیوں میں گھومتے گزارتے ہیں۔ صوبائی اسمبلی کے ۶۵ ارکن ہیں اور ایک کے سوا سب وزیر یا مشیر ہیں۔ یہ اکلوتا صوبہ ہے جہاں ارکان اسمبلی ایک دوسرے پر ہی نہیں وزراء پر بھی الزام لگاتے ہیں کہ وہ اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں ملوث ہیں۔

مزید برآں صوبے میں کرپشن کا دور دورہ ہے۔ ارکان اسمبلی کو ترقیاتی منصوبوں کے لیے حکومت کی طرف جو کروڑوں روپے ملیں، اس کا بیشتر حصہ ان کی تجویروں میں جاتا یا پھر ان کے ایجنٹ ہڑپ کر جاتے ہیں۔ جب حکمران طبقہ ہی کرپٹ ہو، تو صوبے میں لاقانونیت، غربت، جہالت اور احساس محرومی نے قدرتا پھیلنا ہی ہے۔

سیکورٹی فورسز پر الزامات

قوم پرست بلوچ رہنما پاک فوج سمیت مختلف سیکورٹی فورسز پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے پچھلے ۱۰ برس میں ۸ تا ۱۰ ہزار بلوچ باشندے غائب کر دیے۔ سیکورٹی فورسز اس الزام سے انکاری ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غائب شدہ بعض افراد بلوچستان یا افغانستان کے فراری کیمپوں (علحدگی پسندوں کے اڈوں) میں مقیم ہیں۔ یا پھر وہ قبائلی جنگ کا نشانہ بن چکے۔

ماہرین یہ امر بھی آشکار کرتے ہیں کہ علحدگی پسندوں سے نمٹنے کے لیے طاقت کا استعمال ضروری ہے ورنہ وہ شیر ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے، اگر بلوچستان میں سیکورٹی فورسز امن و امان قائم نہ کریں، تو حالات مزید خراب ہو جاتے۔ تاہم طاقت کا غیر ضروری استعمال اور تشدد عوام



جسٹس حمود الرحمن جنرل ضیاء الحق سے ملنے کیوں گئے؟



along with other senior military colleagues.[8]

The report accused General Yahya Khan, of being a womanizer and an alcoholic.[2] According to the report "Firm and proper action would not only satisfy the nation's demand for punishment where it is deserved, but would also ensure against any future recurrence of the kind of shameful conduct displayed during the 1971 war" [Wikipedia]

۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۵ء جسٹس حمود الرحمن نے کمیشن کی تفتیش سے متعلق کئی سینئر ملٹری آفیسرز اور بنگالی قوم پرستوں کے انٹرویوز کیے۔ گورنمنٹ پر تنقید کرنے اور سیاستدانوں پر سنجیدہ الزامات ثابت ہونے کے باعث اس رپورٹ کو عوام کے سامنے لانے کے بجائے "ٹاپ سیکرٹ" کہہ کر دیا گیا۔

اس رپورٹ میں کئی سینئر ملٹری آفیسرز کا کورٹ مارشل کرنے اور کئی کا ٹرائل کرنے کی پُر زور سفارش کی گئی تھی۔ کمیشن نے سفارش کی تھی کہ پاکستان آرمی کے کمانڈر ان چیف جنرل یحییٰ خان، اس وقت کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، جنرل عبدالحمید خان، لیفٹیننٹ جنرل ایس جی ایم ایم یحیٰ زارہ، لیفٹیننٹ جنرل گل حسن، میجر جنرل عمر اور میجر جنرل مٹھا، (آرمی کے ایس ایس گروپ کے کمانڈر) کو ایوب خان کی حکومت کے خلاف سازش کرنے پر قرار واقعی سزا دی جائے۔ دیگر ۵۵ لیفٹیننٹ اور ۱۳ بریگیڈیئرز جن میں لیفٹیننٹ جنرل اے اے کے نبازی، محمد جمشید، محمد رحیم خان، ارشد احمد خان، بی ایم مصطفیٰ اور بریگیڈیئر

کی ادائی سے دور ہو گئے۔ جس کے باعث ملٹری کے کئی بڑے عہدیداران اپنی قابلیت کے باوجود ٹرنے سے عاری رہے۔ رپورٹ کے مطابق جنرل یحییٰ خان نے جان بوجھ کر ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ رپورٹ نے یحییٰ خان پر الزام لگایا کہ وہ زانی اور شرابی تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ قوم صرف ایسے اقدامات سے خوش نہیں ہوگی کہ ان غداروں کو صرف سزا دی جائے بلکہ آئندہ ایسی کوئی شرمناک غلطی نہ ہو، اسے یقینی بنایا جائے۔

(The report accused the generals of what it called a premature surrender and said the military's continued involvement in running the government after 1958 was one reason for the corruption and ineffectiveness of senior officers. 'Even responsible service officers,' the report said, 'have asserted before us that because of corruption resulting from such involvement, the lust for wine and women and greed for lands and houses, a large number of senior army officers, particularly those occupying the highest positions, had lost not only their will to fight but also their professional competence.' [8] The report said Pakistan's military ruler at the time, General Yahya Khan, who stepped down after Pakistan's defeat in December 1971, 'permitted and even instigated' the surrender, and it recommended that he be publicly tried

۱۹۷۴ء کو لاہور میں ایک میننگ کی اور فیصلہ کیا کہ ۱۶ جولائی ۱۹۷۴ء کو ایبٹ آباد سے دوبارہ تفتیشی کارروائی شروع کی جائے گی۔ ۱۹۷۴ء میں کمیشن نے مزید ۷۳ رپورٹس اور ملٹری ہائی کمان کے آفیسرز کے انٹرویوز کیے۔ کمیشن نے تقریباً ۳۰۰ لوگوں کے انٹرویوز اور سیکڑوں ڈاومنٹس سے متعلق چھان بین کی حتمی رپورٹ جسے سپریمری رپورٹ کہا گیا ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں پیش کی۔ رپورٹ ثابت کرتی ہے کہ کس قدر سیاسی، انتظامی، اخلاقی، پستی، بدانتظامی، بددیہی اور بداعمالی مشرقی پاکستان میں پاکستانی فورسز کے سرنڈر کی وجہ بنی۔

کمیشن کے اہم نتائج

کمیشن نے بنگلہ دیش کے راہنماؤں کی طرف سے جاری کردہ وعظوں پر مبنی رپورٹ کو چیلنج کیا۔ ان کے مطابق پاکستانی آرمی ۳۳ ملین بنگالیوں کے قتل اور ۲ لاکھ بنگالی عورتوں کی عصمت دری کے الزامات تھے جبکہ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق مرنے والوں کی یہ تعداد زیادہ سے زیادہ ۲۶ ہزار ہے۔ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق پاکستانی آرمی نے پورے بنگلہ دیش میں لوگوں کا بے ہیمانہ قتل کیا جن میں عام شہری، دانشور، پیشہ ور اور دوسرے لوگ شامل ہیں اور ان سب کو اجتماع قبروں میں دفن کر دیا۔

بنگالی فوجیوں اور سپاہیوں کو ان کی بغاوت کی وجہ سے قتل کیا اور کئی مشرقی پاکستانی صنعت کاروں اور کاروباری حضرات کا قتل کیا اور بہت ساری مشرقی پاکستان کی عورتوں کی جان بوجھ کر انتقام کی غرض سے عزت لوٹی گئی اور ان پر تشدد کیا۔ اقلیتی ہندوؤں کو جان بوجھ کر قتل کیا۔ کمیشن نے سوال اٹھایا کہ ملٹری جنرلز نے ہتھیاریوں ڈالنے ۱۹۵۸ء میں حکومتی معاملات کو چلانے میں آرمی کیوں ملوث رہی، آرمی کا حکومتی کاموں میں ملوث ہونا مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے میں بڑی وجہ ثابت ہوا۔ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق کئی ذمے دار آفیسرز بھی شراب، شباب، زراور زمین کے لالچ میں آکر فرائض

کے جج منتخب ہوئے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۶۸ء میں چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدے پر فائز ہوئے اور پاکستان کے ساتویں چیف جسٹس بنے۔ وہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے فوراً بعد انھوں نے اپنی شہریت تبدیل کر کے پاکستان سے منسوب کر لی۔ انھوں نے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ء کو کراچی میں وفات پائی۔ انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے نذراں امتیاز اور ہلال امتیاز بھی عطا ہوئے۔

۱۹۷۱ء میں جب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو نے سقوط ڈھاکا کے اسباب کی چھان بین کے لیے جسٹس حمود الرحمن کی سربراہی میں "حمود الرحمن کمیشن" بنایا تو یہ زیادہ شہور ہوئے۔

حمود الرحمن کمیشن میں سپریم کورٹ کے جسٹس انوار الحق اور چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ طفیل علی عبدالرحمن کے علاوہ بلوچستان ہائی کورٹ کے ۲ ممبر شامل تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) الطاف قادر کمیشن کے ملٹری ایڈوائزر تھے۔

حمود الرحمن کمیشن کی پہلی رپورٹ جولائی ۱۹۷۲ء میں صدر ہاؤس میں صدر بھٹو کو پیش کی گئی۔ کمیشن کے مطابق یہ ابتدائی رپورٹ تھی کیونکہ کئی ایسے لوگوں کا انٹرویو ہونا باقی تھا جو کہ اس وقت بھارت کی قید میں تھے۔ کمیشن نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے اور دوسرے معاملات سے متعلق ہمارے مشاہدات اور نتائج صرف مشرقی کمانڈ کے کمانڈنگ آفیسر اور اس کے ساتھ کے کئی دوسرے سینئر آفیسرز کے انٹرویو کے بعد ہی حتمی قرار پاسکتے ہیں۔ شروع میں کمیشن نے ۲۱۳ لوگوں کے انٹرویوز کے لیے رپورٹ کی ۱۲ کاپیاں مرتب کیں، جس میں سے ایک کاپی بھٹو صاحب کو دی گئی جبکہ بقیہ کاپیاں یا تو ضائع کر دی گئیں یا پھر چرائی گئیں۔

بھارت سے قیدی رہا ہونے کے بعد ۱۹۷۴ء میں کمیشن کی کارروائی دوبارہ شروع کی گئی۔ اس وقت کئی اور محبت وطن لوگوں نے بھی کمیشن کو انٹرویو دیے جو کہ کمیشن کی تفتیش میں مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ کمیشن نے ۳ جون



اردو ڈائجسٹ
کا مقبول سلسلہ

مشورہ حاضرہ

صغیرہ بانو شیریں

آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، بڑے بڑے مسائل کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

بچوں کی رنگت خراب ہو رہی ہے

س: میری ۲ جڑواں بیٹیاں ہیں۔ عمر ۱۳ سال ہے۔ ان کا رنگ پہلے سفید تھا اب عجیب سی رنگت ہو گئی ہے۔ بیٹا ساڑھے گیارہ سال کا ہے ۱۲ سال پہلے یرقان ہو گیا تھا۔ جب سے وہ بہت سست رہتا ہے۔ تھک جاتا ہے۔ ناک پر تل نکل رہے ہیں۔ ناک سے خون بھی آتا ہے۔ بچوں کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ بتائیے کیا کروں؟ (دردانہ۔ لاہور)

ج: دردانہ آپ لاہور میں رہتی ہیں۔ آپ کسی اچھے حکیم سے بچوں کے متعلق مشورہ کریں۔ اس عمر میں تو رنگ کھرتا ہے۔ آخر وجہ کیا ہے؟ پیٹ میں کیڑے تو نہیں۔ بھائی عبدالوحید سلیمانی صاحب کے پاس اچھی دوائیاں ہیں۔ آپ بچوں کو دکھا کر دوا لیجیے۔ اسی طرح یرقان کے بعد غذا کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس کا اثر رہتا ہے۔ پہلی فرصت میں بچوں پر توجہ دیں۔ دوا کھائیے، بچوں کو بڑھتی ہوئی عمر میں متوازن اور اچھی غذا دینی چاہیے۔ اناج، جج، مہزی اور پھل روزانہ خوراک میں شامل ہونے چاہئیں۔ شہد قدرت کا اصول تھہ ہے۔ گردے، جگر کی بیماریوں کو دور کرتا ہے۔ اس کے کھانے سے چہرے کی رنگت ٹھہر جاتی ہے۔ جسم کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیماری کے بعد کی کمزوری دور ہوتی ہے۔ چند روز بچوں کو گیہوں کا دلیا دودھ میں پکا کر شہد ڈال کر کھلائیے۔ موسم کے پھل کھلائیے۔ گاجر کا جوس بچوں کو پلائیے اور گاجر کا حلوہ بنا کر کھلائیے۔ ڈرائی فروٹ بھی صحت کے لیے ضروری ہیں۔ ۵۰ بادام اور چھ بھر کشمش رات کو دودھ کے ساتھ بچوں کو دیجیے۔ اس سے حافظہ بہتر ہوگا اور صحت بھی۔ مناسب دوا اور اچھی غذا سے بچوں کی بڑھوتری سچ رہے گی۔ قد، کٹھ بھی بڑھے گا۔

جسمانی کمزوری

س: قاری رحمان حیدر ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھتے ہیں کہ ”آپ کا مشورہ حاضر ہے۔“ میرا چہرہ بے رونق ہے اور جسم بھی ڈبلا پتلا ہے۔ جس کی وجہ سے میں احساس کمتری کا شکار ہوں۔ دوستوں میں سب سے کمزور ہوں۔ مجھے بتائیے کیا کروں؟ کیسے میری صحت بہتر ہو سکتی ہے۔

حمود الرحمن کمیشن نے ۱۹۷۱ء کے بحران میں بھٹو کو ملوث پایا اور اس کے کردار پر گرفت کی۔ جسٹس حمود الرحمن کے مطابق یہ نیچی خان کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ وہ سیاست میں آئے۔ جسٹس حمود الرحمن کی رپورٹ کے مطابق ملک کے دو لخت ہونے کی ذمہ داری اس وقت کی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ جب رپورٹ بھٹو کو پیش کی گئی تو اس نے چیئر مین کمیشن کو جواب لکھا کہ کمیشن نے متعین کی گئی حدود میں زیادتی کی ہے۔ کمیشن کو ملٹری کی ناکامیوں کے متعلق تفتیش کے لیے کہا گیا تھا نہ کہ سیاسی ناکامیوں سے متعلق اور بھٹو نے رپورٹ پر ناپ سیکرٹ کی مہر لگا کر فائل ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ جلد ہی نیول انٹیلی جنس والے وزیر اعظم سیکرٹریٹ سے وہ رپورٹ کسی طور پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۷۵ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے حمود الرحمن کو بتایا کہ کمیشن کی رپورٹ پرائم فسر سیکرٹریٹ سے گم ہو گئی یا پھر چرائی گئی ہے اور وہ کہیں بھی نہیں مل رہی۔ جسٹس حمود الرحمن چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ رپورٹ کو منظر عام پر لایا جائے مگر ضیاء الحق نے بھی وہی جواب دیا کہ رپورٹ کہیں نہیں مل رہی اور کوئی نہیں جانتا کہ رپورٹ کہاں گئی ہے؟ تاہم اگست ۲۰۰۰ء میں رپورٹ کے کچھ حصے بھارتی میگزین انڈیا ٹو ڈے میں شائع ہوئے اور کچھ دنوں بعد پاکستان کے انکشاف اخبار ڈان نے پاملمنری رپورٹ کی تفصیل شائع کی۔ دسمبر ۲۰۰۰ء میں ۲۹ سال بعد صدر پرویز مشرف نے پہلی بار پوری رپورٹ منظر عام پر لانے کی منظوری دی۔

افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ ملک ٹوٹ گیا۔ افواج پاکستان کی عزت، نام اور وقار پر دھبا لگا مگر کمیشن بنانے سے زیادہ کوئی عملی قدم نہ اٹھایا گیا۔ زندہ تو میں اپنی غلطیوں سے سیکھتی اور آئندہ ویسی غلطیاں کرنے سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ ہم بھی خوب لوگ ہیں۔ اول تو غلطی مانتے نہیں اور مان لیں تو اس سے کچھ سیکھتے نہیں۔ یقین نہیں آتا تو نمونے کے طور پر بلوچستان اور وزیرستان کو دیکھ لیں۔

افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ ملک ٹوٹ گیا۔ افواج پاکستان کی عزت، نام اور وقار پر دھبا لگا مگر کمیشن بنانے سے زیادہ کوئی عملی قدم نہ اٹھایا گیا۔ زندہ تو میں اپنی غلطیوں سے سیکھتی اور آئندہ ویسی غلطیاں کرنے سے محفوظ ہو جاتی ہیں

جنرل جی ایم باقر صدیقی، محمد حیات اور محمد اسلم نیازی کو فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی وجہ سے سزا دینی چاہیے۔ کمیشن کے مطابق جنرل مصطفیٰ کا بھارت میں راجستھان کے علاقے رام گڑھ پر قبضہ کرنے کا جارحانہ منصوبہ نہایت ہی غیر معتبر اور حقیرانہ تھا۔ جس کے نتیجے کے طور پر صحراؤں میں ہینکلر اور ساز و سامان چھوڑ کر آنا پڑا۔ اس کمیشن نے پاکستان فضائیہ کے لیفٹیننٹ جنرل انعام الحق مشرقی پاکستان نیول کمانڈ کے کمانڈر وائس ایڈمرل محمد شریف، لیفٹیننٹ جنرل نکا خان، مشرقی پاکستان آرمی کے جنرل کمانڈنگ آفیسر اور پاکستان آرمی کے سابقہ جنرل عامر خان نیازی اور راؤ فرمان علی کا کورٹ مارشل کرنے کی بھی سفارش کی تھی، تاہم بھٹو اور اس کی حکومت نے کسی قسم کا کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا نہ کسی سفارش کو عملی جامہ پہنایا اور رپورٹ مردہ خانے میں پھینک دی گئی۔ حمود الرحمن نے فوجی اور سیاسی پہلوؤں کے حوالے سے رپورٹ میں ۵۰ الگ الگ ابواب لکھے اور ذوالفقار علی بھٹو کے متنازع کردار کے متعلق بھی وضاحت سے لکھا۔

ج: کچھ لوگ وراثت میں ہی دبلا پن لے کر آتے ہیں۔ اب مجھے معلوم نہیں آپ کے گھر والے جسامت میں کیسے ہیں۔ بزرگ کہتے ہیں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کھاتے بکری کی طرح اور سوکھتے ہیں گڑی کی طرح۔ بہر حال آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ صبح سویرے اٹھنے کی عادت ڈالیں۔ مسجد میں جا کر باجماعت نماز فجر ادا کیجیے اور پھر آدھا گھنٹہ صبح کی سیر کیجیے۔ ۲/۱۲ اخر صبح اور ۵/۱۲ بامداد کھائیے۔ پھر جو بھی ناشتا کرتے ہیں وہ کر لیجیے۔ دن میں ۳۰ کیلوں کا ملک شیک ضرور پیئیں۔ آپ نے ایک ماہ روزانہ یہ معمول جاری رکھنا ہے۔ صحت کے لیے کیلا بہت مفید ہے۔ اب سردی کا موسم آرہا ہے۔ ابھی ہوئی شکر قندی بھی جسم کو موٹا کرتی ہے۔ آپ کے چہرے پر رونق آجائے گی۔ رنگ بھی صبح ہو جائے گا۔ اس عمر میں زیادہ گرم چیزیں نہیں کھانی چاہئیں اور نہ ہی رات کو ٹی وی پر فضول پروگرام دیکھنے چاہئیں۔

دل کی دھڑکن

س: ماہرہ کمپیوٹر سائنس راجن پور سے پوچھتی ہیں۔ میرے دل کی دھڑکن ہر وقت تیز رہتی ہے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اور نماز پڑھتے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور ہاتھ کا پھینک لگتے ہیں۔ رات کی نیند بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ سکول میں پڑھاتی ہوں۔ آپ اس بارے میں کچھ مشورہ دیں گی۔

ج: آپ کا طویل خط میرے سامنے ہے۔ اب سب سے بڑا مسئلہ دل کی تیز دھڑکن کا ہے۔ پچھلے دنوں میرے سامنے تین چار خواتین کے تھائی رائیڈ غدد کا کرڈی کی کمی اور زیادتی کے مسائل آئے۔ یہ غدد گٹے میں زرخرے کے نیچے ہوتا ہے۔ یہ جسم کے تمام خلیوں کو توانائی پہنچانے کے عمل کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں عموماً خواتین اس بیماری کا شکار ہوتی ہیں جبکہ ایک جائزے کے مطابق دنیا کی ۱۵ فیصد آبادی اس مرض میں مبتلا ہے۔ اس کی کارکردگی بڑھ جائے یا کم ہو جائے دونوں صورتوں میں صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ خون کا ٹیسٹ کرانے سے پتا چل جاتا ہے۔ آپ پہلی فرصت میں کسی اچھے ڈاکٹر سے دو لیں۔

کولیسٹرول

س: رحمان علی پوچھتے ہیں۔ کولیسٹرول کم رکھنے کے لیے کوئی سادہ اور اچھا سا مشورہ دیں تاکہ میری طبیعت جلد بہتر ہو جائے اور میں چٹ پٹے کھانے دوبارہ کھا سکوں۔

ج: زندگی ہے تو کھانے کا بھی مزہ ہے۔ آپ کولیسٹرول کے مریض ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ سادہ اور متوازن غذا کو معمول بنالیں۔ بازار کے تلے گروے، کپورے، بھیجا، سری پائے اور نہاری کھانا چھوڑ دیں۔ ان میں بہت کولیسٹرول ہوتا ہے۔ دوپہر کے کھانے میں سلا اور چکنی سبزی ضرور شامل کریں۔ گوشت کم سے کم کھائیں۔ خصوصاً بڑا گوشت، دھبے گھی، کھن، کریم والا دودھ نہ لیں۔ اسی طرح اگر آپ کو انڈے پسند ہیں تو صرف سفیدی استعمال کریں۔ بیکری کی چیزیں کیک، پیسٹری، بسکٹ، برگر، شوارما نہ کھائیں۔ گاجر، مولیٰ وغیرہ آپ کے لیے مفید ہیں۔ اسی طرح آپ کو لڈو، ریک، کافی اور بازاری جوس نہ لیں۔ پرہیز سے آپ بیماری پر قابو پا سکتے ہیں۔

نکسیر

س: مجھے نکسیر کا مرض ہے۔ بعض مرتبہ ناک سے بہت خون نکلتا ہے۔ آپ اس بارے میں کوئی مشورہ دے سکیں گی کیونکہ اس وجہ سے میں اب بہت پریشان ہو چکا ہوں۔ (عمیر)

ج: نکسیر سے واقعی خوف آتا ہے۔ کسی نے ایک ٹوکا بتایا کہ مٹی کے گھڑے میں رکھا پانی لے کر اس پانی کو ناک میں

ڈالیں۔ عام طور پر اسے پانی کی نساور بھی کہا جاتا ہے۔ مٹی کے لوٹے میں پانی لے کر روزانہ ۷/۸ دن تک یہ عمل کریں۔ ان کا کہنا ہے کہ پھر زندگی میں بھی نکسیر نہیں پھوٹی۔ بے شمار لوگوں کو یہ ٹوکا بتایا اور سب اللہ کے حکم سے شفا یاب ہو گئے۔ آپ بھی آزمائیے۔ اسی طرح ناریل کا ایک ٹکڑا انگلیوں کے برابر لے کر رات کو مٹی کے پیالے میں بھگو کر صبح کھایا جاتا ہے۔ یہ پانی بھی پی لیتے ہیں۔ ایک ہفتہ تک ناریل کھانے سے نکسیر نہیں آئے گی۔ گرم چیزوں سے پرہیز کریں۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔

باتھو کا ساگ

س: سرسوں کے ساگ کے ساتھ باتھو ملتا ہے۔ اس کی جڑیں بھی ساتھ ہوتی ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ ہے یا صرف گھاس بھوس ہے؟ (شاہن)

ج: اللہ نے ہر چیز میں کوئی نہ کوئی فائدہ رکھا ہے حتیٰ کہ گھاس بھوس میں بھی۔ مختلف قسم کی گھاس میں بھی اثرات ہیں اور باتھو جسے بھوا بھی کہتے ہیں اس کے بغیر ساگ اچھا نہیں پکتا۔ اس میں باتھو کی وجہ سے خاص ذائقہ آ جاتا ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کھائی بہت پرانی ہو، سینہ میں بلغم جم گیا ہو اور کسی طرح نفلت نہ ہو تو اسے پکا کر کھانے سے آرام آ جاتا ہے۔ ایک چمچ زیتون کا تیل لیں، سفید زیرہ، چملا ہوا، لہسن کٹا ہوا اور ثابت مرچ ڈال کر اس میں باتھو کا ساگ ڈال دیں۔ ہلکی آگ پر اپنے ہی پانی میں پکنے دیں پھر بھون کر اتار لیں۔ چند روز روٹی کے ساتھ کھالیں، بہت فائدہ ہوگا۔ اسی طرح جب پیٹ میں پانی بھر جائے تو پرانے طبیب کہتے ہیں کہ گہووں کا دلیہ پکا کر اس میں باتھو کا ساگ ڈال کر کھانے سے فرق پڑتا ہے اور کچھ نہ کھائیں۔ صبح شام دلیہ بھی اور ساگ پیٹ بھر کر کھائیں۔ درم دور ہو جاتا ہے بلکہ کچھ لوگ تو باتھو کو اچھی طرح کوٹ کر ڈنڈے سے کوٹ کر پانی ملا کر مختلف عریقات اور دواؤں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ آپ اسے گھاس پھوس نہ جانے بڑے کام کی اور صحت بخش غذا ہے۔ اسی طرح باتھو کے پرائے بہت لذیذ بنتے ہیں۔ نمک، مرچ، لہسن، سفید زیرہ، اورک اور ہری مرچ کوٹ کر باتھو کا ساگ باریک کاٹ کر ہلکی آگ پر بھون لیتے ہیں۔ ٹھنڈا ہونے پر آٹے میں گوندھ کر تندو میں پرائے بنائیں یا گھر میں خود بنا کر کھائیں تو آپ کو بہت اچھے لگیں گے۔ اسی طرح میتھی کے پرائے بنتے ہیں۔ میتھی کے پتے صاف کر کے کاٹ کر نمک مرچ ملا کر آٹے میں ملا کر روٹی یا پرائٹھا بناتے ہیں۔ اس طرح کی چیزیں کھانی چاہئیں، ان سے فائدہ بھی ہوتا ہے اور صحت بھی بہتر رہتی ہے۔ صرف گوشت کھانے سے صحت نہیں بنتی اور وہ بھی برا کر مرغی کا۔ جس کے کھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

سگریٹ پیتی ہوں

س: کالج میں مذاق مذاق میں سگریٹ پینے لگی اور پھر ایسی عادت پڑی کہ دن میں دو تین بار چپکے سے سگریٹ پیئے بغیر گزارہ ہی نہیں ہوتا ہے۔ شادی ہوئی تو میاں بھی خوب سگریٹ پیتے تھے۔ اب ان کے ساتھ میں بھی پینے لگی۔ اب میں اُمید سے ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ سگریٹ چھوڑ دو بچے پر برا اثر پڑے گا۔ اب مجھے آپ سے پوچھنا ہے کہ ایسا مشورہ دیں جس سے سگریٹ بھی نہ چھوڑنی پڑے اور بچے پر بھی کوئی اثر نہ پڑے۔ مہربانی ہوگی۔ (ش)

ج: بی بی!..... ایسا کوئی ٹوکا نہیں جس سے آپ کا بچہ سگریٹ نوشی کے اثرات سے محفوظ رہے۔ سگریٹ نوش ماؤں کو چاہیے وہ اپنے بچے کو تحفظ مہیا کریں۔ بچے کا سر چھوٹا رہ جاتا ہے بعض اوقات بچہ پہلے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ بچہ فوت بھی ہو جاتا ہے۔ کئی دوسرے امراض لگ جاتے ہیں۔ آپ کی ڈاکٹر ٹھیک کہتی ہیں کہ حاملہ خواتین کو سگریٹ چھوڑ دینی چاہیے۔

ماہ رواں کی شخصیات

ماہ رواں سے ایک سلسلے کا بھی آغاز کر رہے ہیں۔ بہت محنت سے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ آپ کے لیے اہم معلومات کا ذخیرہ ثابت ہوگا
محمد خلیل چودھری (دینہ)

ماہ دسمبر میں پیدا ہونے والی اہم شخصیات

- ۱۔ دسمبر ۱۹۲۷ء سلیم احمد (اردو شاعر ادیب نقاد)
- ۲۔ دسمبر ۱۹۳۸ء سرفراز نواز (کرکٹر)
- ۳۔ دسمبر ۱۹۱۲ء یوسف ظفر (شاعر)
- ۴۔ دسمبر ۱۸۲۵ء شہرت بخاری
- ۵۔ دسمبر ۱۷۵۳ء سر رولینڈ ہل (ڈاک ٹکٹ کے موجد)
- ۶۔ دسمبر ۱۸۸۲ء راجندر پرشاد (بھارت کے پہلے صدر)
- ۷۔ دسمبر ۱۹۰۸ء غازی علم الدین شہید
- ۸۔ دسمبر ۱۹۲۸ء ڈاکٹر انور سدید (ممتاز اردو ادیب نقاد و شاعر)
- ۹۔ دسمبر ۱۸۹۸ء جوش ملیح آبادی (شاعر)
- ۱۰۔ دسمبر ۱۹۰۵ء شیخ عبداللہ (نصیری رہنما)
- ۱۱۔ دسمبر ۱۹۱۸ء مگن ناتھ آزاد (سیاسی رہنما)
- ۱۲۔ دسمبر ۱۸۳۶ء ڈپٹی نذیر احمد (اردو کے ناول نگار)
- ۱۳۔ دسمبر ۱۹۳۰ء ایس ایم ظفر (ماہر قانون)
- ۱۴۔ دسمبر ۱۷۶۱ء امام داتا گنج بخش (موسیٰ مجسموں کے عجیب گہری بانی)
- ۱۵۔ دسمبر ۱۹۳۳ء ڈاکٹر تنویر عباسی
- ۱۶۔ دسمبر ۱۹۲۵ء ناصر کاظمی (عظیم شاعر)
- ۱۷۔ دسمبر ۱۸۷۵ء سرتاج بہادر سید (بھارت کے سیاسی لیڈر)
- ۱۸۔ دسمبر ۱۸۳۷ء نواب حسن الملک (آزادی کے رہنما)
- ۱۹۔ دسمبر ۱۶۰۸ء جان ملٹن (انگریز شاعر)
- ۲۰۔ دسمبر ۱۸۷۸ء مولانا محمد علی جوہر (کامریہ اور ہمدرد کے بانی)
- ۲۱۔ دسمبر ۱۹۳۲ء پریشان خٹک (ماہر تعلیم)
- ۲۲۔ دسمبر ۱۹۶۳ء جہانگیر خان (اسکواٹس کے عظیم کھلاڑی)
- ۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۲ء ولیپ کمار (بھارتی فلمی اداکار)
- ۲۴۔ دسمبر ۱۹۶۸ء محمد موسیٰ خان شنواری (پشتو ادیب)
- ۲۵۔ دسمبر ۱۹۳۷ء پروفیسر ڈاکٹر محمد امین (شاعر، ادیب، معلم)
- ۲۶۔ دسمبر ۱۹۳۸ء جنس افتخار محمد چودھری (چیف جسٹس پاکستان)
- ۲۷۔ دسمبر ۱۹۲۶ء پرنس کریم آغا خان (اسامیل امام)
- ۲۸۔ دسمبر ۱۹۰۲ء اسد ملتانی (شاعر، گلوکار)
- ۲۹۔ دسمبر ۱۸۹۵ء چارلس ششم (برطانیہ کا بادشاہ)
- ۳۰۔ دسمبر ۱۹۱۰ء اوپندر ناتھ اشک (ادیب)
- ۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۵ء جون ایلینا (شاعر)
- ۳۲۔ دسمبر ۱۹۳۰ء اقبال فرید (ممتاز شاعر اور براڈ کاسٹر)
- ۳۳۔ دسمبر ۱۵۶۳ء حضرت باقی باللہ (سلسلہ نقشبندیہ کے بانی)
- ۳۴۔ دسمبر ۱۷۷۰ء پیٹھوون (ممتاز موسیقار)
- ۳۵۔ دسمبر ۱۹۳۸ء پیٹر اسٹینل (مشہور انیتیلیٹ نیوزی لینڈ)
- ۳۶۔ دسمبر ۱۸۹۲ء سید عطاء اللہ شاہ بخاری (امیر شریعت)



نواب حسن الملک مولانا محمد علی جوہر سلیم احمد ڈپٹی نذیر احمد جون ایلینا جان ملٹن

۱۸۔ دسمبر ۱۸۵۳ء لین پول

۱۹۔ دسمبر ۱۹۰۶ء بریٹنٹف (سابق روسی صدر)

۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۵ء شفیق خواجہ (ممتاز ادیب)

۲۰۔ دسمبر ۱۹۰۹ء باقی صدیقی (شاعر)

۲۰۔ دسمبر ۱۹۱۱ء قاری حکیم احمد علی بھتی

۲۱۔ دسمبر ۱۸۷۹ء اسٹالن (روسی صدر)

۲۱۔ دسمبر ۱۹۲۳ء انتظار حسین (ممتاز افسانہ نگار)

۲۲۔ دسمبر ۱۸۹۶ء ڈاکٹر دین محمد تاثیر (ادیب، سیاسی شخصیت)

۲۲۔ دسمبر ۱۹۳۵ء ڈاکٹر خلیق انجم

۲۳۔ دسمبر ۱۸۹۲ء نورالامین (پاکستانی پہلے نائب صدر)

۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۳ء مظفر وارثی (شاعر)

۲۴۔ دسمبر ۱۱۶۷ء چنگیز خان منگول (جابر حکمران)

۲۴۔ دسمبر ۱۹۲۳ء محمد رفیع (گلوکار)

۲۵۔ دسمبر ۱۸۷۵ء قائد اعظم محمد علی جناح (بانی پاکستان)

۲۵۔ دسمبر ۱۶۲۴ء نیٹون (ممتاز سائنس دان)

۲۵۔ دسمبر ۱۹۱۸ء انورالسادات (سیر کے سابق صدر سیاستدان فوجی افسر)

۲۵۔ دسمبر ۱۹۵۰ء معین اختر (نئی وی فنکار)

۲۶۔ دسمبر ۱۸۹۳ء مازہ بے تنگ (جینی رہنما)

۲۶۔ دسمبر ۱۸۶۵ء مولوی نور الحسن کاکوری (نوراللفات کے مولف)

۲۷۔ دسمبر ۱۵۷۰ء جوبانس کیپلر (جرمن ریاضی دان/ماہر فلکیات)

۲۷۔ دسمبر ۱۷۹۰ء مرزا غالب (شاعر)

۲۷۔ دسمبر ۱۸۷۸ء خواجہ حسن نظامی (ادیب)

۲۸۔ دسمبر ۱۹۳۱ء انتخاب عالم (کرکٹر)

۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۷ء مامون عبدالقیوم (مالیپ کے سابق صدر)

۲۹۔ دسمبر ۱۹۷۶ء فٹلین مشتاق (پاکستانی کرکٹر)



شیریں جناح پطرس بخاری نورالامین

۳۰۔ دسمبر ۱۸۶۵ء ژیاڈ یارڈ کیپلنگ (برطانوی ادیب)

۳۰۔ دسمبر ۱۹۳۲ء ڈاکٹر صفدر محمود (ممتاز ادیب - محقق)

۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کرنل غلام سرور (ادیب)

۳۱۔ دسمبر ۱۸۳۰ء اسماعیل پاشا (خدایہ مصر)

ماہ دسمبر میں وفات پانے والی شخصیات

یکم دسمبر ۱۹۸۰ء چودھری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان)

یکم دسمبر ۱۹۹۳ء میاں محمد شفیع (م۔ش)، (ممتاز صحافی)

۲۔ دسمبر ۱۹۸۱ء شیریں جناح (قائد اعظم کی بہن)

۲۔ دسمبر ۱۸۶۲ء نقشا (اداکار)

۳۔ دسمبر ۱۹۸۲ء استاد دامن (دیوانی شاعر)

۳۔ دسمبر ۱۹۸۹ء علامہ صفدر حسین نجفی (عالم دین)

۴۔ دسمبر ۱۹۹۰ء علامہ حسین بخش جاڑا (ممتاز شیعہ عالم دین)

۴۔ دسمبر ۱۹۹۴ء مولانا صلاح الدین شہید (تکبیر کے مدیر)

۵۔ دسمبر ۱۹۵۸ء احمد شاہ پطرس بخاری (مزاح نگار مصنف، اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوب)

۵۔ دسمبر ۱۹۶۳ء حسین شہید سہروردی (سابق وزیر اعظم پاکستان)

۵۔ دسمبر ۱۹۸۲ء روشن آرا بیگم (ملکہ موسیقی)

۶۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میر شجیر شریف شہید (نشان حیدر)

۶۔ دسمبر ۲۰۰۰ء عزیز میاں (معروف قوال)

۷۔ دسمبر ۱۹۶۸ء مولوی محمد یوسف (میر واعظ)

۷۔ دسمبر ۱۷۸۲ء حیدر علی (میسور کا حکمران)

۸۔ دسمبر ۱۹۷۴ء علامہ ظفر احمد عثمانی (تحریک پاکستان کے رہنما)

۸۔ دسمبر ۱۹۷۵ء امیر کاظمی (شاعر، نغمہ نگار)

۹۔ دسمبر ۱۹۷۰ء ملک فیروز خان نون (سابق وزیر اعظم پاکستان)



خواجہ حسن نظامی



دین محمد تاثیر



سارلن

۹ دسمبر ۱۹۹۰ء نرالا (قلمی اداکار)

۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء سوار محمد حسین شہید (نشان حیدر)

۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء الفریڈ ٹوبل (نوبل انعام کا بانی)

۱۱ دسمبر ۲۰۰۰ء بیگم شائستہ اکرام اللہ (تحریک پاکستان کی رہنما)

۱۱ دسمبر ۱۹۳۹ء باری علیگ (اردو کے ممتاز مصنف نقاد)

۱۲ دسمبر ۱۹۳۰ء شیخ عطاء محمد (علامہ اقبال کے برادر بزرگ)

۱۲ دسمبر ۱۹۹۴ء ظہیر کاشمیری (شاعر)

۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء میجر محمد اکرم شہید (نشان حیدر)

۱۳ دسمبر ۱۹۳۴ء علامہ شبیر احمد عثمانی (تحریک پاکستان کے رہنما)

۱۳ دسمبر ۱۹۸۰ء ڈاکٹر عابد حسین (ممتاز دانشور)

۱۴ دسمبر ۱۹۹۹ء جارج واشنگٹن (امریکی صدر)

۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء ایم ہالک (سابق گورنر شرقی پاکستان)

۱۵ دسمبر ۱۹۶۶ء والٹ ڈزنی (ڈزنی لینڈ کا خالق، اداکار، فلم ڈائریکٹر)

۱۵ دسمبر ۱۹۷۲ء عابد حسین اختر مراد آبادی (اردو کے شاعر)

۱۵ دسمبر ۱۹۸۶ء ارقام چغتائی (معروف صحافی اور ادیب)

۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء مولانا سید محمد داؤد غزنوی (عالم دین)

۱۶ دسمبر ۱۹۸۱ء حکیم آفتاب احمد قرشی

۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء مولانا جلال الدین رومی (مثنوی معنی کے خالق)

۱۷ دسمبر ۱۹۸۱ء فضل احمد کریم فضلی (معروف شاعر، ساز، ہدایتکار)

۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء لانس ٹینک محمد محفوظ شہید (نشان حیدر)

۱۸ دسمبر ۱۱۱۱ء امام غزالی (عظیم مسلمان فقیہ)

۱۸ دسمبر ۱۹۷۳ء علامہ رشید ترابی (ممتاز شیعہ عالم دین)

۱۹ دسمبر ۱۹۸۲ء ڈاکٹر عبداللہ چغتائی (ممتاز ادیب، مورخ)

۱۹ دسمبر ۱۸۵۷ء احمد خان کھل (مجاہد جنگ آزادی)

۲۰ دسمبر ۱۹۸۱ء جنس جود الرحمن (سابق چیف جسٹس)

۲۰ دسمبر ۱۹۹۱ء مولانا ظفر احمد انصاری (عالم دین، رہنما تحریک پاکستان)

۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء حفیظ جالندھری (قومی ترانے کے خالق)

۲۱ دسمبر ۱۲۶۲ء شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی (دینی رہنما، عظیم صوفی)

۲۲ دسمبر ۱۸۸۰ء جارج ایلیٹ (انگریز ناول نگار)

۲۲ دسمبر ۱۹۸۶ء ساقی (ادا کار)

۲۳ دسمبر ۲۰۰۰ء ملکہ ترنم نور جہاں (گلوکارہ)

۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (ماہر تعلیم، ریاضی دان)

۲۴ دسمبر ۱۹۲۶ء عبدالعلیم شرر (ممتاز ادیب)

۲۴ دسمبر ۱۵۲۳ء واسکو ڈے گاما (پرتگالی مہم جو)

۲۵ دسمبر ۱۹۹۴ء پروین شاکر (ممتاز شاعرہ)

۲۵ دسمبر ۱۹۸۵ء معبود کھدر پوش (معروف دانش ور)

۲۵ دسمبر ۱۹۹۴ء باباجی اے چشتی (مشہور موسیقار)

۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء ظہیر الدین بابر (مغل حکمران)

۲۶ دسمبر ۱۹۷۲ء ہیری ایس ٹرومین (سابق امریکی صدر)

۲۶ دسمبر ۱۹۷۲ء سر وارنر سکندر حیات (سیاستدان)

۲۷ دسمبر ۱۹۸۸ء بطور عالم شہید (ممتاز صحافی)

۲۷ دسمبر ۱۹۷۸ء یو دین (الجزائر کے سابق صدر)

۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء حکیم اجمل خان (مسلم لیگ رہنما، عظیم ماہر طب)

۲۸ دسمبر ۱۹۵۸ء میاں محمد حسین نقشبندی (عالم دین، پنجابی شاعر)

۲۹ دسمبر ۱۹۷۳ء شرمجندہ اختر (نامور صحافی و ادیب)

۲۹ دسمبر ۱۹۸۸ء محمد ادریس (مشہور صحافی و براڈ کاسٹر)

۳۰ دسمبر ۱۹۷۹ء انور بہزاد (ممتاز ٹیوز ریڈر)

۳۱ دسمبر ۱۹۱۲ء مولانا الطاف حسین حالی (مصنف اور شاعر)

۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء مفتی کفایت اللہ (عالم دین)



الفریڈ ٹوبل



جارج ایلیٹ



نور جہاں



حکیم اجمل خان



شیخ عطاء محمد



مولانا جلال الدین

مشرقی

پاکستان کیسے بنگلہ دیش بنا، اندرا گاندھی نے کیوں کہا کہ ہم نے ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے لیا۔ ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہم آج آپ کے سامنے ڈاکٹر محمود الرحمن کی کتاب ’سونا بنگلہ‘ (سنہری بنگال)، ایک سچی کہانی پیش کر رہے ہیں، اس کہانی کا ہیرو ابوالکلام ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔

تعارف کتاب ’سونا بنگلہ‘

کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ظفر جمال بلوچ رقم طراز ہیں ”اس کتاب میں محض ان مجاہدوں کے کارناموں ہی کا تذکرہ نہیں ہے، جنہوں نے اسلام کی سر بلندی کے لیے پاک فوج کے ساتھ مشرق میں تعاون کیا، بلکہ ایک حد تک اُس دور کی سیاسی تاریخ کا تذکرہ بھی ملے گا، جس میں جہاں آپ کو حب الوطنی کے پیکر چلتے پھرتے نظر آئیں گے، وہیں راہبروں اور رہنماؤں کے روپ میں میر جعفر و صادق بھی ملیں گے، جنہیں پہچاننا اہل نظر کے لیے مشکل نہ ہوگا۔“

مطالبہ کی میز پر

نوید اسلام صدیقی

دیباچہ

ڈاکٹر محمود الرحمن لکھتے ہیں: سنہری بنگال کی رنگینی و رعنائی اپنی مثال آپ ہے، یہ زرخیز خطہ جہاں ہمیشہ سے سمندری طوفانوں کی آماجگاہ بنا رہا وہاں اس دھرتی نے ہزاروں سیاسی طوفانوں کو بھی جنم دیا اور تیز طرار بنگالیوں کی زندگی میں پھیل چا کر رکھ دی۔ ایسا ہی ایک طوفان بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں برپا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں انسانوں کی جھینٹ اپنی انگوٹھ میں لے کر چلتا بنا۔ چین کے زوال کے بعد یہ اسلام کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

ایک سچا مسلمان ”ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست“ پر کامل یقین رکھتے ہوئے ہمیشہ وطنیت سے بالاتر ہو کر سوچتا ہے۔ تاریخ عالم میں بہت سے ممالک کے ساتھ عبرتناک شکست کے حوادث پیش آئے اور ان کے علاقے دھرتی کے سینہ پر اسی طرح موجود رہے لیکن پاکستان کا معاملہ ان سے مختلف تھا۔ پاکستان کسی خطہ زمین کا نام نہیں، ایک مقصد اور نظریہ کا نام تھا۔ پاکستان ایک امانت کا نام تھا، جسے ہم نے خدائے لم یزل سے اس لیے حاصل کیا تھا کہ ہم اس میں خدا کا قانون

زندگی کی سب سے قیمتی بات
اچھی کتاب
نیا دیکھو اور نہیں

آئیے.....! کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریے

کتابوں کی کہکشاں

یہ کالم آپ کو کتابوں پر تبصرے سے کافی مختلف لگے گا
اس میں کتاب اور صاحب کتاب دونوں کا تذکرہ رہے گا

نویسہ اسلام صدیقی

کتابوں کی کہکشاں اس مرتبہ بجائی گئی ہے کچھ دینی مذہبی کتابوں سے، نئی نسل کے لیے زندگی میں کامیابی کے موضوع پر ایک اہم کتاب سے، آپ کو گھر بیٹھے امریکا کی سیر کرانیں گے اور ۲۰ کتب شاعری کی بھی ہیں، ایک ذرا مختلف ہے اور دوسری 'گلدگدلی' کرنے کے لیے ہے

عہد نامہ جدید، دونوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اس پوری
انجیل سے انہوں نے یہودیوں کے مزاج، کردار، تباہی اور



یوم الغضب

یہ کتاب "The Day of Wrath" کا اردو ترجمہ ہے، یہ عظیم تصنیف بلاذ عرب کی ایک علمی اور معروف شخصیت کی ہے جس کا اسم گرامی عبدالرحمن الحواری ہے۔ آپ جرأت سے اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ہیں اور آپ نے حق گوئی کی پاداش میں بے پناہ صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔ آپ امریکہ اور یہودیوں کی سازشوں سے عالم اسلام کو آگاہ کر رہے ہیں۔ تاکہ آنے والی تسلیں اس خوفناک تباہی سے محفوظ رہ سکیں۔

اس کتاب میں مصنف نے خود یہودیوں کی تمام مذہبی کتابوں سے وہ مواد نکال کر اکٹھا کر دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان پر پھینکا ہوا برسات کی اور مستقبل میں انہیں ایک بڑی ہولناک سزا کا سامنا کرنے کی پیشین گوئی کی ہے۔

کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حوالی نے یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں، عہد نامہ قدیم اور

حاصل کرنے کا پروگرام بنایا۔

مکتی باہنی اور عوامی لیگ نے غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع کر رکھا تھا۔ اپریل کے آغاز میں فوج اُس علاقے میں آگئی، جب اسے اُس قلم کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے بھی ۸۰ افراد کو بغیر کسی قسم کا عذر سنے گولی مار دی۔ پاکستان کے بعض حامی بھی مارے گئے۔ ۲۳ مئی ۱۹۷۱ء کو 'البدڑ' وجود میں آئی اس کے ممبر البدر کیڈٹ کہلاتے تھے 'البدڑ' کا نام سننے ہی دشمن پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا۔ پاکستانی فوجیں ڈھاکہ میں بسنے لگیں، فوج کے جانی تحفظ کی پوری کوشش کی جارہی تھی۔ ۱۶ دسمبر کی صبح تک کچھ بھارتی فوج ڈھاکہ کے گرد و نواح میں پہنچ چکی تھی اور آخر ملک کا آدھا حصہ جدا ہو گیا۔ ابوالکلام نے ۱۹ ماہ کا عرصہ سنٹرل جیل میں گزارا۔

آخر نومبر ۷۳ء میں ریڈ کراس کے نمائندوں نے پاکستان جانے والوں کی فہرست میں اس کا نام بھی درج کر لیا۔ ۲۴ اپریل ۷۴ء میں ان کی روانگی قرار پائی۔

ڈھاکہ کی پیاری سرزمین الوداع

ابوالکلام سب سے الگ تھلگ گہری سوچوں میں گم تھا۔ ابوالکلام مضطرب ہو گیا اور بار بار پہلو بدلنے لگا، سنہرے بنگال کی یادیں اس کے ذہن کے درپچوں سے جھانک رہی تھیں۔

وہ بے چینی کے عالم میں اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہاتھوں کی مضطرب حرکتیں، وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہہ رہا تھا: "میں ضرور واپس آؤں گا۔ اپنی قوم کی آزادی کے لیے..... اسلام کی سر بلندی کے لیے..... سو نار بنگلہ! اگر خدا نے چاہا تو میں ضرور آؤں گا..... اسلام کا پرچم ہلاتے ہوئے....."

طیارہ ایک گرگڑاہٹ کے ساتھ رن وے پر دوڑنے لگا۔ ابوالکلام نے جلدی سے ڈھاکہ کی سرزمین پر الوداعی نظر ڈالی اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں کے بعد طیارہ بنگال کی تنگ فضاؤں میں بلند ہو کر گھنے بادلوں میں روپوش ہو چکا تھا۔

چلائیں گے اور اسے اسلام کا قلعہ بنا کر چھوڑیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی حفاظت کی خاطر لڑنا عین جہاد اور اس کی آبرو پر جان دینا عین شہادت قرار پایا۔

انجی ایک نسل بوڑھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس امانت پر ڈاکہ بڑا اور ہم اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے۔ امانت کے چھن جانے کے بعد ہم نے اپنے روٹھے ہوئے ان بھائیوں کو فراموش کر ڈالا، جنہوں نے کبھی مسلم لیگ کی بنیاد رکھ کر پاکستان کی تعمیر میں اپنا خون دیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی جتنی مسجد، دینی درس گاہیں اور اسلام کا درد رکھنے والے افراد مشرقی بنگال میں پائے جاتے ہیں، دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ملتے۔ پاکستان کے ساتھ بھی ان کی ہمدردیاں بدستور برقرار ہیں۔

اس کتاب میں بنگلہ دیش کے بحران کے دوران قربان ہونے والے سرفروش کی خوشنکاح داستان رقم کی گئی ہے اور اس بے رحم سیاست کی حقیقی تصویر کھینچی گئی ہے جس نے پاکستان کو دو ٹکڑے کر ڈالا۔ کتاب کے تمام کردار حقیقی ہیں۔ اس کے مرکزی کردار ابوالکلام پاکستان میں زندہ وسلامت موجود ہیں۔

ابوالکلام اپنے اٹھ بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ابوالکلام کے والد بدیع الزماں علاقہ کے بڑے بااثر زمیندار تھے، سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ تحریک اسلامی کے ساتھ انھیں دلی لگاؤ تھا۔ کالج گیا تو شنکھو کے چند سرگرم کارکنوں سے اس کا تعارف ہو گیا اور اس نے بھی اسی روز شنکھو کا سپورٹر فارم پر کر دیا۔ ابوالکلام نے ۲۵ مارچ ۷۱ء کو مارشل لا کے نفاذ کا اعلان سنا تو اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

ابوالکلام نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا کہ ہمیں ٹریننگ حاصل کر کے پاکستان آرمی کی مدد کرنا چاہیے۔ پاک فوج کے لیے اپنے محدود وسائل اور بے پناہ رکاوٹوں کے سبب دور دراز علاقوں میں پہنچنا مشکل تھا۔ لہذا ان سے مدد ملنے کے امکانات معدوم تھے۔ منصوبہ کے مطابق ابوالکلام نے اپنے ساتھیوں سمیت مکتی باہنی کے رضا کاروں کے ساتھ عوامی لیگ سے ٹریننگ

من گھڑت فخر و مباہات وغیرہ کے معاملات میں جگہ جگہ متعلقہ اہم آیات پیش کی ہیں جن کے باعث حقیقت حال کی ایک بہت صحیح تصویر قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔

ملنے کا پتہ: توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل، بالقابل کالج برائے خواتین-اردو بازار، کراچی

فون: 0321-8762213

قیمت: ۲۲۵ روپے

☆☆

پاکیزہ زندگی

عبدالستار عاصم نے ایک انتہائی اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق صفائی نصف ایمان ہے۔ جب ایک چیز کی اتنی اہمیت ہے تو اس کے بارے میں ہر مسلمان کو مکمل علم ہونا چاہیے کہ اسلام کی منشا کیا ہے؟ اسلام ایک مسلمان سے کیا چاہتا ہے؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم لوگ صفائی کے آداب سے ناواقف ہیں اور نہ ہی واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ علامہ صاحب نے اس کتاب میں تمام ضروری مسائل جمع کر دیے ہیں۔



عبد الستار عاصم

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں: زیر نظر کتاب ”پاکیزہ زندگی“ کے مصنف عزیز عبدالستار عاصم نے پاکیزہ زندگی گزارنے کے لیے احادیث اور جدید علوم کے مشوروں کو یکجا کر کے عظیم کام انجام دیا ہے جس کی عصر حاضر میں شدید ضرورت تھی کیونکہ بعض مسلمان پاکیزگی کو بھول کر صفائی کے چکر میں پڑ گئے ہیں لیکن اسلام اپنے ماننے والوں سے پاکیزگی کا تقاضہ کرتا ہے نہ کہ صرف صفائی کا۔ مصنف نے یہ کتاب ترتیب دے کر اسلام کے اسی پاکیزگی کے حکم کی تعمیل کروانے کی کوشش کی ہے۔

ناشر: مقبول اکیڈمی، چوک اردو بازار، سرکلر روڈ، لاہور فون نمبر: 042-37324164

☆☆

رسول اللہ ﷺ کے دو ہزار معجزات

ڈاکٹر محمد اختر نواز خان قادری کی یہ تصنیف ۱۹۷۶ء صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے دو ہزار معجزات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ معجزہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جو لفظ عجز سے بنا ہے



اس کا مطلب ہے عاجز کرنا یعنی ایسا فعل جس کو عام مخلوق سمجھنے سے عاجز ہو۔ معجزہ کی تعریف علمائے اسلام نے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ معجزہ ایسے عظیم الشان واقعہ یا خرقہ است و واقعہ کو کہا جاتا ہے جس کا وقوع پذیر ہونا عام حالات میں ممکن نہیں ہوتا اور یہ فقط قدرت خداوندی کا کرشمہ ہوتا ہے۔

ناشر: ٹریبل ہاؤس آف پبلی کیشنز اقبال مارکیٹ، ہلال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔

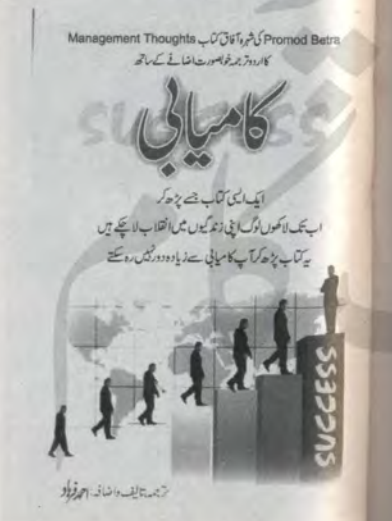
فون نمبر: 051-5551519

قیمت: ۸۰۰ روپے

☆☆

کامیابی

Promod Beta کی شہرہ آفاق کتاب Management Thoughts کا یہ اردو ترجمہ امر فریاد نے کیا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھ کر لوگوں اپنی زندگیوں میں انقلاب لائیں گے۔ احمد فریاد بیباچے میں لکھتے ہیں: یہ کتاب ہر اس شخص



Management Thoughts کی شہرہ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ احمد فریاد بیباچے نے کیا ہے

کامیابی

ایک ایسی کتاب جسے ہر فرد ایک نیک آدمی لوگ اپنی زندگیوں میں انقلاب لائیں گے یہ کتاب پڑھ کر کامیابی سے نوازاؤ اور نیک رہ سکتے



ترجمہ: تالیف و اضافہ: احمد فریاد

کے لیے ہے جس کی زندگی میں مقاصد اور کامیابی کی کوئی اہمیت ہے۔ جو لوگوں کے اس نجوم میں خود کو مغرور اور ممتاز حیثیت میں دیکھنے کا خواہاں ہے اور جو اپنے میدان میں ایک بے مثل تاریخ رقم کرنے کا جنوں رکھتا ہے۔

کامیابی کیا ہے؟ اس کے کیا تقاضے ہیں؟ اسے کیسے پایا جاسکتا ہے؟ اور اسے حاصل کرنے والے کون ہیں؟ یہ کتاب انہی باتوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس کتاب کا اسلوب قاری کو تھکا کاٹ اور بوریت سے دو چار نہیں کرتا۔ ناشر: ٹریبل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔

فون: 051-5551519

قیمت: ۳۰۰ روپے

☆☆

امریکا: جیسے میں نے دیکھا

فقیر اللہ خاں لاہور میں پیدا ہوئے۔ نیلی کالج آف کامرس، لاہور سے ایم کام کرنے کے بعد پی آئی اے کے فنانس کے شعبہ سے وابستہ ہو گئے، ریٹائرمنٹ کے بعد امریکہ کا رخصت سفر باندھا۔ وہاں مجموعی طور پر ۱۰ سال مختلف شہروں میں قیام رہا۔ یوں امریکہ کے مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک گھومنے کا موقع ملا۔ خاں صاحب نے اس کتاب میں واشنگٹن ڈی سی، نیویارک، لاس اینجلس، شکاگو، ایکساس، سان فرانسسکو، جزائر ہوائی، فلوریڈا، الاسکا اور اٹلانٹا کی دلچسپ اور معلوماتی باتوں کے علاوہ وہاں کا جغرافیہ اور تاریخ بیان کی ہے۔

کتاب اپنے دامن میں معلومات کا ایک بہت بڑا خزانہ چھپائے ہوئے ہے، یہاں کچھ مثالیں درج کرنے کو دل کرتا تھا لیکن صفحات کی کمی آڑے آ رہی ہے۔ ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں مثلاً نیویارک شہر کی بات ہو رہی ہے وہاں آپ اقوام متحدہ کے بارے میں مکمل تفصیلات پائیں گے، نیویارک سے نکلنے والے اخبارات میں سب سے اہم نیویارک ٹائمز ہے اُس کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ

امریکہ

جیسے میں نے دیکھا

(سیاحت نامہ)



فتیہ اللہ خاں

نیویارک ٹائمز ایک امریکی روزنامہ ہے جو ۱۸ ستمبر ۱۸۵۱ء سے مسلسل باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اس اخبار کے ملازمین کی تعداد ۱۱۵۰ ہے اور اس کے رپورٹر اور نمائندے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس اخبار کا ہیڈ کوارٹر نیویارک شہر کے ڈاؤن ٹاؤن مین ہٹن میں واقع ہے۔ اس اخبار کی روزانہ اشاعت کی تعداد ۶۷۶۳۸ ہے اور سنڈے ایڈیشن کی تعداد ۱۳،۵۲،۳۵۸ ہے۔ آغاز میں اس کی قیمت صرف ایک سینٹ رکھی گئی اور اب زمانے کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت ڈیڑھ ڈالر جب کہ سنڈے ایڈیشن کی قیمت ۵ ڈالر ہے، جو کہ ضخامت میں کافی بڑا ہوتا ہے۔ اس وقت یہ اخبار پورے امریکا میں اشاعت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر ہے کیونکہ سب سے پہلے نمبر پر وال سٹریٹ جرنل اور دوسرے نمبر پر یو ایس اے ٹو ڈے ہے۔

ناشر: مثال پبلشرز، رحیم سینئر

پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

فون: 2615359

قیمت: ۳۰۰ روپے

مختلف

فریدہ خانم کے پہلے شعری مجموعے کا آغاز ہوتا ہے 'مختلف بات' سے لکھتی ہیں "میں فریدہ خانم ہوں، لاہور میں پیدا ہوئی، میرا کوئی خاندانی ادبی حوالہ نہیں ہے، اس لیے یہ صلاحیت مجھے وراثت میں نہیں ملی، بلکہ خالہ تہا رب تعالیٰ کا کرم ہے، جس نے مجھے یہ شعور بخشا اور اس قابل کیا کہ میں لکھ سکوں"

ایک غزل کے چند اشعار:

تارے گننے کے زمانے اب کہاں؟
عاشقی کے وہ ترانے اب کہاں؟
کون مرتا ہے کسی کے واسطے
لیلیٰ مجنوں کے فسانے اب کہاں؟
وہ نہ دریا اور نہ گہری چائتیں
سوہنی اور مابی دوانے اب کہاں؟
کون چیرے گا پہاڑوں کے جگر؟
تیشہ فرہاد جانے اب کہاں؟
آنکھوں آنکھوں میں جو ہوتے تھے کبھی
ہیر رانجھے کے نشانے اب کہاں؟



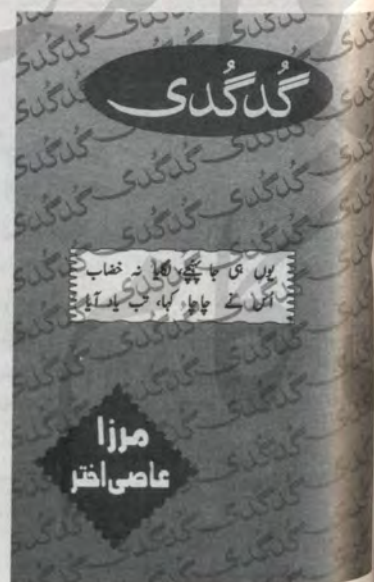
سامنے آجائے یوسف اور بس
وہ زلیخا کے بہانے اب کہاں؟
جاؤ جاؤ عاشق خانم کہ وہ
بھولے پن کے سب زمانے اب کہاں
ناشر: مکتبہ روشن خیال، ۱۷ اے، سٹریٹ 6

کوچہ محمدی، سلطان پورہ، لاہور
قیمت ۲۷۰ روپے

☆☆

گدگدی

مرزا عاصی اختر کی کتاب 'گدگدی'، یہ مزاحیہ شاعری کی ن کی دوسری کتاب ہے۔ امجد اسلام امجد مرزا صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں، "آج کل طنز و مزاح کے حوالے سے کی گئی شاعری مقبول تو بہت ہو رہی ہے، لیکن اس میدان کے نوواردان شوق میں بہت کم نام ایسے ہیں، جن کے کلام کو معیاری کہا جاسکتا ہے۔ ایسا ہی ایک نام مرزا



عاصی اختر کا بھی ہے، جن کے موضوعات تو کم و بیش روایتی ہی ہیں، لیکن اُن کے انداز بیان کی کشمکش اور الفاظ کا موزوں چناؤ ایسا ہے کہ نہ صرف قاری کے چہرے پر مسکراہٹ کو برقرار رکھتا ہے، بلکہ کوئی بات اُس کے ذوقی سلیم پر بھی گراں نہیں گزرتی۔" دو دلچسپ قطعات:

دل کیا چڑایا، پھر تو انھیں سی پیڑ گئی
میں ہوں لحد میں پروبی عادت ہے یار کی
آئے جو فاتحہ کو تو ریڑھا بھی ساتھ تھا
ایشیئیں چرا کے لے گئے میرے مزار کی

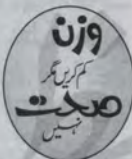
پروفیسر

دیکھو وہ کھوئے کھوئے سے جو سب سے الگ آتے ہیں نظر دیتے ہیں درس فلسفہ، یہ ہیں قابلِ قدر پروفیسر کل رات سہاگ کی تھی لیکن تجلے میں گئے تو چیخ اُٹھے تم کون ہو کمرے میں میرے کیوں بیٹھی ہوئی ہو بن ٹھن کر ملنے کا پتا: فضلی بک، سپر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی قیمت: ۱۶۰ روپے

صبح ضرور ہوگی

کتاب کی مصنفہ شاہین فردوس دیباچہ میں لکھتی ہیں "اس کتاب میں معاشرتی برائیوں کے اختصار اور اصلاح معاشرہ کے لیے قرآن و سنت کی راہنمائی لے کر ایسی قابلِ عمل تدابیر پیش کی ہیں، جس پر عمل پیرا ہو کر معاشرہ ان ناہمواریوں، کوتاہیوں اور بے اعتدالیوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔"

کتاب کا تعارف الطاف حسن قریشی صاحب نے تحریر کیا ہے۔ ایک متوسط گھر آنے کی تعلیم یافتہ اور دردمند خاتون محترمہ شاہین فردوس کی تصنیف "صبح ضرور ہوگی" اپنے دامن میں اصلاح معاشرہ کا ایک بیش بہا خزینہ رکھتی ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور قرآن و حدیث کی لافانی تعلیمات سے جو کچھ اخذ کیا ہے، اسے لوگوں کی معاشرتی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں طمانیت



اس طرف توجہ نہیں ہوگی تو صحت مستقل خراب رہے گی

جذباتی کھانے

کے طلسم کو کیسے توڑا جائے؟

نوشین ناز
ماہر غذا ایماٹ/ نیوٹریشنسٹ
0301-4585405



اب کھانے پینے کی چیزیں بیچنے کے لیے ان کے
”جذباتی اثرات“ کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے

کمفرٹ فوڈ کسی طور صحت بخش نہیں یہ جسم میں بڑی مقدار
میں چربی بنانے کا باعث بن رہے ہیں

چیس کا مطلب ہے ایکسٹ منٹ۔
کمپلن سے مراد ہے طاقت۔

نوذلڑ سے مراد ہے آسانی اور مزہ لیکن اگر زیادہ کھانا
آپ کا جذباتی مسئلہ بن جائے یعنی آپ اپنے جذبات و
احساسات کی کیفیت پر پردہ ڈالیں، انھیں ٹھنڈا کرنے یا
بھلانے کے لیے بہت زیادہ کھانے لگیں تو پھر بسیار خوری
کا ایک ختم نہ ہونے والا (Vicious circle) چل پڑتا
ہے۔ جس کے نتیجے میں آپ کا وزن بڑھنے کا باعث بنتا
ہے اور ان بیماریوں کا باعث ہوتا ہے جو جسم میں زیادہ
مقدار میں چربی پیدا ہونے سے لائق ہوتی ہیں۔

کمفرٹ فوڈ (چسکے والے کھانے) صحت بخش
کھانوں کی جگہ لے رہے ہیں یعنی سکون دینے والے
کھانے مثلاً آئس کریم، چیس، چاکلیٹ اور کیک وغیرہ
اگر خواتین کی صحت بخش غذاؤں کی جگہ لے لیں تو وہ جسم
میں توانائی پیدا کرنے اور بیماریوں کی روک تھام اور
ہڈیوں کو مضبوط بنانے والے ضروری غذائی اجزاء سے محروم
رہ جاتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ آپ کے اندر کوئی

سے آرام ملتا ہے۔ جب
آپ بیمار ہوتے ہیں تو
چکن سوپ کا بڑا پیالہ، کسی
جذباتی مسئلے سے دو چار
ہوتے ہیں تو آئس کریم کا ایک بڑا کپ آرام دیتا ہے۔
بچپن میں جب آپ سانگیں چلاتے ہوئے گر جاتے ہیں تو
مٹی بڑے پیار سے آپ کو کیک یا بسکٹ پیش کرتی ہیں۔
تمام افراد کے بچپن، تمام تہذیبوں اور زندگی کے ہر شعبے
میں ”کھانے سے آرام دینے کی صلاحیت“ مسلمہ تسلیم کی
جاتی ہے اور سائنسدان بھی اس کو مانتے ہیں۔

”آج کل کھانے پینے کی چیزوں کو بیچنے کے لیے ان
کے جذباتی اثرات سے بڑی مددنی جاری ہے۔

چاکلیٹ کا مطلب ہے پیار۔
کوکیز کا مطلب ہے خوشی اور کینیڈی بار کا مطلب

ہے لطف اندوزی۔
اس لیے آپ نے اکثر سنا ہوگا ”فن سائز کینیڈی
بار“ وغیرہ وغیرہ۔

کھانے

اس کی جگہ ہنسائی ہوتی اور اس کی فتوحات، تمغعات اس
سے واپس چھین لیے جاتے.....؟؟
یقیناً اس کا جواب نہیں میں ہے..... کیونکہ ہم قانون اور
انصاف سے نہیں شخصیات سے محبت کرنے والی قوم ہیں اور
محبت بھی شخصیت کی خوبیوں، سچ اور حق کی بنیاد پر نہیں، چھوٹے
چھوٹے ذاتی، گروہی ادارہ جاتی مفاد کی خاطر کرتے ہیں۔ ورنہ
دنیا بھر میں کسی کی کسی بھی شعبے میں چاہے وہ سیاست ہو، فوج
ہو، عدلیہ ہو، صحافت ہو، یا اور کوئی سماجی شعبہ ہو کسی بھی شعبے میں
چاہے کتنی ہی خدمات کیوں نہ ہوں لیکن اگر وہ غلطی کرتا ہے تو
اپنے کیے کی سزا بھگتتا ہے اور کوئی ادارہ یا فرد، انفرادی یا اجتماعی
طور پر جرم ثابت ہوئیوں کے حق میں نہ کوئی آواز بلند کرتا ہے
نہ احتجاج کرتا ہے نہ حمایت..... نہ مجرم کے حق میں جلوس نکالتا
ہے نہ جلے کرتا ہے..... اسلامی فلسفہ بھی یہی ہے تب ہی تو
میرے آقا سرکار دو عالمؐ نے فرمایا تھا.....
”خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو
اس کا بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا.....“

دنیا لائس آرم سٹراٹک سے اس کے سارے ”تمغے“ واپس
لے سکتی ہے تو کیا ہم اپنے قومی مجرموں چاہے وہ سیاستدان
ہوں، نظریہ ضرورت والے جج ہوں، بیوروکریٹ ہوں، فوجی
ہوں یا صحافی یا دوسرے شعبوں کے قومی مجرمان ان سے ان
کے ”تمغعات“، ”خطابات“ واپس نہیں لے سکتے.....؟؟؟ ان کو
واپس لینے کے لیے قانون سازی نہیں کر سکتے.....؟؟؟ ان کی
تصاویر ان تمام معتبر اداروں کی دیواروں سے ہٹا نہیں سکتے
جہاں آج بھی وہ ہمارا منہ چڑا رہی ہوتی ہیں..... اگر ہم یہ نہیں
کر سکتے تو کم سے کم ان کی تصویروں کے نیچے ”قومی مجرم“ یا
”سزایافتہ“ تو لکھ ہی سکتے ہیں..... لیکن نہیں..... ہم ایسا بھی
نہیں کریں گے کیونکہ ہم نے بحیثیت قوم ہمیشہ جرم ثابت
ہونے کے باوجود ہر شعبے کے ہر طرح کے مجرموں کو بچانے کی
کوشش کی..... انہیں سزا نہیں دی..... ان کا سماجی بائیکاٹ نہیں
کیا..... انہیں مطعون نہیں کیا.....

جرم پر جن کے ہاتھ کاٹنے چاہیے تھے نہیں کاٹے
اسی لیے آج ہماری گردنیں کٹ رہی ہیں۔ (بکریاتی بات)

سٹراٹک نہ صرف کھیلوں کی دنیا میں بلکہ پورے امریکا اور
پوری دنیا میں اپنے مداحین کی نظر میں ہیرو سے ”زیر“ ہو گیا۔
حالانکہ آرم سٹراٹک امریکی تھا۔ امریکا کا فخر تھا مگر امریکی استثنی
ڈوپنگ ایجنسی نے ہی اس کا جرم پکڑا اور اسے مجرم ثابت کیا۔
امریکا میں اس پر تمام سائنٹفک کے مقابلوں پر لائف
ٹائم بین لگادیا گیا اور ۱۹۹۸ء کے بعد اس کے تمام جیتے گئے
ٹائٹلز یہاں تک کر ان کی رقم الغامی بھی واپس وصول کرنے کا
اعلان کیا گیا۔ امریکی ایجنسی نے اپنے ہی ملک کے ایک ہیرو
کو ”سیریل چیر“ یعنی ”سیریل دغا باز“ کا خطاب دیا۔ جس
کے بعد بین الاقوامی سائنٹفک کی یونین نے بھی امریکی
ایجنسی کے فیصلے کی تائید کی اور ٹورڈی فرانس کے جیتے ہوئے
سارے یعنی ساتوں کے ساتوں ٹائٹلز بھی اس سے واپس لے
لیے گئے۔ ۱۹۹۸ء سے لے کر ۲۰۱۲ء تک لائس آرم سٹراٹک کی
کینسر فاؤنڈیشن نے ہزاروں لوگوں کو فائدہ پہنچایا تھا اور آرم
سٹراٹک نے اس کیلئے لاکھوں ڈالرز کی فنڈ ریزنگ کی تھی مگر
لائس آرم سٹراٹک کو اپنے ہی بنائے ہوئے ادارے کی سربراہی
سے بھی استعفا دینا پڑا کیونکہ آرم سٹراٹک کے مجرم ثابت
ہونے کے بعد اس ادارے کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔
کیونکہ مہذب دنیا میں انسان کا اعتبار گویا تو سب کچھ گیا۔ کل کا
ہیرو، تاریخی فتوحات والا کھلاڑی کینسر فاؤنڈیشن چلانے والا
عظیم سماجی کارکن آج کا زیرو ہو چکا ہے۔

ذرا غور کیجیے اگر اتنا کامیاب شخص، عظیم سپورٹس مین جو
اپنی قوم کیلئے بے شمار فتوحات حاصل کرے۔ جس کی مقدس
ہتھیوں کی طرح پوجا کی جاتی ہو جس کے سماجی کاموں کی
وجہ سے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو فائدہ پہنچا ہو اگر وہ ہمارے
معاشرے میں پیدا ہوتا تو کیا ہمارے معاشرے، ہمارے
اداروں کی اتنی جرات ہوتی کہ ہم اس کے کسی جرم پر یا غیر
قانونی حرکت پر اسے اس طرح ”ذلیل“ کرتے (یہ مجرم کو
ذلیل کرنا بھی ہمارے ہاں کے محاورے ہیں ورنہ مجرم کے
جرم کو سامنے لانا حقیقت سے پردہ اٹھانا ہوتا ہے اسے ذلیل
کرنا نہیں۔ دنیا بھر میں اسے ذلالت نہیں حقیقت کا نام دیا
جاتا ہے۔) اس کے جرم کو یوں سامنے لاتے کہ دنیا بھر میں

ایسی شے ہے جسے آپ نظر انداز کر رہی ہیں۔

”جذباتی کھانا“ کب مسئلہ بنتا ہے؟ جب کھانا صحت کا متبادل یا خود کو ”بے ہوش“ کرنے والی دوا بن جاتی ہے۔ جب زیادہ کھانے کی مدد سے آپ دراصل غیر ارادی طور پر اپنی اندرونی کیفیات مثلاً غصہ، ڈپریشن، ذہنی دباؤ، تنہائی اور بوریٹ کو بھگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کے جذبات آپ کے کھانے پینے میں اہم عوامل کا کردار ادا کرتے ہیں۔

اس لیے ہمیں اپنے وزن میں کمی اور پھر اس کی کو برقرار رکھنے کے لیے ان جذباتی عوامل کی جانب توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے جو اس بسیار خوری کی وجہ بن رہے ہوتے ہیں۔

انس کریم، کیک اور کینڈیز وغیرہ جیسی غذائیں کاربوہائیڈریٹس یعنی نشاستے سے بھر پور ہوتی ہیں اور ہمارے دماغ کے اچھا محسوس کرنے میں کردار ادا کرنے والے کیمیائی مادے ”سیروٹون“ کی سطح کو بلند کرتی ہیں اور ان کو کھانے سے خواتین عارضی طور پر اچھا محسوس کرتی ہیں۔ خواتین کی ماہواری کے چکر کے دوسرے نصف اور بیضے کے اخراج (Ovulation) کے بعد کاربوہائیڈریٹس کا یہ کردار بہت طاقتور ہوتا ہے۔ اس موقع پر پروجیسٹرون کی سطح بہت بلند ہوتی ہے جس کے نتیجے میں بلڈ شوگر میں کمی اور کھانے کی شدید طلب ہوتی ہے۔

طلمس کو توڑیں، اپنی ”جذباتی خوراک“

کی ڈائری بنائیں

سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ان حالات اور عوامل سے غمیوں جو آپ کو زیادہ کھانے پینے اور بسیار خوری کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اس طلمس کو توڑنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کھانے کے بجائے براہ راست اپنی جذباتی ضروریات کو پورا کریں۔ اس اہم مسئلے کی طرف توجہ نہیں دیں گے تو صحت کی

مستقل خرابی کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ آپ کے دوست احباب اور پورا ماحول اس حوالے سے معاون نہیں بنتا بلکہ مستقل آزمائش کی وجہ بنتا ہے۔ مگنی، شادی کی خوشی ہو تو مٹھائی، ساگرہ کی آمد ہو تو کیک، ترقی و تبادلوں ہوا تو شاندار ڈرنک یا لچ، گیٹ نو گیدر ہو تو ہائی ٹی حد تو یہ ہے کہ موت کا بھی موقع ہو تو مرغن کھانے مطلوب و مقصود ہوتے ہیں۔ یہ سارے مواقع پر کھانے پینے کی ان گنت نعمتوں کا سامنا پڑتا ہے۔ ابھی کبھی نہ کھائیں تو میزبان کی نافرمانی کا الگ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مروت سے مجبور ہو کر شام کو اپنا وزن بڑھانے کا پورا اہتمام و انتظام کیے آپ واپس گھر آکر سو جاتے ہیں۔ اب وزن نہ بڑھے اور صحت خراب نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہوتا یہ پتھر پہ لکیر والا محاورہ اس موقع کے لیے تھا تو نہیں مگر اب آپ نے خود ہی خرابی صحت کے حوالے سے پتھر پر لکیر کو یقینی بنالیا۔

اب آتے ہیں اس ماہ کے خطوط،

سوالات اور جوابات کی طرف

س: میری عمر ۲۱ سال ہے میرا وزن ۵۰ کلو قد ۵ فٹ ۶ انچ ہے۔ میرا آئیڈیل وزن کتنا ہونا چاہیے؟ (فیضان احمد - کراچی)

ج: آپ کو ضرورت ہے ۶۰ کلو مزید بڑھانے کی۔ اپنے آئیڈیل وزن کو پانے کے لیے آپ متوازن غذا کا استعمال کریں۔ اپنی زندگی میں ورزش کو شامل کریں۔ Junk Food اور Fizzy drinks بند کر دیں۔ یہ جسم میں سے کیمیشم کم کرنے کا باعث بنتے اور ہڈیوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔ ایسے کھانے کا استعمال کریں جو آئرن اور کیمیشم میں زیادہ ہوں۔ Weight lifting کی ورزشیں آپ کے لیے بہت اچھی ہیں۔ آپ Lean protein کا استعمال رکھیں جو مسل بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ اسے دن کا آغاز Heavy Breakfast سے کریں اور کم از کم ۳ سے ۴ اور کھانے ضرور کھائیں اور پانی کا استعمال کھائیں۔

س: میری عمر ۱۴ سال ہے اور وزن ۶۰ کلو ہے اور قد ۵ فٹ ۱۳ انچ ہے۔ میں قد کیسے بڑھا سکتی ہوں اور وزن کیسے کم کروں؟ (شاربہ رابعہ)

ج: آپ کو اپنا وزن ۱۰ کلو کم کرنا پڑے گا۔ اپنا آئیڈیل وزن حاصل کرنے کے لیے آپ کی عمر میں وزن عموماً بڑھ جاتا ہے۔ اس کی وجہ کھانے کی بری عادات اور Harmonal Imbalance ہوتے ہیں۔ آپ اپنے Harmonal test بھی کرائیں۔ بازاری کھانے بند کر دیں، مگر کا بنا کھانا کھائیں۔ بہت زیادہ چاکلیٹ، کولڈ ڈرنک، پیزا، برگروں فرائیڈ آئٹم سوائے وزن بڑھانے کے کچھ نہیں کرتے۔ ہائیٹ بڑھانے کے لیے آپ گیمز کریں Hanging exercise کریں۔

تیراکی بہت بہترین ورزش ہے قد کے لیے۔ اس کے علاوہ ۳ گلاس دودھ بنا پکٹانی کے استعمال کریں۔

س: میری عمر ۳۵ سال ہے میرا وزن ۹۰ کلو ہے۔ قد ۵ فٹ ۴ انچ ہے۔ میں Hypothyroidism کی مریضہ ہوں اور مجھے پیڈریٹ بھی مند ہو گئے ہیں۔ میرے لیے Diet plan تجویز کریں۔ (طیبہ جواد - کھاریاں)

ج: آپ کا وزن کم کرنے کا ٹارگٹ ۲۰ کلو ہے۔ آپ وزن Gain کریں گی جیسے کہ آپ Menopause پہنچ چکی ہیں۔ آپ ۶۰ کلو پر پہنچنے کا ٹارگٹ بنائیں۔ آپ اپنی غذا پر کنٹرول کریں ساتھ ساتھ ورزش کو بھی اپنائیں۔ اچھی صحت کے لیے کچھ Permanent تبدیلیاں لائیں۔ اس عمر میں Metabolic rate کم ہو جاتی ہے۔ High intensity کی ورزش آپ کی مدد کر سکتی ہے۔

Sit up ۲۰ کے سیٹ تین دفعہ کریں۔ صبح، دوپہر، شام ۲۵، ۲۵ منٹ کی واک اور اس کے علاوہ Breathing exercise بھی بہت مدد کریں گی۔ سبز اور خنجر چائے دونوں استعمال کریں۔ ۳ سے ۵ بادام کا استعمال Snack ٹائم پر ضرور رکھیں۔ اپنا وٹامن ڈی اور کیمیشم کا کیول چیک کرائیں۔ کمی کی صورت میں اپنے

فریشن سے فوراً رابطہ کریں۔ آپ کی غذا میں کیمیشم کا استعمال کم از کم ۴ سے ۶ مرتبہ ضرور ہو۔ اپنے آپ کو Hydrate رکھیں، پانی کا استعمال کریں ہر کھانے سے پہلے ایک کپ ضرور استعمال کریں۔

س: میری عمر ۱۹ سال ہے میرا وزن ۶۷ کلو ہے اور قد ۵ فٹ ۶ انچ ہے۔ پلیز باجی! مجھے وزن کم کرنے کے لیے Diet Plan دیں ورنہ میں ڈپریشن سے مر جاؤں گی۔ ج: چندا آپ کو کم از کم ۱۵ کلو وزن کم کرنا ہے۔ آپ کی عمر کم ہے آپ بہت آسانی اور جلدی وزن کم کر سکتی ہیں۔ آپ ورزش اور متوازن غذا سے جلد رزلٹ لے سکتی ہیں۔ آپ ریگولر برسک واک شروع کریں۔ آپ شوگر کے بجائے شہد کا استعمال کریں۔ فرائڈ آئٹم بند کریں۔ آپ اپنے مین میل (meal) میں Carbohydrate کے بجائے سلاڈا کا استعمال کریں۔ جب بھوک زیادہ لگے تو سٹیک ٹائم میں دہی کا استعمال کریں۔

آپ Clear سوپ لچ اور ڈرنک لے سکتی ہیں۔ ایک گلاس دودھ اور ۳ بادام ناشتے میں لے لیں۔ گوشت ہمیشہ سفید استعمال کریں جو کہ steam یا گرل ہو۔

س: میری عمر ۱۵ سال اور وزن ۳۸ کلو ہے اور قد ۵ فٹ ایک انچ ہے۔ میرا آئیڈیل وزن کتنا ہونا چاہیے۔ (مازہ کلثوم - میانوالی)

ج: آپ کا موجودہ وزن آپ کی عمر اور قد کے لحاظ سے بالکل Perfect ہے۔ آپ اپنے وزن کو برقرار رکھیں۔ اس کے لیے آپ آئرن اور وٹامن سی پر مشتمل غذا کا استعمال زیادہ رکھیں۔ آپ روزانہ جوس کا استعمال کر سکتی ہیں ساتھ میں وٹامن سی کا کوئی Supplement لیں یہ وزن کم کرے گا اور قبض بھی توڑے گا۔ اس کے علاوہ چیرے کا گلو بڑے گا۔ وٹامن سی آپ کے Immune سسٹم کو بہتر کرتا اور کینسر اور دل کے امراض سے بچاتا ہے۔

س: میری عمر ۱۴ سال ہے اور وزن ۶۸ کلو ہے۔ قد ۵ فٹ ایک انچ ہے۔ مجھے وزن کم کرنا ہے میری مدد کریں۔ (سدرہ البتی - آزاد شہر)

حمد حسان

قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سہا کالم



ادبی کانفرنس کا احوال اور رضیہ بٹ

”خوف کا تحفہ واپس کرنے کا خوف“ کہ یہ رب کے پسندیدہ بندوں کی صفت ہوتی ہے کہ محبت بھی ایسی ہی اور خوف بھی۔ بہت خوب عنوان کا حق ادا کر لیا اللہ نے آپ سے اور حقیقت یہ بھی کہ ”اردو ڈائجسٹ“ بلاشبہ ایک بڑا کام ہے۔ اللہ اس کو قبول کرے اور اس کو مزید با اثر بنائے۔

ادبی کانفرنس کا احوال مجھے بہت اچھا لگا۔ ایسی چیزیں برابر دیا کریں۔ دیکھیں ناں جو ناک شوز آتے ہیں ۱۲/ بجے تک مختلف چینلوں پر تو سوچتی ہوں کہ علم سے تو ہمارا ناطہ ٹوٹا ہی تھا اب ادب سے بھی ٹوٹ گیا۔ کیسی بے ادبی، بے لحاظی۔

الاماں والحفیظ.....!!!

اقبال سے مل کر بہت اچھا لگا کوئی بچ بچ اقبال سے مل بی لے تو اس کا اقبال بلند ہو سکتا ہے۔ ہاں میں اس بات سے متفق نہیں بھائی کہ بکری کا دودھ بی کر بھینسوں سے کیسے مقابلہ ہو سکتا ہے یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ ۱۲/ ۱۳ برس پہلے وہ بکریوں کا دودھ پینے والے ہی تو تھے جنہوں نے بھینسوں سے نہیں دنیا بھر کی NATO فورسز سے تنہا چلی پیٹ اور بوسیدہ لباسوں میں جنگیں لڑیں اور اندلس تک پہنچے اور مستشرقین آج بھی

وغیرہ کا مسئلہ تھا۔ نام لکھنے سے اس نے منع کیا تھا۔ آپ دوبارہ رابطہ کریں۔

میں نے اپنا فون نمبر 0301-4585405 صرف میسج کرنے کے لیے ہے۔ آپ اس پر صرف اپنا مسئلہ میسج کر دیں میں باری آنے پر جواب دوں گی۔ کوئی فوری مسئلہ ہو تو بے شک وقت ملے کر کے مجھے کلینک پر آ کر مل سکتے ہیں لیکن پلیز رات گئے تک فون کالز اور مس کالز کر کے تنگ نہ کریں۔ میں آپ سب کی مشکور رہوں گی۔ ان کالز سے کوفت ہوتی ہے۔

کچھ قارئین نے اپنے جسمانی اور جنسی مسائل بھیجے ہیں یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ کسی سائیکیاٹرسٹ سے رابطہ مفید رہے گا۔ یاد رکھیے اپنے ذاتی مسائل کو صرف متعلقہ ڈاکٹروں کے ساتھ شیئر کر کے مشورہ لینا چاہیے۔ غیر متعلقہ جگہ مشورہ کرنے والوں کے لیے آنکھوں کے ڈاکٹر کو ملنے کا اس لیے تجویز کیا جاتا ہے کہ آپ کیوں نہ دیکھ سکے کہ مشورہ اس سے لینے آئے جو اس شعبے کا ہی نہیں۔ اگر یہ شوقیہ ہے تو پھر اور بھی برا شوق ہے۔ اللہ رسول ﷺ نے جن باتوں کو حیا گناہ ہے۔ اس کا لحاظ کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں سب کو ہدایت دے۔ آئین عام طور پر ایسے مسائل جسم میں نہیں ذہن میں ہوتے ہیں۔ ذہن کو پاک صاف رکھنا آسان حل ہوتا ہے، نماز اور ورزش کے علاوہ اچھی صحبت، اچھا مطالعہ اور اللہ رسول سے محبت آپ کو اچھی زندگی گزارنے میں مدد دے گی۔ اللہ کا دیا پیٹرن آف لائف ہی سب سے عمدہ ہے۔ پاکیزہ اور بے حد صحت مند زندگی کو چچی پنسل کی طرح شارپ کر کے ختم نہ کریں بلکہ اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ کیونکہ اللہ جی نے ایک سوال یہ ضرور پوچھنا ہے، ”صحت، جوانی کہاں اور کیسے گزاری۔“

بہت ساری اچھی دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ مجھے میرے اہل خانہ اور بچوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں، شکریہ!

ج: آپ کا آئیڈیل وزن ۵۲ کلو ہے۔ آپ اپنا وزن ورزش اور متوازن غذا سے حاصل کر سکتی ہیں۔

آپ Canned اور Processed غذاؤں کا استعمال بند کر دیں۔ Hunger pangs میں کھیر یا سیب کا استعمال کریں۔ صبح اسکمڈ دودھ اور بادام لیں۔ دس بجے ایک گریپ فروٹ ۱۲ بجے گھر کا بنا سالن ۱۳ سپون، ایک چپاتی جو فور گرین ہو، سلاڈ ایک پلیٹ اور سبز چائے لیں۔ شام ۴ بجے کے قریب اسکمڈ دودھ لیں۔ ۶ بجے کے قریب سیب یا مٹھی بھر مونگ پھلی، رات کے کھانے میں اُبلّا ہوا انڈہ اور اسکمڈ دودھ لیں یا گھر کا ڈز ہلکا چھکا لے لیں۔ واک اور گیمز میں خود کو مصروف کریں۔ نماز باقاعدگی سے پڑھیں، رکوع اور سجدہ احتیاط سے کریں۔

مبارک ہو

ماہم۔ لاہور
آپ نے ۶ کلو وزن کم کیا۔ ۸۶ کلو سے ۸۰ پر آئیں۔
فواد اکبر۔ کراچی
۱۰/۸ سے آپ ۹۹ کلو پر آئے مبارک ہو۔ آپ کا ڈز تبدیل ہو گا کر لیں۔
عائشہ بیگ۔ آزاد کشمیر
۹۶/۹ سے ۸۹ کلو ہوا مبارک ہو۔
خدیجہ الیاس۔ گوجرانوالہ
آپ کو ۲۴ رسال کی عمر میں ۶ رسال بعد دوسری مرتبہ جی ریڈ شارٹ ہوئے اور نارمل سرکل شروع ہوئے تین ماہ ہو گئے۔ مبارک ہو۔ بتائے ہوئے ڈائنٹ پلان پر عمل جاری رکھیں۔

ایک درخواست

کشمیر سے ایک لڑکی کا پرس خط آیا تھا۔ میں نے اسے جوانی خط لکھا لیکن میرے پاس اس کا ایڈریس کم ہو گیا ہے۔ آپ لوگ برائے مہربانی ایسی صورت میں جوانی لفافہ ضرور ساتھ بھیجا کریں۔ اسے مسلسل بخار اور جی ریڈز

اپنے خوف یاد آگئے

یہ شمارہ گزشتہ شمارے سے بھی زیادہ خوبصورت لگا۔ بہت خوبصورت تحریریں ہیں۔ رضیہ بٹ کے بارے میں پڑھ کر گویا ان

سے ملاقات ہوئی۔ گاندھی جی کے بارے میں لکھی گئی تحریر تاریخ کے تاریک گوشوں سے پردہ اٹھا رہی تھی۔

آپ کو اور آپ کی ٹیم کو ڈھیروں شاباش کہ کہاں کہاں سے کیا کیا نکال لاتے ہیں۔ (دردل بہ دستک) بڑھ کر اپنے بھی خوف یاد آگئے۔ مزید ایک ”تحریر ایک مشاہدہ لکھا ہے جو بھیج رہی ہوں اس سے پچھلی تحریر مختصر مگر براثر“ کے اصول رکھی تھی۔ اگر تحریر بھی ان فٹ قرار پائی تو یقیناً مایوسی تو ہوئی مگر اصلاح کا موقع تو ملے گا۔ یہی سوچ کر دل کو تسلی دے لیں گے۔ (عشرت جہاں، ٹاؤن شپ لاہور)

ایسے ریکارڈ کا کیا فائدہ؟

یکم نومبر کو ہی اپنے پاس تازہ شمارہ دیکھ کر خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بہتر سے بہتر ہوتا ہوا یہ میگزین بھر پور اور سنجیدہ محنت کی بلوٹی تصویر ہے۔ کالم دردل پر دستک ایک بار پھر رضیہ بٹ کی سوانح آپ کی زبان پر پڑنے دروازہ کھلی چلی گئی۔ گریٹ کیم، رازق رازق اور دیگر.... سب اعلیٰ چمن خیال میں محترمہ بشری رحمن کا مرسلہ ایک خاصے کی چیزیں۔ واہ۔ ہمارے ہاتھ فیٹھوں میں بہت سے ریکارڈ بنے۔ چند ایک کے سوا باقی ہم سب دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ ریکارڈ ہمارے مسلمانوں کے شاہان شان ہیں؟ ورلڈ ریکارڈ کے لیے کاش ہم ادب، سائنس یعنی کیمسٹری، فزکس، بائیو میں بھی غیر مسلموں کو ٹھکٹے دے سکیں اور ان چھوٹے چھوٹے، بے تحش ورلڈ ریکارڈز سے ہم چھوٹا حاصل کر سکیں۔ میرے خیال میں تو بہت کچھ اس سے بھی زیادہ Productive ہو سکتا تھا۔ وقت کی قدر و قیمت کی اہمیت پر ہارون الرشید کے وقت کا یہ واقعہ بھی ہمارے لیے مشکل راہ ہے۔ ہارون الرشید کے دربار میں ایک دفعہ ایک شخص حاضر ہوا اور اپنا ایک کارنامہ دکھانے کی اجازت مانگی۔ اجازت ملنے پر اس نے زمین پر ایک سوئی گاڑی اور کئی فٹ دور جا کر ایک اور سوئی کا نشانہ لے کر تاک کر پھینکی کہ پہلی سوئی کے ناکے سے گزر گئی۔ پورے دربار میں واہ واہ کا شور مچ گیا۔ ہارون الرشید نے انعام کے طور پر اشرافیوں بھری تھیلی عطا کی اور ساتھ ہی پوچھا کہ یہ مہارت حاصل کرنے کے لیے کتنا وقت صرف کیا۔ اس شخص نے جواب دیا حضور! کوئی ایک برس اور کچھ دن کی مدت تو لگ گئی ہے۔ ہارون الرشید نے فوراً اسے جیل میں بھجوا دیا کہ اتنی مدت ایک لاکھ حاصل کام پر صرف کر دی اور اتنی مدت کے لیے جیل میں ڈالوا دیا۔ (چاوید احمد صدیقی، راولپنڈی)

درست تجزیہ

رازق رازق تو ہی رازق، حکیم کا ورد خدا برکت بھروسے کا مظہر ہے۔ حسین احمد شیرازی نے کرپشن پر تفصیل لکھا ہے جو بڑا صحیح تجزیہ ہے۔ (محمد صدیق، نارووال)

دل کی دنیا بدل گئی

اقبال تیرے عشق نے سب بدل دیے نکال
جسٹس ایم آر کیانی کا خطبہ تو واقعی فکر انگیز اور ڈائجسٹ کی جان تحریر ہے۔ رازق رازق نے خیالات کی دنیا بدل دی۔ واقعی یقین ہو تو تقدیر ہی بدل جائے۔

(محمد اویس دانش خاندانہ، نواب شاہ)

مصر کا ڈھائی سو سالہ دور

گزشتہ شمارہ میں ”سات عادات.....“ کے مصنف (اسٹیفن کووے) سے متعلق آپ کا مضمون بہت اچھا تھا۔ اس میں عہد قدیم کے حوالے سے حضرت یوسف کی مثال بقیہ آموز تھی۔ قرآن مجید کا طالب علم تو سینکڑوں کی حیات طیبہ کو مثال سمجھتے ہوئے مختلف عملی اسباق کشید کرنے سے مانوس ہوتا ہے۔ البتہ مغربی معاشرے میں جہاں بائبل اور اس کے حصوں کو بڑا اوقات اساطیر کہہ کر ان کی اہمیت کم کر دی جاتی ہے، کووے کی جانب سے یوں تذکرہ کرنا کچھ مختلف معلوم ہوا۔

اگرچہ آپ نے چوکے میں صرف عہد قدیم کا حوالہ دیا ہے مگر ہمارے ہاں قصہ یوسف مقبول ہے۔ اس لیے قرآن اور بائبل کے بیان میں ایک تاریخی فرق شاید دلچسپی کا باعث ہو۔ کووے نے بائبل کے مطابق حضرت یوسف کے دور میں شاہ مصر کو فرعون لکھا ہے (یا آپ نے یہ ترجمہ کیا ہے؟) جبکہ قرآن میں ہر جگہ اس کے لیے ”ملک“ (بادشاہ) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ (سورۃ یوسف ۴۳، ۵۰) جدید ماہرین مصریات (Egyptologists) مصری تاریخ کے ایک ڈھائی سو سالہ سنہرے دور کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ۱۷۲۰ء تا ۱۵۸۶ء ق م میں مصر پر چرواہا (Hyksos) خاندان برسر اقتدار تھا، جو حضرت اسماعیل کے خاندان سے تھے اور عرب سے مصر آئے تھے۔ یہاں کے مقامی فرعون کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تخت مصر پر قابض ہو گئے۔ چونکہ حضرت یوسف انہی بادشاہوں کے دور میں مصر لائے گئے تھے۔ قبلی مصری چرواہا بادشاہوں کے عہد کا تذکرہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ تو راقے کے اصل نسخے میں نامعلوم کیا

ایک امریکن کا ناٹالوجیا



صبح کے بونے دو بجے ہیں۔ ”سینڈی“ طوفان کی پھری ہوا میں تھم جانے کے بعد واشنگٹن کی فضاء اب قدرے پرسکون ہے۔ میں اپنے فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھی ہوں۔ میز پر بچا ہوا اٹاٹا کافی کا بڑا سا گم ہے اور ذہن دور بہت دور ان پگڈنڈیوں پر کا مزن ہے جن کا سرامشی سے جا ملتا ہے۔ شہر، جدہ..... عمر، لڑکپن کی..... دل پڑھائی سے زیادہ ادبی کتابوں اور رسالوں میں لگتا ہے اور کیوں نہ لگے؟ والدہ شاعرہ ہیں اور والد صاحب شاعر۔ اقبال (علامہ اقبال) کے قلیل اور نثر مسعود (مسعود مختار) کے قلیل ہیں۔ جدہ میں واقع ہمارا گھر گویا اردو ادب کا ایک ڈیرہ ہے، جہاں ہر ماہ شاعرہ ”فرض عین“ کی طرح ”ادب“ کیا جاتا ہے۔

ہمارے دوست احباب رات کو ٹی وی دیکھتے ہیں لیکن ہمارے گھر کی روایت مختلف ہے۔ یہاں رات کو سب کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ ہوتا ہے..... ہم ”پھول“ شوق سے پڑھتے ہیں۔ معیاری ہے اور معلوماتی بھی۔ جی چاہتا ہے کہ کہانیاں لکھیں۔ ایک کہانی لکھ کر ایڈیٹر بسیا کو بھیجی ہے۔ کہانی ”پھول“ میں چھپ جاتی ہے۔ اسکول میں استانیان خوش ہیں اور سماجی طالبات پر جوش۔ پھول سے محبت اور کہانیاں لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اچانک سڑک پر سانس آتی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آنکھوں میں پڑتی ہیں اور میں یک دم مامشی سے حال میں لوٹ آتی ہوں۔ Nostalgia بے سبب نہیں۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اختر عباس صاحب سے ٹی برسوں کے وقفے کے بعد لاہور بات ہوئی ہے۔ اتفاق دیکھئے، وجہ تسمیہ اس مرتبہ بھی ایک رسالہ ہے۔

ہم پردیس میں رہنے والوں کا حال بھی عجیب ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اپنے وطن کے رنگ ڈھونڈتے ہیں۔ جب کبھی دیسی سنور جانا ہوتا ہے تو پہلی نگاہ پاکستانی رسالوں پر پڑتی ہے۔ ”اردو ڈائجسٹ“ سے پرانی شناسائی کی وجہ سے میں سب سے پہلی پہلی رسالہ اٹھاتی ہوں۔ جو گزشتہ کچھ عرصے میں بدل گیا ہے۔ تحریروں کا انتخاب پہلے بھی عمدہ ہوتا تھا لیکن اب تو چھپنے والے اور منفرد مسلوں کے ساتھ ساتھ جدت نے اسے ایک بالکل نیا انداز عطا کیا ہے صرف ایک ہی جگہ ہے کہ اردو ڈائجسٹ یہاں واشنگٹن ڈی سی میں بہت دیر سے دستیاب ہوتا ہے۔ لیکن ایک اچھی تحریر ہے کہ رسالہ باقاعدگی سے ویب سائٹ پر شائع کیا جاتا ہے۔

جناب مدیر کے گفتگو میں رسالے کے مختلف پہلوؤں پر بات ہوئی۔ ہم نے انھیں ”اردو ڈائجسٹ“ کو عالمی معیار کا رسالہ بنانے پر مبارکباد پیش کی۔ جو انھوں نے خوش دلی سے وصول کی اور ساتھ ہی ہر ماہ رسالے کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش بھی کر ڈالی۔ اُن کا کہنا نا ناممکن نہیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی اپنی تحریریں بھیج کر لکھنے کے سلسلے کو وہاں سے شروع کروں گی جہاں سے ٹوٹا تھا۔ بے شک دن بھر وائس آف امریکا ریڈیو اور ٹی وی دونوں کے لیے بے طرح مصروفیت رہتی ہے۔ اردو ڈائجسٹ کی مزید ترقی کے لیے دعا گو۔

(مدیر انور، وائس آف امریکا۔ واشنگٹن ڈی سی)

لفظ ہوگا جس کا ترجمہ موجودہ نسخوں میں فرعون کیا گیا ہے جب کہ قرآن کا بیان تاریخی حقائق سے مطابقت رکھتا ہے۔

(تیہ سمیہ، خیابان سرسید راولپنڈی)

اردو ڈائجسٹ جوانی سے پڑھ رہا ہوں

میں ”اردو ڈائجسٹ“ جوانی سے پڑھ رہا ہوں۔ اُس وقت اردو ڈائجسٹ کی قیمت غالباً ڈیڑھ روپیہ تھی۔ الطاف حسن قریشی

صاحب ہر ماہ کسی اہم شخصیت کا انٹرویو کرتے تھے۔ اب میں عمر عزیز کے ۷۲ سال میں ہوں۔

اکتوبر ۲۰۱۲ء سے ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ ”ماہ رواں میں پیدا ہونے والی اہم شخصیات، اسے کرائی، مگر ماہ اکتوبر ۲۰۱۲ء میں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ حکیم محمد سعید صاحب شہید جو کہ ۱۷ اکتوبر کو شہید ہوئے تھے ان کا نام شامل نہیں ہے۔ میری

پوتی ”پوجھو جانو“ میں حصہ لیتی ہے۔ اکتوبر ۲۰۱۲ء کے ایک سوال میں حضرت حمزہؑ کو شہید کرنے والے کا نام پوچھا تھا جس کا جواب وحشی لکھا تھا مگر آپ نے وہ جواب تسلیم نہیں کیا۔ کیوں؟ (عقلم احمد خان۔ کراچی)

(وحشی غلام کامل نام ایہ تھا۔ وہی پوچھا گیا تھا)

سالانہ قیمت

مدیر اردو ڈائجسٹ نے فون کر کے اردو ڈائجسٹ کے بارے میں رائے معلوم کی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اختر عباس صاحب ہمیں فون کریں گے۔ جناب کے فون سے دل باغ باغ ہو گیا اور حوصلہ کافی بلند ہوا۔ ایک مدیر کا اپنے قاری کو فون کرنا حوصلہ افزائی کے لیے بہت کچھ ہے۔ جناب ایک سالانہ خریدار کے لیے موجودہ قیمت یعنی ۵۰ روپے ہی کافی ہے۔ اس سے زیادہ ایک متوسط آمدنی والے آدمی کے لیے مشکل ہوگا۔ کم از کم ایک، دو سال کے لیے تو یہی قیمت مناسب ہے۔ ”درد دل“ بہت دستانگ ہے۔ حد پسند ہے۔ خدا کرے کہ ہمارا معاشرہ اس سے سہرا جائے۔ ڈائجسٹ کے لیے میں بھی لکھنا چاہتا ہوں مگر حوصلہ نہیں ہو رہا۔ مہربانی کر کے کوئی مشورہ دیجیے۔ (رحمت اللہ بلوچ۔ فورٹ منرو)

(مشورہ یہ ہے کہ حوصلہ کیجیے)

تعلیم کے حوالے سے حکمرانوں کی بے بسی

تعلیم کے سلسلے میں حکمرانوں کی بے بسی اور مجرمانہ غفلت کی بالکل صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ لہذا پرائمری جماعت سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک معیار تعلیم اس قدر گر چکا ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ اس موقع پر مجھے برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ٹونی بلیر (Tony Blair) کا وہ تاریخی جملہ رہ کر یاد آتا ہے۔ جب اپنے عہدے کا حلف اٹھانے کے بعد اخباری نمائندوں نے ان سے پوچھا کہ بطور وزیر اعظم ان کی ترجیحات (Priorities) کیا ہوں گی تو انھوں نے کہا:

"My first priority will be education, my second priority will be education and my third priority will be education."
(میری پہلی ترجیح تعلیم، میری دوسری ترجیح تعلیم اور میری تیسری ترجیح تعلیم ہوگی)

ملک میں معیار تعلیم جس تیزی سے تنزلی کی طرف جا رہا

ہے اس سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی خاص منصوبے کے تحت قوم کو تعلیم سے بے بہرہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اسے کشتہ سلطانی و ملانی و بیری

(پروفیسر عطاء الحق بھٹانی)

ذہن ساز رسالہ

میرے پاس وہ الفاظ نہیں کہ میں تعریف کر سکوں کہ اردو ڈائجسٹ کس قدر اچھا رسالہ ہے۔ میں دسویں جماعت کی طالبہ ہوں اور گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری میں پڑھتی ہوں۔ میرے گاؤں کا نام کروٹ ہے۔

اردو ڈائجسٹ ساتویں میں میرے ایک ٹیچر نے مجھے پڑھنے کو دیا تھا۔ مجھے پڑھ کر بہت اچھا لگا اور پھر میں باقاعدگی سے پڑھتی آ رہی ہوں یہ واقعی ذہن ساز رسالہ ہے۔ اس سے پہلے میں ”ماہنامہ روشنی“ میں لکھ چکی ہوں اور اس میں بہت سی کہانیاں چھپی ہیں اور حال ہی میں مجھے روشنی کی طرف سے بیسٹ رائٹر کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ میں نے ”ماہنامہ روشنی“ میں ”طفقہ“ سے لکھنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ ”ماہنامہ البدھ“ اور ”ماہنامہ بھول“ میں اقوال زیریں اور پوچھنا شروع ہو چکی ہیں۔ پھول میں لیزر کے علاوہ کچھ شائع نہ ہوا۔ بہت کوشش کے باوجود آج ”اردو ڈائجسٹ“ میں ایک مختصری تحریر بھیجی ہے۔ امید ہے ضرور شائع کریں گے۔ اگر آپ کو پتا چل جائے کہ میں کتنی سر دی میں آپ کے ڈائجسٹ کے لیے تحریر اور لیکچر لکھ رہی ہوں اور اتنی محنت کر رہی ہوں تو شاید آپ بھی میری تحریر ردی کی نوکری کے پیٹ میں نہ ڈالیں۔ پلیز ضرور جگہ دیجیے گا۔ (کبری شاہین۔ دھیر کوٹ آزاد شہر)

خاص چیزیں

اردو ڈائجسٹ اس لحاظ سے زبردست ڈائجسٹ ہے کہ انفارمیشن اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ایسی چیزیں جن پر دوسرا توجہ نہیں دیتا وہ ایک ہی رسالے میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ثقافت، سیاست، مذہب، ایڈز، معلومات اور سائنس۔

میری میر پور خاص سندھ میں کتابوں کی دکان ہے۔ میں ڈائجسٹ خرید کر نہیں پڑھتا ہوں۔ اردو ڈائجسٹ ریک میں لگا ہوتا ہے تو اس کو نکال کر پڑھنے، دیکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ بہت زبردست رسالہ ہے۔ اخبار جہاں کو مکمل دیکھنے میں جتنا نام لگتا

ہے اس سے زیادہ نام اس رسالے کو دیکھنے میں لگ جاتا ہے۔ مکمل اس کو نہیں پڑھتا مگر جو چیزیں اپنے مطلب کی ہوتی ہیں ضرور پڑھتا ہوں۔ (ظفر اقبال۔ میر پور خاص)

۳۳ ماہ گزرنے کے بعد

بغیر کسی تھمید کے اصل بات کی طرف آتا ہوں کہ بندہ آپ اور اردو ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کو سرخ سلام پیش کرتا ہے وہ اس لیے کہ بندہ نے اپنے مدرسے کے سالانہ امتحان سے پہلے جون کے شمارے قصبہ کوٹڑ اور اسلام کوٹڑ کے صحیح جوابات بھیجے اور پھر اسے بھول کر مدرسے کی تعطیلات میں اپنے شہر کو نہ آ گیا۔ میرا یقین تھا کہ یہ انعامی سکیم صرف ایک دھوکا ہے انعام تو صرف ڈائجسٹ والے اپنے رشتے داروں کو ہی دیتے ہیں۔ کون چپک کرتا ہوگا۔

تعطیلات گزرا کر واپس کراچی آیا اور اپنی پڑھائی میں مشغول ہو گیا اتنے میں جولائی، اگست، ستمبر، ۳۳ ماہ گزر گئے۔ اکتوبر میں ایک دوست نے بتایا کہ آپ کو انعام میں کون سی کتابیں ملیں، میں نے پوچھا کیسا انعام؟ تب اس نے بتایا کہ بھائی! آپ کا نام قراء اندازی میں نکل آیا تھا۔ یہ سننا تھا مجھے انھوں ہوا کہ اسے یار! یہ کیا ہوا؟ خیر ڈرتے ڈرتے میں نے اردو ڈائجسٹ کا شیجر ایڈیٹر نازم منٹ احمد فیاض صاحب کا نمبر ملایا، ذہن میں یہ تصور تھا کہ وہاں سے ڈانٹ بڑے گی کہ جون کا انعام اکتوبر میں مانگ رہے ہوں لیکن معاملہ بالکل الٹ ہوا۔ انھوں نے بڑے پیار سے سمجھایا کہ اس نمبر پر رابطہ کرو، آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور یاد رہے میرے فون کرنے پر وہ صرف تھے بعد میں فون انھوں نے خود کر کے نمبر دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا میں پاکستان میں ہوں؟ جہاں دفنوں میں لوگ سیدھے منہ بات تک نہیں کرتے اور ان ملائے ہوئے نمبر پر جب میں نے رابطہ کیا تو وہاں مدیر صاحب کے اسٹنٹ غلام سجاد صاحب سے بات ہوئی۔ انھوں نے بھی بڑے اخلاق سے میری بات سننی پھر میرا نام، پتا وغیرہ نوٹ کر کے کہا کہ آپ کا انعام آپ کو مل جائے گا۔ کچھ دنوں بعد مجھے میرا انعام مل گیا، میں نے پھر ایڈیٹر صاحب سے رابطہ کیا تو اختر عباس صاحب نے بتایا: ”بھائی یہ انعام تو آپ کو مروتا، اخلاق اعزاز کی طور پر بھیجا گیا ہے ورنہ آپ کا انعام تو آپ کو ہم نے پہلے ہی بھیج دیا تھا۔ یہ سن کر دل باغ باغ ہو گیا۔ میرا خط لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ میں اردو ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کا شکر یہ ادا کروں اور دوسرے

لوگوں کو بھی ترغیب دوں کہ اخلاق معیار اور ہونا کسی قدر خوشی دیتا ہے۔ (محمد افضل کاسی۔ کوئٹہ)

بہمہ گیری

ایک چیز آپ کی خدمت میں کروں کہ رسالے کے اندر بہمہ گیری لانے کی کوشش کریں۔ سرائیکی، شکاریات اور تاریخی مضامین کو بالخصوص جگہ دیجیے گا نیز مختلف موضوعات پر خصوصی نمبرات بھی ضرور شائع کیجیے۔ (عبدالجیب خان۔ گلگت بلتستان)

سلسلہ وار کہانی ضرور دیں

آپ کسی مشہور رائٹر کا ناول لیں اس کو اردو میں لکھا کر اردو ڈائجسٹ میں سلسلے وار کہانی ضرور دیں۔ بے شک آپ اپنے قارئین سے رائے لے لیں، میں آپ کو دوبارہ خط نہیں لکھوں گا کیونکہ اتنا نام نہیں ہوتا۔ دسمبر میں شاید میں لاہور آؤں تو آپ کے دفتر آنے کی کوشش کروں گا۔ (محمد اشفاق۔ سرائے عالمگیر گجرات)

زنداد میں رسالہ حاصل کرنا آسان نہیں

اردو ڈائجسٹ سے میرا تعارف زنداد میں ہی ہوا۔ پھر تعلق اتنا مضبوط ہو گیا کہ ۳۳ سال سے کوئی شمارہ میں نہیں ہوا۔ زنداد میں اسے حاصل کرنا بھی آسان نہیں مگر درد دل یہ دستک سے اب تک کتنے ہی دلوں کے در کھلے ہوں گے۔ مینیج میں ایک دفعہ دستک ہوتی ہے اس لیے پہلے دستک پڑھتا ہوں۔ باقی مضامین اور کہانیوں کا غم بعد میں آتا ہے۔ گزشتہ چند ماہ سے شمارے میں جدت آگئی ہے۔ اگرچہ جب پر بوجھ بھی بڑھا ہے مگر اس قیمت میں بھی شمارہ سستا ہے۔ اکتوبر کے شمارے کا سرورق دیکھ کر ہی پیسے پورے ہو گئے تھے۔ باقی مطالعہ مفت میں رہا۔ نومبر کا شمارہ زیر مطالعہ ہے دستک سن کر مجھ کا غم تب کی اپائیں پڑھی تو دل آداس ہو گیا پھر نفاست کی واپسی نے مسکرائے پر مجبور کر دیا۔ باقی ابھی پڑھنا ہے عبدالمالک مجاہد کی آپ بیتی کا انتظار ہے۔

(محمد طاقت۔ ایس بی ایل اسٹریٹ نیل ڈیالہ راولپنڈی)

آپ جیسا صاحب ذوق اور شائستگی مزاج زنداد میں! مجھ میں نہیں آتا کبھی فلم اٹھانے عبرت انگیزی کے لیے ہی کسی۔ شاید اردو کا بھلا ہو جائے۔ حقائق اکثر فکشن سے زیادہ موثر ہوتے ہیں

یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد



یہی ہے قصہ کوئز

انچارج کوئز:
علامہ سجاد

درست جوابات پرائے نامات آپ کے منتظر ہیں

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اگسا تار اور زندگی کو با مقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کرگزرنے کا جذبہ اس کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو پورے غور پر نہیں اور ہر قسم کے آخر میں دیے گئے سوالوں سے اپنی ذہانت کو نہیں۔ درست جوابات نہیں بھگا دیتے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوتے تو قرعہ اندازی کی بجائے ان کو درود خوش نصیبوں کو "آزاد ڈائجسٹ" کے ۶ شماروں کی انعامی وادائی تریبل کے علاوہ وہی شاہ کی شامی کی ۲ خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجئے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہ نومبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔ (الف) یوحنا سینا (ب) الشفاء۔ القانون فی الطب قصہ کوئز ۲۔ (الف) نیل آرمسٹرانگ (ب) اپالو ۱۱
قصہ کوئز ۳۔ (الف) نیکسن منڈیا (ب) افریقین نیشنل کانگریس

درست جوابات دینے والوں کے نام

شعیب شاہ (لاہور)، حافظ احمد ہاشمی (لاہور)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ (لاہور)، پروفیسر خان محمد (پشاور)، جمینہ بی رحید اعوان (گوجرانوالہ)، سلطان محمود (کھاریاں)، بادشہ نور محمد (کراچی)، اقبال بانو (ڈیرہ اسماعیل خان)، بابو احمد (کوٹلی لوہاراں)، مظہر علی (کراچی)، عشرت جہاں (لاہور)، عبدالکرم (حیدرآباد)، محمد احمد (کراچی)، طلحہ حسین (حیدرآباد)، مرزا فرحان بیگ (حیدرآباد)، آصف کریم (حیدرآباد)، محمد یاسین راہمندی (حیدرآباد)، عقیل احمد خان (کراچی)، عبدالنشان شاہ (تلنگ)، حافظہ محمد عقیل ندیم (تلنگ)، مہلی مٹولی (کراچی)، محمد شعیب (حیدرآباد)، حبیب احمد صدیقی (بہاولپور)، منصور احمد علی (نواب شاہ)، وقاص احمد (لاہور)، فوزیہ فیاض (پنجاب)، محمد قلی چوہدری (دینہ)، ڈاکٹر حبیب انوار (لاہور)، سید محمد فضل (اسلام آباد)، محمد ذوالقرنین خان (کوئٹہ)، امین (لاہور)، محمد عمیر علی (لاہور)، عرفان طارق (جہانیاں)، شرف حسین شاہ (دہلی)، محمد (گولڑی یاسین)، آفت حسین (شیخوپورہ)، راشد علی (لاہور)، محمد حجاز علی شاہ (چترال)، محمد زید بدای (بکر)، محمد عیسیٰ حامد انصاری (لاہور)، اعجاز الحق پٹان (چترال)، گلزار عثمانی (لاہور)، غازی مشر (خٹوا والا)، محمد عرفان (لاہور)، عرفان رشید (پیر پور)، منصور سعید (سرگھ)، عبدالحمید (کراچی)، وقاص حمید (پنجاب)، عبدالاحد (کوئٹہ)، محمد عرفش (حیدرآباد)

قصہ کوئز ۱

وہ ایران کے بادشاہ نادر شاہ کی فوج میں افسر تھا۔ جب نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو وہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ جون ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کو کسی نے قتل کر دیا تو افغانی قبائل کی مجلس شوریٰ نے اسے تخت نشین کر دیا۔ فقیر درویش سید صابر شاہ نے اُسے "دُر درواں" کا خطاب دیا۔ اس نے ہندوستان پر کئی حملے کیے۔ ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ رگپلا کے عہد میں لاہور اور سرہند پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۵۶ء تک وہ دہلی کو تاخت و تاراج کر چکا تھا۔

۱۷۶۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دعوت پر آخری بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور سکھوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی مگر اس کی اپنی سلطنت میں ہونے والی سازشوں نے اسے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ جس کے بعد سے پنجاب پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۷۷۳ء میں دنیا سے کوچ کر گیا۔

(الف) کس شخص کا ذکر ہے اس واقعہ میں؟
(ب) اس نے ہندوستان پر کتنے حملے کیے؟

قصہ کوئز ۲

افریقہ، ایشیا اور یورپ کے اکثر علاقوں کی سیاحت کرنے والا عظیم مسلمان سیاح اور جغرافیہ دان مراکش کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا۔ ابھی ۲۲ سال کا تھا کہ جون ۱۳۲۵ء میں سفر حج پر روانہ ہوا۔

یہ قافلہ اسکندریہ اور قاہرہ سے ہوتا ہوا جدہ پہنچا۔ اسکندریہ میں اس کی ملاقات برہان الدین سے ہوئی جس نے اس کے دل میں چین اور ہندوستان کی سیاحت کا شوق پیدا کر دیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد وہ معلومہ دنیا کے اس عظیم سفر پر نکل کھڑا ہوا جس کی روداد آج بھی علمائے تاریخ و ادب کے لیے ماخذوں کے ایک سنگ میل کی

حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ستمبر ۱۳۳۳ء میں کوہ و ہندو کش کے راستے ہندوستان پہنچا۔ ۱۳۳۵ء میں وہ لنکا، بنگال، سلہٹ اور کمبوڈیا کے راستے بیکنگ اور کینٹین کی طرف بھی گیا۔ واپسی پر سائر، مالا بار، ظفار، عمان، جنوبی فارس اور بغداد سے ہوتا ہوا چوٹی بارج کے لیے مکہ پہنچا۔ اس نے مجموعی طور پر ۷۵ ہزار میل کا سفر طے کیا۔ مراکش کے حکمران ابو عنان کے کہنے پر اس نے اپنی آپ بیتی لکھی۔

(الف) اس سیاح کا نام بتائیں اور وہ کب ہندوستان پہنچا؟

(ب) اس کی لکھی ہوئی آپ بیتی کا نام اور سفر کا مجموعی فاصلہ بتائیں جو اس نے طے کیا؟

قصہ کوئز ۳

فاطمی دور کا سب سے بڑا مسلمان سائنسدان، ماہر فلکیات، ریاضی دان اور طبیب بصرہ میں پیدا ہوا اور علوم طب و فلسفہ و ریاضی میں کمال حاصل کیا۔ مصر کے فاطمی خلیفہ الحاکم نے اس کی شہرت سے متاثر ہو کر اسے مصر بلایا تاکہ اسواں کے قریب دریائے نیل پر بند بنانے کا منصوبہ تیار کرے لیکن وہ یہ کام کبھی وجہ سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ الحاکم کے انتقال کے بعد اس نے اپنی تصانیف کی طرف توجہ دی اور علم ہیئت اور علم نوری بنیادی سائنسی تحقیقات پیش کیں۔ اس کی تصانیف کی تعداد ۲۰ سو سے اوپر ہے۔ اس کی تحقیقات کے مطابق شیش کی ابتداء اور انتہا اس وقت ہوئی ہے جب سورج اقل سے ۱۹ درجے نیچے ہو۔ اس نے گرہن کی صحیح توجیہ کی اور عرصہ کی قوت پر تحقیقات کیں۔

(الف) اس شخص کا نام بتائیں اور اُس نے کل کتنی تصانیف لکھیں؟

(ب) اس نے روشنی کی کتنی اقسام بتائیں اُن کے نام بتائیں؟

جوابات بھیجئے والے قارئین اپنا رابطہ نمبر ضرور بھیجا کریں تاکہ انعام بھیجنے میں آسانی رہے

خوبصورت اور معیاری کتب

انعامات کے لیے تعاون

منشورات ہیڈ آفس: منصورہ، ملتان روڈ لاہور

آپ کو ۶ ماہ تک اردو ڈائجسٹ کے شمارے اور وہی شاہ کی کتب بطور تحفہ دیں گی

V.P.O سگوالہ تحصیل تلہ سنگ ضلع پکوال
محمد محمد نور شہرہ روڈ دہلی نمبر ۱ گوجرانوالہ

حافظ محمد فیصل ندیم
شمینہ بی رحید اعوان

قرعہ اندازی میں
جیتنے والوں کے نام

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھیج سکتے ہیں

میری جان...! آج پھر ۱۶ دسمبر ہے

میری جان آج پھر ۱۶ دسمبر ہے
بہت سے سرخ آنسو آج پھر آنکھوں میں اترے ہیں
ہوا پھر سے

بہت سے زرد پتے ساتھ لائی ہے
محبت کے نگر میں چروہی حسرت کے ڈیرے ہیں
تمہارے بعد آنگن میں بہت گہرے اندھیرے ہیں
وہ سورج نہیں اترتا

جو پہلے روز آتا تھا

امید کربوں میں بھر کے لاتا تھا

میرے آنگن میں گہری نیم کے سائے

وہ ہم سائے

سبھی تم کو بلاتے ہیں

مگر مندر پر بیٹھی ہوئی وحشت یہ کہتی ہے

ارے پاگل

جو جاتے ہیں کبھی واپس نہیں آتے

۴۰ سال گزر گئے، جانے والے واپس آئے نہ بھیجے

والوں نے واپسی کی

کوئی کوشش کی۔ ذہنی

فاصلے بے شک کم نہیں

ہو سکتے تھے مگر دلوں کو

پاٹنے، زخموں پہ پھاہا

رکھنے، اپنی غلطیوں کا

اعتراف کرنے،

در دل پہ
دستک
اختر عباس



ہوٹل میں ۱۹۹۶ء کی ایک شام اس عہد کے یکتا دانشور
اشفاق احمد نے ”پھول زاویہ“ میں کہا ”میں اپنے بنگالی
بھائیوں پر ہونے والی ہرزائی اور ظلم پر پوری قوم کی طرف
سے معافی مانگتا ہوں۔ معافی مانگنا ایک بڑا وصف ہے اور
ہم اسی سے بے بہرہ ہیں۔“ معافی مانگ لیتے تو دلوں کو
جوڑنے کے کئی راستے نکل آتے۔ لوگ دشمنوں کو اپنا رہے
ہیں وہ تو پھر ہمارے اپنے تھے۔ اس ملک کی بنیاد رکھنے
والے، اس کا خواب دیکھنے والے۔ بڑے قابل اور تیز،
بے چین روجوں کو محبت سے منایا جاتا ہے۔ غصے اور گولیوں
سے کون مانتا ہے۔ ہم ۴۰ سال بعد بھی یہ نہیں جان پائے
اور وہی کلیہ پھر آڑے نہ لگے ہوئے ہیں۔

خدا جانے یہ قومی بے نیازی کی صفت ہے یا بے حسی
کی، ہم اس سے بری طرح متصف ہیں۔ ہر سال ۱۶ دسمبر
نہ آئے تو ہمیں کوئی یاد بھی نہ دلائے کہ کبھی ستار بنگلہ مشرقی
پاکستان ہمارے دل کا حصہ تھا اور ہمارے ساتھ دھڑکتا تھا۔
آج وہ ۱۶ کروڑ سے کہیں زیادہ ہیں۔ مطمئن، آسودہ، تعلیم

اور ترقی دونوں میں ان
کی رفتار ہم سے زیادہ
ہے۔ ہاں بے چینی میں
بھی کمی نہیں۔ جس جس
نے ان کی توقعات کا
خون کیا، اسے اختیار و
اقتدار پر رہنا نصیب نہیں

ہوا چاہے وہ ان کا بنگلہ بدھوش مجیب الرحمن ہی کیوں نہ ہو۔
۱۶ دسمبر کا زخم اس وقت پھر سے ہرا ہو گیا جب
انٹرنیٹ پر سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے تصاویر اور مضامین
کی ایک نہ ختم ہونے والی سیریز سے واسطہ پڑا۔ کہیں

پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالتے ہوئے مسکراتے چہرے
والے افسر تھے، کہیں روتے ہوئے فوجی جوان، کہیں ملکی
بانتی کے رہنما اور کارکن تھے اپنے ہی ان بنگالی اور غیر بنگالی
دوستوں کے گلے کاٹنے کی تصویریں جو آخری سانس تک
پاکستان سے محبت کا دم بھرتے رہے۔ ملکی بانتی کے کارکنان
بھارت کے ”مجیب نگر“ سے آتے اور مشرقی پاکستان کے
بنگالیوں کو آزادی کے خواب دکھاتے اور دیکھنے پر آمادہ نہ
ہونے والوں کو موت کی وادی میں پہنچاتے۔ اس ویب
سائٹ پر ان کے ٹریڈنگ کمپ اور تربیت کی تصاویر بھی
تھیں، جس طرح بھارت آج بلوچوں کو تربیت دیتا ہے۔
الہدر کے رضا کاروں پر ظلم و زیادتی کے مناظر بھی تھے اور
بے گوروفن پڑی محبت وطن پاکستانیوں کی لاشیں بھی جس کا
اب ذکر بھی ”آؤٹ آف فیشن“ ہے۔

میں انھیں دیکھتا..... اور سوچتا ہر بار کہ تو میں بنانے اور
برباد کرنے والوں میں کس قدر فرق ہوتا ہے اور بنیادی
فرق لوگوں کے جذبے، شکلوں، تعداد کا نہیں، مقصد زندگی
کے فہم اور حصول کے جنون کا ہوتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ
اتنے برسوں میں جغرافیہ اور تاریخ تو بگڑی ہی بگڑی تھی، اپنی
سوچ اور مستقبل تک بگاڑ لیا۔

چلیں آج لمحہ بھر کو اندرا گاندھی، مجیب، بھٹو اور یچکی کو
برا بھلا نہیں کہتے اور صرف یہ سوچتے ہیں کہ کیا کوئی اکیلا
آدمی اتنی بڑی شکست کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے، کیا اس
کے ساتھی، وزیر، فوجی افسر، صلاح کار، شریک، اقتدار کی
کشتی کے سیاسی معصومیّت کے کسی دودھ سے دھلے
ہونے کے دعوے دار ہو سکتے ہیں کہ ان معصوموں کے نام
ہی نہ لیے جائیں، جنھوں نے ہماری زندگیاں دکھ اور کرب
سے بھر دیں۔ میں چار دہائیوں کے بعد بھی اس لمحے کی
اُذیت نہیں بھول پاتا۔

انور بھڑا نے اپنی بھاری اور گھمبیر آواز میں ریڈیو
پاکستان لاہور سے ۱۶ دسمبر کی سہ پہر ۴ بجے کی خبریں
پڑھنا شروع کیں تو وہ صدر پاکستان جنرل یحییٰ خاں کے
”جنگلوں میں پہاڑوں میں، میدانوں میں دشمن سے جنگ

جاری رکھنے والے خطاب اور مشرقی محاذ پر پاک فوج کی
کامیابیوں اور بھارتی فوج کی جگہ جگہ نامیوں سے عبارت
تھیں۔ سکول سے چھٹی تھی اور ہم گھر پر تھے، خبریں ختم
ہونے والی تھیں جب آخری ۳۰ سیکنڈ میں انور بھڑا کی
آواز بھرا گئی اور بظاہر ایک عجیب بے معنی سی خبر انھوں نے
پڑھ ڈالی ”مقامی مکائدروں نے باہمی معاہدے کے تحت
فائر بندی کر لی ہے اور ایک فوجی معاہدے کے تحت بھارتی
فوجیں آج ڈھاکہ میں داخل ہو گئیں۔“

ہمارا گھر پشپتا میں ”قمر کے کارخانے“ اور کماروں
کی آویں کے درمیان ایک کھلی سی سڑک پر واقع تھا۔ گھر
کے بالکل قریب ایک دوسرے کارخانے سے جڑی ایک
آوی سے دھواں نکل رہا تھا اور گھر کے اندر بے چینی کا
دھواں بھرا تھا، ابوجان اس خبر کی تصدیق اور تردید کے لیے
بی بی سی سننے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ یونی بی بی
سی نے بے دردی سے بتایا کہ آج پاکستانی افواج نے
ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیے تو مجھے یاد ہے ہم کبھی یوں
روئے تھے جسے جسم کا کوئی ٹکڑا الگ ہو گیا ہو۔ آنے والے
دنوں میں نہ تو ”ہتھیار بربزمن شو“ کی تفصیل سن سکے اور نہ
جنرل نیازی کے بے شرعی سے اپنا پستول جنرل اروڑہ کے
حوالے کرنے کی شرمناک تفصیل جان سکے۔ تب بھی اپنے
جسم کٹنے کی خبر غیروں نے دی تھی۔ ہمارا اپنا ریڈیو تو ہتھیار
ڈالنے کا ذریعہ گول کر گیا تھا۔ کیا یوں خبریں چھپانے سے
تاریخی حقائق چھپ جاتے ہیں۔ آج میٹ پر جب بنگلہ دیش
کے اسکولوں میں بچے جنرل نیازی اور جنرل اروڑہ بن کر
سٹیج ڈرامے میں وہ مناظر دہراتے ہیں تو پوری تکلیف وہ
روایت ان کے ہاں پھر سے زندہ ہو جاتی ہے یہی تو ابھی
انھوں نے پھر پاکستانی وزیر خارجہ خٹا رہا بنی کھر سے ملکی سطح
پر معافی مانگنے کا مطالبہ کیا ہے۔ خدا کرے یہ پچھڑنے والوں کا
آخری مطالبہ ہوکل کسی اور سے ایسا مطالبہ نہ سننا پڑے۔

دل میں ایک سوال بار بار سر اٹھاتا ہے۔
”ہمارے ہاں ہر بڑے حادثے اور سانحے کی بنیاد
فوج کے ہاتھوں کیوں رکھی اور رکھوائی جاتی ہے؟“.....؟

سادہ سا سوال بظاہر تنکھا اور شدید ہے مگر ایک جواب ۲۰۰۷ء کے چوتھے مہینے کے روزنامہ ”ڈان“ میں دوکالی خبر میں تھا۔ فوجی حکمران کے نقطہ نظر سے وفاقی حکمہ تعلیم کے افسران نے خوشی خوشی بتایا تھا کہ حکومتی ہدایات پر آنے والے برسوں میں پہلی سے چارم تک کے سلیبس سے اسلامیات اور مطالعہ پاکستان نکالنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور صوبوں کو الگ سے ہدایات دی جا رہی ہیں، تاکہ عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے اور کمال مہارت اور عمدگی سے یہ کام کر دیا گیا۔

چچی بات یہ ہے کہ خبر پڑھ کر مجھے وہاں ایک ریگڈیئر دوست کی شدید کمی محسوس ہوئی تھی۔ ان کا خیال تھا، ہے اور رہے گا کہ فوج کے پاس ایسے ایسے ماہرین ہیں کہ ان کے بعد کسی ماہر کی ضرورت نہیں رہتی۔ ابھی چند روز قبل ہی وہ سقوط ڈھاکہ کے واقعات اور اسباب بیان کر رہے تھے تو بار بار ان کی تان اسی بات پر ٹوٹی تھی کہ میرا عمر بھر کا تجربہ اور تجزیہ بتاتا ہے کہ قومیں، تعلیم سے زیادہ اس نصاب کی پشت پر کار فرما مقاصد سے بنتی اور بگڑتی ہیں جو حکمرانوں کے پیش نظر ہوتا ہے۔

وہ کس قدر یقین سے بتا رہے تھے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش ہندوستان نے نہیں، ہندوستان ہندو اور ان کے منتخب کردہ سلیبس نے بنانے کی ابتدا کی۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ یونیورسٹیوں کے کتنے ہی واقعات ان کو یاد تھے کہ لڑکے لڑکیاں اسلام کو جانتے تھے نہ پاکستان کو۔ انھیں نہ کسی نے بتایا تھا نہ کسی نے پڑھایا تھا۔ پڑھانے والوں نے اس قدر روشن خیال سلیبس بنایا تھا کہ وہ پورے ہوتے ہوئے بھی احوال سے ہٹ گئے تھے۔ پاکستان میں رہتے، پاکستانی اداروں میں پڑھتے مگر نہیں جانتے تھے کہ پاکستان ان کا ملک ہے اور محبت کے لائق ہے۔ پھر وہ خود ہی بولے تھے کہ محبت اور تعلق مذہب سے بنتا اور بڑھتا ہے۔ اسلام ان کی کتابوں سے نکال کر یوں پھینک دیا گیا تھا جیسے پرانی چیز ہو۔ کسی دشمن کی ملکیت ہو۔ اسلام کو کلاس روم میں آنے کی اجازت ہی نہیں تھی تو دل میں کیسے اترتا۔ جب یہی لڑکے

اور لڑکیاں بنگلہ دیش بنانے نکلے تو ہراس مرد اور عورت کو بے دردی سے مار دیتے تھے جو اسلام اور پاکستان کا حوالہ یا واسطہ دیتا تھا۔ ان کی پہچان، شناخت صرف بنگلہ زبان، بنگال اور بنگالی تھے جو آزادی کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے۔ اسی حوالے نے انھیں جوڑ رکھا تھا۔ یہی ان کو بتایا اور پڑھایا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کو مرحوم ہونے والے ۳۱ سال ہونے کو آئے ہیں مگر ہمیں نہ ڈھاکہ بھولا نہ ڈھاکہ والے۔ جدائی کا دکھ بھولا نہ دکھ دینے والے۔ سارے کردار اپنے انجام کو پہنچے مگر سارے سوال تو آج بھی زندہ ہیں۔

جنرل یحییٰ سے لے کر بھٹو، مجیب اور جنرل نیازی تک، جس جس نے پاکستان اور اس کے رہنے والوں کو اس شرمناک دن تک پہنچایا، کبھی ان سے پوچھا نہ جاسکا۔ جنرل ایوب کے مارشل لاء اور مشرقی پاکستان کی محرومیوں کی ابتدا کرنے والے کسی کردار سے سوال نہ کیا جاسکا۔ بنگلہ بھائیوں کے لیڈروں کو بے عزت کرنے، ان کے رنگ اور قد کا مذاق اڑانے اور ثقافت کو کمتر جاننے والے ہیرو وکریٹ نے، اپنے ہی بنگلہ فوجیوں کو مارنے اور اپنے لوگوں پر چڑھ دوڑنے والے جرنیلوں سے ملک توڑنے میں حصہ ڈالا۔ الطاف گوہر کی گواہی ہو یا قدرت اللہ شہاب کی، ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ دوسروں کو کمتر جاننے اور خود کو برتر ماننے والے ان حکمرانوں نے ہمیشہ ایک سا سوچا اور ایک سے نتائج پیدا کیے۔ جب ملک کی بنیادوں کو برباد کرنے والی پالیسیاں بنائی جاتی ہیں تو بنانے والے ہاتھ اور ذہن بے شک سول بیورو کریسی کے اور چہرے سرکاری دہاری اہل کاروں کے ہوتے ہیں جو حکمرانوں کے اشاروں پر جڑیں کاٹنے والے ہر کام کو خدمت سمجھ کر مٹنے مسکراتے کرتے اور بتاتے ہیں اور پھر برسوں بعد دوسروں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ان کی ڈکشنری میں وقانام کے لفظ کچھ اور ہی مفہوم و معانی کے ساتھ لکھے ہوتے ہیں۔

میرا بہت دل چاہتا ہے کہ اتنے سال گزرنے کے بعد ہی سہی، مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور ہسپانیہ سے مسلمانوں کے زوال اور شکست کے اسباب اور اسباق ہمارے فوجی

سلیبس میں ضرور رکھوائے جائیں۔ اندرا گاندھی نے تو اپنے ایک دانشور اور محقق ڈی پی دھر کو وہاں بھجوا کر یہ تحقیق کرائی تھی کہ مسلمانوں کو ۸۰۰ سال کی حکمرانی کے بعد عیسائیوں نے کس طرح مارا اور کس طرح وہاں سے ان کے وجود، نسل اور عقیدے کو ہی ختم کر ڈالا پھر اسی رپورٹ کی روشنی میں اپنے ذہن کو اسی کے گھر میں، اسی کے لوگوں کے ہاتھوں بہتر حکمت عملی کے ساتھ دولت کرا دیا۔

ہمارے سلیبس میں ۱۹۷۱ء کی شکست، اس کے اسباب ہی نہیں، ہسپانیہ کے آخری مسلمان حکمران کے وہ آنسو اور اس کی ماں کے وہ الفاظ تو درج ہونے چاہیں جو اس نے غرناطہ سے شکست کھا کر نکلتے ہوئے کہے تھے۔ جبل الطارق پر کھڑے ہو کر ہسپانیہ کے آخری مسلمان حکمران عبداللہ کوروتے دیکھ کر اس کی ماں نے اس سے صرف اتنا کہا تھا ”جس ملک کی تم مردوں کی طرح حفاظت نہ کر سکے اب عورتوں کی طرح اس کے کوچوانے پر آنسو کیوں بہاتے ہو؟“ انسانی تاریخ میں گروہوں، قوموں اور ملکوں کو بار کا کبھی نہ کبھی سامنا کرنا پڑ جاتا ہے، مگر اکثر یہی واقعہ ان کی زندگی اور عروج کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتا ہے، سوئی ہوئی صلاحیتوں اور خوبیوں کو بیدار کرتا ہے، کمیوں، کوتاہیوں کا ادراک کراتا ہے۔ نئی ہمت دلاتا ہے، زخموں پر مرہم لگاتا ہے، نئے اور مضبوط فیصلے کراتا ہے اور پھر ایک دن آتا ہے، تاریخ ہی نہیں بدلتی، جغرافیہ بھی بدل جاتا ہے۔

ہم پر ہر سال ۱۶ دسمبر آتا اور ایک نئی شرمساری دے جاتا ہے..... ہم نے اس سے بچنے کا کیا راستہ ڈھونڈا کہ تذکرہ کرنا ہی چھوڑ دیا، حوالہ دینا ہی بند کر دیا، باری ہوئی جنگ کے ۲۴ بہادروں کو نشان حیدر تو دے دیے، مگر ہروانے والے جرنیلوں، واقعات اور اسباب کا تذکرہ ممنوع قرار دے دیا، بہت ہوا تو کبھی امریکا کے بحری بیڑے کو الزام دے دیا، کبھی بھارتی حکمرانوں کو، پھر بھی دل نہ بھرا تو بنگالی رہنماؤں کو برا بھلا کہہ لیا۔ برسوں پر پھیلے شکست کے کرداروں اور چہروں کو جانتے ہوئے بھی انھیں چھپایا۔ تجربے سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ کیا صرف یحییٰ اور نیازی

ہی اس بد قسمتی کے ذمے دار تھے؟ وہ سارے لوگ جو اسلام آباد میں اس وقت اختیار و اقتدار کے مزے لے رہے تھے اور جو فوراً بعد بھٹو صاحب سے بیعت ہو گئے تھے، یہی لوگ تھے جو آنے والے ہر عہد اور حکمران کے ساتھ چلتے اور بدلتے رہے اور انہی کی باقیات جنرل شرف کے ہمراہ اور ہم رکاب رہیں اور پھر ہمیں بلوچستان اور وزیرستان میں ایک طویل بے فیض جنگ میں دھکیل کر چلتے بنے۔

ہم اس بات کا کب ادراک کر پائیں گے کہ جب جب فوجی حکمرانی ہوتی ہے، فوجی جبریں کیا کچھ نہیں ہار جاتے ہیں؟ ہر فوجی حکمران کو ہار بننے کواری مل جاتے ہیں جو سننے نئے ناموں سے پرانی پالیسیوں کو دہراتے رہتے ہیں۔

اگر فوجی دانشوروں اور تعلیم کے ماہرین کا یہ تجزیہ مان لیا جائے کہ سیاسی نا انصافیوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی سلیبس کی خرابی بنگال کی دوری اور آزادی کا باعث بنی اور ہمیں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صورت میں اس کی قیمت چکانا پڑی تو یہ کہتے ہوئے دل لرزتا اور پوچھتے ہوئے قلم ڈرتا ہے کہ اب سلیبس کی تبدیلی کسی سننے سانحہ کا باعث تو نہیں بنے گی؟

افسوس اب کے ہندو استاد ممیٰ اور کلکتہ سے نہیں آئے، یہیں کہیں سے ایسے روشن خیال دانشور مل گئے ہیں، جنھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پہلے ہی جلتے میں انٹرمیڈیٹ اور گریجویٹیشن کے کورسز سے اسلام اور پاکستان کو دلس نکالا دے ڈالا ہے اور پھر دوسرے مرحلے میں پہلی سے چوتھی جماعت کے بچوں کو اس تعلیم، روایت اور تعلق سے محروم کرنے کے فیصلے پر عمل کر ڈالا جو اصل بنیاد ہے ہمارے دین اور وطن کی اب کے جو روشن خیال نسل تیار ہو رہی ہے، اس کا حوالہ اور تعارف کیا ہوگا۔ وہ کب اور کیسے کس کے خلاف ہتھیار اٹھائے گی؟ اسے تو ہتھیار ڈالنے کو بھی کسی مضبوط اور بیرونی دشمن کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیا کروں جیسے جیسے سوچتا ہوں دکھ سے بھرتا جاتا ہوں۔

میری جان.....! آج پھر ۱۶ دسمبر ہے بہت سے سرخ آنسو آج پھر آنکھوں میں اترے ہیں

۲۰۰۰
روپے کی کتب
کے انعامات

بوجھیں تو جانیں

مرتب: لیفٹیننٹ کرنل (ر) مبشر احمد (دوالیال، پکوال)

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر ۱۸ سے ۲۸ سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ نومبر میں چھپنے والے اسلامی کونز کے درست جوابات

کونز نمبر (الف) مدائن صالح (ب) ناقۃ اللہ، سورۃ الشمس کونز نمبر ۲ (الف) مسجد ضرار (ب) سورۃ التوبہ

درست جوابات دینے والوں کے نام

اسامہ بن رمضان (چشمہ کنڈیاں)، حافظ عبداللہ مسعود (بہاولپور)، پاپوس احمد (کوٹلی لوہاراں)
احمد بلال (صوابی)، توصیف احمد (حیدرآباد)، ایاز خلیل (حیدرآباد)، طلحہ یمن (حیدرآباد)، محمد احمد (کراچی)، احسان اللہ (فورت منرو)
سمیع نوید (راولپنڈی)، مدرہ خلیل (دینہ)، ارشد فاروق (ڈھکی)، محمد بلال (لاہور)، وصیف الرحمن (ہری پور)، ہدیہ صابر (ہری پور)
حافظ محمد فیصل ندیم (اسلام آباد)، محمد شعیب (حیدرآباد)، محمد فاروق عثمان خان (بھکر)، محمد خان (بھکر)، وقاص احمد (لاہور)
سدرہ شکور (جہلم)، کنول سعید (سکرند)، سمیع صابر (ہری پور)، ڈاکٹر عطیہ سلمان (کراچی)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

۱۔ مدرہ خلیل بنت محمد خلیل (دینہ) ۲۔ حافظ محمد فیصل ندیم (اسلام آباد) ۳۔ احسان اللہ بلوچ (ڈیرہ غازی خان) ۴۔ حافظ عبداللہ مسعود (بہاولپور)

اسلامی کونز ۱

حضرت امام حسینؑ کے فرزند ارجمند سانچہ کر بلا کے وقت تخت تیار ہونے کے باعث کر بلا میں ہوتے ہوئے شریک جہاد نہ ہو سکے۔ باقی تمام عمر مدینہ منورہ میں گزارا۔ بیشتر وقت عبادت میں گزارا۔ بیشتر وقت عبادت میں گزارتے چنانچہ دو القاب سے نوازاے گئے۔

سوال ۱۔ اس شخصیت کا کیا نام تھا؟
سوال ۲۔ کون سے دو القاب سے یاد کیا جاتا ہے؟

اسلامی کونز ۲

قریش کا نامور سردار احد اور خندق کے غزوات میں قریش کا قائد، فتح مکہ (۱۵/رمضان ۸ ہجری) کے دن مسلمان ہوا۔ رسول کریمؐ نے اس کی اور اس کے خاندان کی بڑی عزت اور دل جوئی فرمائی۔ انھوں نے ایک بادشاہ کے دربار میں اسلام کی گواہی دی جو تاریخی دستاویز بن گئی۔

سوال ۱۔ اس ہستی کا کیا نام تھا؟
سوال ۲۔ کون سے بادشاہ کے دربار میں پیش ہوئے؟

(اشارہ: ان کے فرزند ثانی نے اموی حکومت کی بنیاد رکھی)

انعامات کے لیے تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

۴۔ کورٹ سٹریٹ، کورٹ مال لاہور

ہیڈ آفس: پیر وں منصورہ ملتان روڈ لاہور

آپ کے جوابات ہمیں ۱۵ اتر تک مل جانے چاہئیں

مدیر اردو ڈائجسٹ

325۔ جی ۱۱۱، جوہر ٹاؤن لاہور